نوٹ: Mobile اور iPad وغیرہ میں بہتر طور پر دیکھنے کے لیے
Adobe Acrobat کو PDF Reader کے طور پر استعمال کریں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

’’آپ کے مسائل اوران کا حل‘‘

مقبول عام اور گراں قدر تصنیف

ہمارے دادا جان شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نور اللہ مرقدہ کو اللہ رب العزت نے اپنے فضل واحسان سے خوب نوازا تھا، آپ نے اپنے اکابرین کے مسلک ومشرب پر سختی سے کاربند رہتے ہوئے دین متین کی اشاعت وترویج، درس و تدریس، تصنیف وتالیف، تقاریر وتحریر، فقہی واصلاحی خدمات، سلوک واحسان، ردِفرق باطلہ، قادیانیت کا تعاقب، مدارس دینیہ کی سرپرستی، اندرون و بیرون ملک ختم نبوت کانفرنسوں میں شرکت، اصلاح معاشرہ ایسے میدانوں میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔

آپؒ کی شہرۂ آفاق کتاب ’’آپ کے مسائل اوران کا حل‘‘ بلاشبہ اردوادب کا شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ علمی وصحافتی دنیا میں آپ کی تبحرِ علمی، قلم کی روانی وسلاست، تبلیغی واصلاحی اندازتحریر جیسی خداداد صلاحیتوں اور محاسن وکمالات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حضرت شہیدِ اسلام نور اللہ مرقدہ روزنامہ جنگ کراچی کے اسلامی صفحہ اقرأ میں ۲۲ سال تک دینی وفقہی مسائل پر مشتمل کالم ’’آپ کے مسائل اوران کا حل‘‘ کے ذریعہ مسلمانوں کی رہنمائی فرماتے رہے۔ یہ سلسلہ آپؒ کی شہادت تک چلتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اخلاص وللّٰہیت کی برکت سے عوام الناس میں اس کالم کو بڑی مقبولیت عطافرمائی۔ بلامبالغہ لاکھوں مسلمان اس چشمہ فیض سے مستفید ہوئے۔ دس ہزار سے زائد سوالات وجوابات کو فقہی ترتیب کے مطابق چار ہزار صفحات پر مشتمل دس جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

عرصہ دراز سے ہمارے دوست واحباب، معزز قارئین اور ہمارے بعض کرم فرماؤں کا شدت سے تقاضا تھا کہ حضرت شہیدِ اسلامؒ کی تصانیف آن لائن پڑھنے

بقیہ صفحہ نمبر ۳۲۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔۔۔

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی!

مرشد العلماء حکیم العصر شیخِ کامل مرشدی ومولائی مخدومی نائب امیرِ مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختمِ نبوّت حضرتِ اقدس مولانا محمد یوسف لدھیانوی زادہ اللہ شرفاً نے ''اقرأ'' اسلامی صفحے میں ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' کے نام سے جو فقہی مسائل کا سلسلہ شروع فرمایا تھا، آج دُنیا بھر کے مسلمان حضرتِ اقدس دامت برکاتہم کے اس رُوحانی سلسلے سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔

الحمدللہ! اس سلسلے کی نویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے، جس میں:

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اور اسلام، سائنس دانوں کے اِلحاد کے اسباب، مذہب اور سائنس میں فرق، خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت، ائمۂ اربعہؒ کے حق پر ہونے کا مطلب، اکابرِ دیوبند کا مسلک، مسئلہ حاضر و ناظر، اعضاء کی پیوند کاری، مسئلہ تقدیر کی وضاحت، رافضی پروپیگنڈا، خودکشی سے بچانے کے لئے تین طلاق کا حکم، تجارتی کمپنیوں میں پھنسی ہوئی رقوم پر زکوٰۃ کا حکم، پرائز بونڈ کی پرچیوں کا حکم، پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت، کنٹیکٹ لینز کی صورت میں وضو کا حکم، القرآن ریسرچ سینٹر کا شرعی حکم، غیبت اور حقیقتِ واقعہ، ٹی وی ایک اصلاحی ذریعہ، اسلامی شعائر کی توہین، خیالاتِ فاسدہ اور نظرِ بد کا علاج، حقوقِ والدین یا اطاعتِ امیر، جیسے اہم موضوعات شامل ہیں۔

اس کتاب کی تدوین وترتیب کے سلسلے میں حضرتِ اقدس کے معاون ورفیق مولانا سعید احمد جلال پوری صاحب، مولانا محمد نعیم امجد، برادرم عبداللطیف طاہر، برادرم

مولانا محمد طیب لدھیانوی، برادرم عتیق الرحمٰن لدھیانوی نے جو محنت و کاوشیں کیں، اللہ تعالیٰ ان کا بیش بہا بدلہ عطا فرمائے۔

رَبّ العزّت سے اُمیدِ واثق ہے کہ یہ کتاب اِن شاء اللہ حضرتِ اقدس دامت برکاتہم کے ساتھ مندرجہ بالا احباب اور جناب میر خلیل الرحمٰن مرحوم، میر جاوید الرحمٰن، میر شکیل الرحمٰن اوران کی والدہ محترمہ کے علاوہ ان تمام حضرات کے لئے صدقۂ جاریہ ہوگی جو اس میں کسی بھی حد تک شریکِ سفر رہے اور تمام قارئین کے لئے علمی ذخیرہ ہوگی۔

وصلی اللہ علٰی خیر خلقه محمد واٰله وصحبه أجمعین

خاکپائے حضرتِ اقدس
محمد جمیل خان
نائب مدیر ”اقرأ روضۃ الاطفال“

فہرست

نوٹ: کسی بھی موضوع تک رسائی کے لیے اس پر کلک کریں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ رَدِّ شمس

س…… گزشتہ دنوں ایک مولانا صاحب نے مقامی مسجد میں اتباعِ رسول کے موضوع پر وعظ کرتے ہوئے فرمایا کہ: ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زانو پر سر رکھ کر لیٹے کہ اتنے میں انہیں نیند آگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے، اِدھر عصر کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا، انہوں نے سوچا کہ نماز تو پھر مل جائے گی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح کی قربت نہ جانے پھر نصیب ہوگی یا نہیں؟ اتنے میں سورج غروب ہوگیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو چکا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جاگ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: نماز پڑھنا چاہتے ہو یا قضا پڑھو گے؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ: قضا نہیں پڑھنا چاہتا! تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کو حکم دیا، سورج دوبارہ نکل آیا اور حضرت علیؓ نے نماز پڑھی۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی نماز تو قضا کرلی مگر زانو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ جگایا۔

اس میں تفصیل طلب بات یہ ہے کہ آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نماز پڑھ لی یا نماز پڑھنے سے پہلے سو گئے یا دونوں نے نماز نہیں پڑھی؟ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں بیٹھے رہے اور انہوں نے نماز نہیں پڑھی؟ اور پھر نبی جب سوتا ہے تو غافل نہیں ہوتا، نبی کا دل جاگ رہا ہوتا ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی سو جائے، اس کی اپنی نماز قضا ہو جائے یا اس کے رفیق کی؟

مولانا کی گفتگو سے مندرجہ بالا اشکالات میرے ذہن میں آئے، امید ہے کہ ان

کا جواب دے کر ممنون فرمائیں گے اور بتلائیں گے کہ آیا یہ واقعہ صحیح احادیث سے ثابت ہے یا واقعہ کی حد تک ہے؟

ج...... حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے ردِّ شمس کی حدیث امام طحاوی رحمہ اللہ نے مشکل الآثار (ج:۲ ص:۹) میں حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے، بہت سے حفاظِ حدیث نے اس کی تصحیح فرمائی ہے، امام طحاویؒ نے اس کے رجال کی توثیق کرنے کے بعد حافظ احمد بن صالح مصریؒ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"لا ینبغی لمن کان سبیله العلم التخلف عن حفظ حدیث اسماء الذی روی لنا عنه، لانه من اجل علامات النبوة." (مشکل الآثار ج:۲ ص:۱۱)

ترجمہ:...... "جو شخص علمِ حدیث کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہو اسے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی حدیث کے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، یاد کرنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ یہ جلیل القدر معجزاتِ نبوت میں سے ہے۔"

حافظ سیوطی رحمہ اللہ "اللآلی المصنوعه" میں لکھتے ہیں:

"ومما یشهد بصحة ذالک قول الامام الشافعی وغیره ما اوتی نبی معجزة الا اوتی نبینا صلی الله علیه وسلم نظیرها، او ابلغ منها، وقد صح ان الشمس حبست علیٰ یوشع (علیه السلام) لیالی قاتل الجبارین، فلا بد ان یکون لنبینا صلی الله علیه وسلم نظیر ذالک فکانت هذه القصة نظیر تلک."

(مشکل الآثار ج:۱ ص:۳۴۱)

ترجمہ:...... "اور من جملہ ان اُمور کے جو اس واقعہ کے صحیح ہونے کی شہادت دیتے ہیں، حضرت امام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر

حضرات کا یہ ارشاد ہے کہ کسی نبی کو جو معجزہ بھی دیا گیا ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی نظیر عطا کی گئی، یا اس سے بھی بڑھ کر، اور صحیح احادیث میں آچکا ہے کہ سورج، حضرت یوشع علیہ السلام کے لئے روکا گیا تھا، جبکہ انہوں نے جبارین سے جہاد کیا، پس ضروری تھا کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی اس کی نظیر واقع ہوتی، چنانچہ یہ واقعہ حضرت یوشع علیہ السلام کے واقعہ کی نظیر ہے۔“

امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے اس قصہ کو موضوعات میں شمار کیا ہے، اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی ”منہاج السنۃ“ میں بڑی شد و مد سے اس کا انکار کیا ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ”فتح الباری“ میں لکھتے ہیں:

”وهذا ابلغ المعجزات، وقد اخطأ ابن الجوزی فی ایراده فی الموضوعات، وكذا ابن تيمية فی كتاب الرد علی الروافض فی زعم وضعه، والله اعلم!“ (ج:٦ ص:٢٢٢)

ترجمہ:...... ”ردّ شمس کا یہ واقعہ حضرت یوشع علیہ السلام کے واقعہ سے بلیغ تر ہے، ابن جوزیؒ نے اس واقعہ کو موضوعات میں درج کرکے غلطی کی ہے، اسی طرح ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب میں جو ردّ روافض پر لکھی گئی ہے، اس کو موضوع قرار دے کر غلطی کی ہے۔“

حافظ سیّد مرتضیٰ زبیدی رحمہ اللہ ”شرح احیا“ میں لکھتے ہیں:

”وهذا تحامل من ابن الجوزی، وقد ردّ عليه الحافظان السخاوی والسيوطی، وحاله فی ادراج الاحاديث الصحيحة فی حين الموضوعات معلوم عند الائمة، وقد ردّ عليه وعابه كثيرون من اهل عصره ومن بعدهم كما نقله الحافظ العراقی فی اوائل نكته علی ابن

الصلاح فلا نطيل بذكره، وهذا الحديث صححه غير واحد من الحفاظ حتى قال السيوطى ان تعدد طرقه شاهد علىٰ صحته، فلا عبرة بقول ابن الجوزى.“

(اتحاف شرح احیاٗ ج:۷ ص:۱۹۲)

ترجمہ:......”اس واقعہ کو موضوعات میں شمار کرنا ابن جوزیؒ کی زیادتی ہے، حافظ سخاویؒ اور حافظ سیوطیؒ نے ان پر ردّ کیا ہے، اور ابن جوزیؒ جس طرح صحیح احادیث کو موضوعات میں ذکر کرجاتے ہیں وہ ائمہ کو معلوم ہے، ان کی اس رَوِش پر ان کے معاصرین نے بھی اور بعد کے حضرات نے بھی ان کی عیب چینی کی ہے، جیسا کہ حافظ عراقیؒ نے اپنی کتاب ”نکت ابن صلاح“ کے اوائل میں ذکر کیا ہے اور اس حدیث کو بہت سے حفاظِ حدیث نے صحیح کہا ہے۔ سیوطیؒ کہتے ہیں کہ: اس کے طرق کا متعدد ہونا اس کی صحت پر شاہد ہے، اس لئے ابن جوزیؒ کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔“

بہرکیف! یہ واقعہ صحیح ہے اور اس کا شمار معجزاتِ نبویؐ میں ہوتا ہے، رہا آپ کا یہ کہنا کہ: ”یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ لی ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نہ پڑھی ہو؟“ اس کا جواب خود اسی حدیث میں موجود ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کام سے بھیجا تھا، جب وہ اس کام سے واپس آئے تو نماز ہوچکی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سمجھا کہ یہ نماز پڑھ چکے ہوں گے۔

اور آپ کا یہ کہنا کہ: ”نبی سوتا ہے تو اس کا دل جاگتا ہے، پھر نماز کیسے قضا ہوسکتی ہے؟“ اس کا جواب یہ ہے کہ نماز کے اوقات کا مشاہدہ کرنا دل کا کام نہیں، بلکہ آنکھوں کا کام ہے، اور نیند کی حالت میں نبی کی آنکھ سوتی ہے، دل جاگتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ”لیلۃ التعریس“ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقا کی نمازِ فجر قضا ہوئی، واللہ اعلم!

اکابرِ دیوبند کا مسلک

س...... کیا فرماتے ہیں علمائے دین ایسے شخص کے بارے میں جو ایک مسجد کا امام ہے اور درسِ قرآنِ کریم بھی دیتا ہے، مسجد علمائے دیوبند کے منتسبین کی تھی اور اس امام صاحب کو بھی ایک دیوبندی کی حیثیت سے رکھا گیا تھا، مگر ان کے خیالات یہ ہیں:

ا:......سورۂ یوسف کے درس میں حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے نکاح کی بحث میں زلیخا کے متعلق کہا کہ: وہ زانیہ، بدکارہ اور کافرہ تھی۔ بعض شرکائے درس نے جب عرض کیا کہ فلاں فلاں تفسیر میں لکھا ہے کہ نکاح ہوا تھا، مثلاً: معارف القرآن میں۔ تو فرمانے لگے کہ: جنھوں نے لکھا ہے وہ بھی بے ایمان لعنتی ہیں!

۲:......تبلیغی جماعت کی سخت مخالفت کرتا ہے، جماعت کو مسجد میں ٹھہرنے نہیں دیتا ہے اور حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے متعلق کہا کہ وہ مشرک مرگیا اور گالی دے کر کہا کہ: اس نے تبلیغی نصاب میں گند اور شرک بھردیا ہے۔ تبلیغی نصاب کی توہین کرتے ہوئے اس کو ''کتابڑی''، ''شتابڑی'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔

۳:......بعض اکابرین علمائے دیوبند مثلاً: حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ اور حضرت محدث العصر مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے بارے میں کہا کہ یہ حضرات مشرک تھے اور حالتِ شرک ہی میں مرے ہیں۔

۴:......وسیلہ بالذوات الفاضلہ (مثلاً: انبیاء علیہم السلام اور صلحائے امت) کو شرک اور کفر کہتا ہے اور جو کوئی کسی بزرگ کے وسیلہ سے دعا مانگے اس کو مشرک کہتا ہے۔

۵:......انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ برزخی فی القبور کا انکار کرتا ہے اور قائلینِ حیات علمائے دیوبند کو مشرک کہتا ہے۔

۶:......سماعِ موتیٰ کے قائلین کو بھی مشرک کہتا ہے۔

۷:......اپنی رائے کے متعلق کہتا ہے کہ: وہ آخری اور حتمی ہے، میں کسی اور عالم حتیٰ کہ اپنے اساتذہ تک کو بھی نہیں مانتا ہوں۔

اب اہلِ محلّہ اشتعال میں ہیں کہ ایسے آدمی کو ہم امام نہیں رکھیں گے، اب اس سلسلے میں آپ سے مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں:

۱:......کیا ایسا آدمی اہلِ سنت والجماعت میں سے ہے؟

۲:......کیا ایسا آدمی دیوبندی کہلائے گا؟

۳:......کیا ایسے آدمی کو مستقل امام رکھنا اور اس کے پیچھے نمازیں ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

۴:......آیا وہ آدمی عامی کفر کے حکم کا مستحق ہوگا اور اس کی بیوی مطلقہ ہوگی؟

ج......سوال میں جن صاحب کے نظریات درج کئے گئے ہیں، اگر وہ واقعی ان نظریات کا حامل ہے تو یہ اہلِ سنت والجماعت سے خارج ہے، کیونکہ کسی مسلمان کو (خصوصاً کسی مسلّم الثبوت عالم اور بزرگ کو) بے ایمان، لعنتی اور مشرک جیسے الفاظ کے ساتھ یاد کرنا، عقیدۂ اہلِ سنت کے خلاف ہے۔ وسیلہ بالوجہ المشروع کے اہلِ سنت قائل ہیں، اسی طرح حیاتِ برزخی فی القبور کو مانتے ہیں اور سماعِ موتیٰ صحابہؓ کے دور سے مختلف فیہ چلا آرہا ہے، اس لئے سماعِ موتیٰ کے قائلین کو مشرک کہنا، گویا -نعوذ باللہ- صحابہؓ کو مشرک قرار دینا ہے، نعوذ باللہ من الزیغ والضلال!

الغرض اس شخص کے نظریات روافض وخوارج کا سرقہ ہیں، اس لئے اہلِ سنت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

۲:......حضراتِ اکابرِ دیوبند بھی اہلِ سنت ہی کا ایک مکتبِ فکر ہے، جو کتاب و سنت پر عامل، حنفیت کا شارح، سنت کا داعی، بدعت کا ماحی، ناموسِ صحابہؓ کا علم بردار، حضراتِ اولیاء اللہ کا کفش بردار ہے، لہٰذا جو شخص اہلِ سنت سے منحرف ہو وہ دیوبندی نہیں ہوسکتا، اکابرِ دیوبند کے نظریات زیرِ بحث مسائل میں وہ ہیں جو ''المھند علی المفند''

فہرست

میں ہمارے شیخ المشائخ حضرتِ اقدس مولانا الحاج الحافظ الحجة الثقة الامین السیدی خلیل احمد سہارنپوری ثم مہاجر مدنی قدس سرہٗ نے قلم بند فرمائے ہیں، اور اس پر ہمارے تمام اکابر کے دستخط اور تصدیقات ہیں، جو شخص اس رسالہ کے مندرجات سے متفق نہیں وہ دیوبندی نہیں، ہمارے اکابرِ دیوبند واقعتاً اس شعر کا مصداق تھے:

در کف جامِ شریعت در کف سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن!

۳:...... چونکہ یہ شخص طائفہ منصورہ اہل سنت سے منحرف ہے اس لئے اس کی اقتداء میں نماز جائز نہیں، اور یہ اس لائق نہیں کہ اس کو امام بنایا جائے، اہل محلّہ کا فرض ہے کہ اس کو امامت کے منصب سے معزول کردیں۔

۴:...... تکفیر کے مسئلے میں یہ ناکارہ احتیاط کرتا ہے، اس لئے اس شخص کو توبہ وانابت کا اور اہل حق سے وابستگی کا مشورہ دیتا ہے، اس شخص کا اصل مرض خودرائی ہے، جس کی طرف سوال کے جزونمبر:۷ میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:

''اپنی رائے کے متعلق کہتے ہیں کہ: وہ آخری اور حتمی ہے، میں کسی اور عالم کو حتیٰ کہ اپنے اساتذہ تک کو نہیں مانتا۔''

یہی خودرائی اکثر اہل علم کے ضلال وانحراف کا سبب بنتی ہے، خوارج وروافض سے لے کر دورِ حاضر کے کجرولوگوں کو اسی خودرائی نے ورطۂ حیرت میں ڈالا ہے، اس لئے جو شخص صراطِ مستقیم پر چلنے اور راہِ ہدایت پر مرنے کا متمنی ہو اس کو لازم ہے کہ اپنی رائے پر اعتماد کرنے کے بجائے اکابر کے علم وتقویٰ پر اعتماد کرے کہ یہ حضرات علم ومعرفت، فہم وبصیرت، صلاح وتقویٰ اور اتباعِ شریعت میں ہم سے بدرجہا فائق تھے، واللہ اعلم!

سائنس دانوں کے اِلحاد کے اسباب

س...... ماہنامہ ''بینات'' کراچی بابت ماہ جمادی الاُولیٰ ۱۳۹۳ھ میں جناب پروفیسر مجتبیٰ کریم صاحب کا ایک مضمون سائنس کی ابتدائی معلومات پر شائع ہوا ہے، موصوف نے پہلے پیراگراف میں لکھا ہے:

"کہا جاتا ہے کہ سائنس پڑھنے والا دہریہ ہوتا ہے، مگر یہ واقعہ نہیں ہے، سائنس کے اُصولوں کو غور سے دیکھا جائے تو خداوندِ قدوس کے کرشموں کا اعتراف کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا، سائنس دانوں پر دہریہ ہونے کا اِلزام غلط ہے۔"

ج...... راقم الحروف کے خیال میں یہ بات جزوی طور پر تو صحیح ہے، لیکن امریکہ، یورپ، رُوس اور کمیونسٹ ممالک کے سائنس دان اکثر و بیشتر نیم ملحد اور دہریے نظر آئیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ سائنسی ایجادات نے عقل کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا، اور مادّی سطح پر انسان کی راحت و سہولت کی وہ صورتیں وجود میں آئیں جن کا کچھ مدّت پہلے تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، مگر سائنس دان حقیقتِ کبریٰ تک رسائی سے محروم رہے۔

"ایٹم" کا جگر چیر کر اس کے بنیادی عناصر اور اس کی پنہاں قوّت کی دریافت میں وہ ضرور کامیاب ہوئے مگر انسانیت کے اجزائے ترکیبی اور اس کی قدر و قیمت کا معما ان سے حل نہ ہوسکا۔ انہوں نے تمام علویات و سفلیات کے نظامِ اِرتقا کی کڑیاں بڑی محنت سے تلاش کیں، مگر خود انسان کی معراجِ ارتقا اور اس کا مبداء و منتہیٰ کیا ہے؟ اس کا جواب ان سے نہ بن پڑا۔ وہ کائنات کی ایک ایک چیز کے اوصاف و خواص کو ڈھونڈتے پھرے، مگر انسانیت کے اخلاق و اقدار، اور اس کے بننے اور بگڑنے کے اسباب کی جستجو سے وہ ہمیشہ عاجز رہے۔ انہوں نے مختلف اعراض و جواہر کی پیمائش کے مختلف آلات ایجاد کئے، مگر پیمائشِ انسانیت کا پیمانہ ان کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔ انہوں نے بڑی حساس خوردبینوں کے ذریعہ چھوٹے سے چھوٹے جراثیم تک دیکھ ڈالے، مگر انہیں "خودشناسی" کی کوئی خوردبین میسر نہ آئی، جس سے انہیں خود اپنے نفس کا کوئی جرثومہ نظر آتا۔ الغرض! سائنس کی ترقی نے ایک دُنیا بدل کر رکھ دی، مگر افسوس کہ مشرق و مغرب کے ملحد سائنس دان "خداشناسی" اور "انسان شناسی" کی دولت سے تہی دامن ہی رہے۔ بلاشبہ ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا، مگر ہوا، اور سب کے سامنے ہو رہا ہے، ایسا کیوں ہوا؟ آیئے اس "کیوں" کا جواب کسی "خضرِ راہ" سے دریافت کریں۔ حضرت موسیٰ و خضر (علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰة

والسلام) کا جو قصہ قرآن مجید میں ذکر کیا گیا، اسی قصے میں حضرت خضر علیہ السلام کا ایک ایسا فقرہ صحیح بخاری کی حدیث میں مروی ہے، جس سے یہ عقدہ حل ہوجاتا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب طالب علمانہ حیثیت میں حضرت خضر علیہ السلام کی رفاقت کی درخواست کی تو اس کے جواب میں حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا:

"یا موسٰی! انی علٰی علم من علم اللہ علمنیه لا تعلمه أنت، وأنت علٰی علم من اللہ علمک اللہ، لا أعلمه." (صحیح بخاری ج:۲ ص:۶۸۸)

ترجمہ:...... "اے موسیٰ! میں اللہ کی جانب سے (عطا کردہ) ایک ایسے علم پر ہوں، جس کو آپ نہیں جانتے، اور آپ اللہ کی جانب سے (عطا شدہ) ایک ایسے علم پر (حاوی) ہیں جس کو میں نہیں جانتا۔"

اور دُوسری روایت میں اس کے بجائے یہ الفاظ ہیں:

"أما یکفیک أن التوراة بیدیک؟ وأن الوحی یأتیک؟ یا موسٰی! ان لی علمًا لا ینبغی لک أن تعلمه وان لک علمًا لا ینبغی لی أن أعلمه." (ج:۲ ص:۶۸۹)

ترجمہ:...... "کیا آپ کو اتنا کافی نہیں کہ آپ کے ہاتھوں میں توراۃ موجود ہے، نیز آپ کے پاس وحی آتی ہے؟ اے موسیٰ! میرے پاس جو علم ہے اس کا سیکھنا آپ کے شایانِ شان نہیں، اور آپ کے پاس جو علم ہے اس پر حاوی ہونا میرے بس کی بات نہیں۔"

حضرت خضر علیہ السلام کے اس حکیمانہ فقرے میں جو کچھ سمجھایا گیا، اس کی تشریح کے لئے مندرجہ ذیل نکات ملحوظ رکھے جائیں:

ا:...... حق تعالیٰ کی جانب سے مخلوق کو دو قسم کے علم عطا کئے گئے ہیں، ایک کائنات کے اسرار و رموز، اشیاء کے اوصاف و خواص اور فوائد و نقصانات کا علم جسے "علمِ کائنات" یا "تکوینی علم" کہا جاتا ہے، تمام انسانی علوم اور ان کے سینکڑوں شعبے اسی "علمِ

کائنات“ کی شاخیں ہیں، مگر معلوماتِ خداوندی کے مقابلے میں انسان کا یہ کائناتی علم سمندر کے مقابلے میں ایک قطرے کی اور پہاڑ کی مقابلے میں ایک ذرّہ کی نسبت بھی نہیں رکھتا۔ اور دُوسرا وہ علم جو خالقِ کائنات کی ذات وصفات، اس کی مرضیات و نامرضیات اور انسان کی سعادت وشقاوت کی نشاندہی کرتا ہے، اسے ”علم الشرائع“ یا ”تشریعی علوم“ سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

۲:...... یہ دونوں علم حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے ہی بندوں کو عطا کئے جاتے ہیں، مگر دونوں کے ذرائع الگ الگ ہیں۔ قسمِ اوّل کے لئے احساس، عقل، تجربہ اور فہم و فراست عطا کئے گئے ہیں، اور جہاں انسانی عقل وخرد کی رسائی نہیں ہوسکتی، وہاں وحی اور اِلہام سے اس کی راہ نمائی کی جاتی ہے، چنانچہ انسان کی دُنیوی زندگی سے متعلقہ تمام علوم کے مبادیات وحی واِلہام کے ذریعہ سکھائے گئے: ”وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْأَسْمَآءَ کُلَّهَا“۔ مزید براں انسان کی فطرت میں عقلی و تجرباتی علوم میں ترقی کی وافر استعداد رکھی گئی۔ اسی علم کا ایک شعبہ حضرت خضر علیہ السلام کو وہبی طور پر عطا کیا گیا، اور خالقِ کائنات کی ذات وصفات کی معرفت اور اس کی مرضیات و نامرضیات کی پہچان چونکہ انسانی ادراک سے بالاتر تھی، بنابریں اس کا مدار محض عقل وتجربے پر نہیں رکھا گیا، بلکہ اس کی تعلیم کے لئے انبیائے کرام علیہم السلام کا ایک مستقل سلسلہ جاری کیا گیا، جس کی ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور انتہاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوئی۔ حضراتِ انبیاء علیہم السلام کو معرفتِ ذات وصفات، مبداء و معاد، سعادت و شقاوت، فضائل و رذائل، عذاب وثواب کی تفصیلات سے بذریعہ وحی مطلع کیا گیا۔ ان کے سامنے حق تعالیٰ تک پہنچنے کا صاف ستھرا راستہ کھولا گیا، ان کو اس صراطِ مستقیم کی دعوت پر مأمور کیا گیا، اور ان حضرات کو اولادِ آدم کا مقتدا بناکر پوری انسانیت کی سعادت وشقاوت کو ان کے قدموں سے وابستہ کردیا گیا، یہی وہ علم تھا جو موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا گیا۔

۳:...... انبیائے کرام (علیہم السلام) بھی چونکہ انسانی برادری کا ایک معزّز گروہ ہے اور انہیں بھی اس ناسوتی زندگی کی ضروریات بہرحال لاحق ہیں، اس لئے وہ انسان کی

دُنیوی حاجات سے بے خبر نہیں، نہ کسبِ معاش کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں، نہ اس زندگی سے متعلقہ علوم کی نفی کرتے ہیں، بلکہ بشرطِ ضرورت خود بھی کسبِ معاش کرتے ہیں۔ البتہ زندگی کی حرکت وسکون اور کسبِ معاش کے ہر طور وطریق پر وہ اس نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہیں کہ یہ حق تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے یا نہیں؟ اور یہ مسافرِ آخرت کے لئے زادِ راہ ہے یا اس کی منزل کو کھوٹا کرتا ہے؟ الغرض! وہ ہر شعبۂ زندگی کے متعلق ہر شخص کو ہدایات دیتے ہیں، جائز و ناجائز بتاتے ہیں، اچھے اور بُرے کی نشاندہی کرتے ہیں، مگر خود کسی علم اور فن کو اپنا موضوع نہیں بناتے، بلکہ ''أنتم أعلم بأمور دُنیاکم'' کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں، گویا دُنیا کے کسی علم وفن اور فلسفہ وسائنس کو موضوع بنانا ان کی اعلیٰ وارفع شان سے فروتر چیز ہے۔ یہی مطلب ہے حضرت خضر علیہ السلام کے اس ارشاد کا کہ: ''اے موسیٰ! میرے پاس جو علم ہے اس کا سیکھنا آپ کے شایانِ شان نہیں۔'' یہی وجہ ہے کہ مادّیات کی جو ترقی ان کے اُمتیوں کے ہاتھوں ہوئی خود ان حضرات کے ہاتھ اس سے ملوّث نہیں ہوئے، اور غالباً یہی نکتہ ہے کہ جہاں تک دین کی ترقی کا تعلق تھا ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی محنت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور جب اس پر فتوحات کا دروازہ کھلا تو ہاتھ جھاڑ کر دُنیا سے تشریف لے گئے، اور یہ کام اپنے خلفاء کے سپرد فرمایا۔

۴:...... انبیائے کرام علیہم السلام پر جو علوم کھولے گئے ہیں، وہ صرف انہیں کے لئے نہیں ہیں بلکہ تمام انسانیت ان کی محتاج ہے، اس لئے کہ دُنیا کا کوئی بڑے سے بڑا دانشور، حکیم، سائنس دان اور فلاسفر ان علوم کو انبیاء علیہم السلام کی وساطت کے بغیر حاصل نہیں کرسکتا۔ عام انسانوں کا کمال یہی ہے کہ وہ ان علومِ نبوّت کا کچھ حصہ ان حضرات کے ذریعہ حاصل کرسکیں، نہ وہ تمام علومِ نبوّت کا احاطہ کرسکتے ہیں، اور نہ انبیاء علیہم السلام سے مستغنی ہوکر انہیں علومِ نبوّت کا کوئی شمہ نصیب ہوسکتا ہے۔ یہی مطلب ہے حضرت خضر علیہ السلام کے ارشاد کا کہ: ''اور آپؑ کے پاس جو علم ہے اس پر حاوی ہوجانا میرے بس کی بات نہیں۔'' اگر پرائمری کا طالبِ علم ریاضی کے دقیق مسائل یا ایٹمی نظریہ کی تشریحات سمجھنے سے قاصر ہے تو اس میں قصور ان مسائل کا نہیں بلکہ طالبِ علم کی پست ذہنی کا ہے۔ انبیائے

کرام علیہم السلام کے سامنے دُنیا بھر کے عقلاء و حکماء اور افلاطون و جالینوس طفلِ مکتب ہیں، نہ وہ ان اساتذۂ فطرت (علیہم السلام) سے مستغنی ہو سکتے ہیں، نہ ان کے علوم پر حاوی ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

فلسفہ و سائنس کے ماہرین، علم و دانش اور عقل و فہم کے جس مرتبے پر فائز ہیں اس کی وجہ سے کائنات کی بوقلمونیوں سے بہ نسبت دُوسروں کے زیادہ واقف اور فطرت کی نیرنگیوں کے سب سے زیادہ شناسا ہیں، ان سے یہ توقع بے جا نہیں تھی کہ وہ قدرتِ خداوندی کے سامنے سب سے زیادہ سرنگوں ہوں گے، رسالت و نبوّت کی ضرورت و اہمیت اور انبیائے کرام علیہم السلام کی قدر و منزلت سب سے زیادہ انہی پر کھلے گی، وحیٔ الٰہی سے - جو انبیائے کرام علیہم السلام پر نازل ہوتی ہے - سب سے زیادہ استفادہ وہی کریں گے، انبیائے کرام علیہم السلام سے وفاداری و جاں نثاری اور اطاعت و فرمانبرداری کا مظاہرہ سب سے بڑھ کر انہی کی جانب سے ہوگا، لیکن بدقسمتی سے سائنس کی قیادت جن ہاتھوں میں آئی وہ معرفت کے دروازے پر پہنچ کر واپس لوٹ آئے، انہوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کی اطاعت کو عار سمجھا اور تعلیماتِ نبوّت سے استغنا کا مظاہرہ کیا، یوں ارشادِ خداوندی: "وَأَضَلَّهُ اللهُ عَلٰى عِلْمٍ" (اور گمراہ کردیا اس کو اللہ تعالیٰ نے باوجود علم کے) ان پر صادق آیا۔ دورِ قدیم کے فلاسفہ، انبیائے کرام علیہم السلام کی عظمت کے قائل تھے، مگر ان کا کہنا تھا کہ یہ حضرات تو عوام کی اصلاح کے لئے تشریف لائے ہیں جبکہ ہم تہذیب و تربیت کے اس مرتبے پر فائز ہیں جہاں سے نبوّت سے استفادہ کی ضرورت نہیں رہ جاتی: "ونحن قوم هذبنا أنفسنا"۔ اِدھر دورِ جدید کے فلاسفہ (سائنس دان) غرور و تکبر میں ان سے ترقی یافتہ ثابت ہوئے، انہوں نے انبیائے کرام علیہم السلام اور ان کے مشن کو بنظرِ حقارت دیکھا، انبیائے کرام علیہم السلام کے زُہد و قناعت اور دُنیا سے بے رغبتی، جس کی دعوت انبیائے کرام علیہم السلام کا خاص موضوع ہے، اس سے نفرت و بیزاری کا اظہار کیا، اور وہ مخصوص علوم، جو انبیائے کرام علیہم السلام کو عطا کئے جاتے ہیں، ان کے بارے میں نہ صرف شک و شبہ بلکہ ضد و عناد کا مظاہرہ کیا، نتیجتاً وہ نہ صرف نورِ ایمان سے محروم رہے بلکہ انسانیت کے اعلیٰ

فہرست

اخلاق واقدار سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اب ان کی محنت ''انسان'' اور ''انسانیت'' کے بجائے مٹی اور مٹی سے نکلنے والی چیزوں پر صَرف ہورہی ہے، چیزیں بن رہی ہیں اور انسانیت بگڑ رہی ہے۔

سائنس اپنی تمام ترافادیت کے باوجود ان مغرور سائنس دانوں کو دہریت والحاد کے بھنور سے نہ نکال سکی، بلکہ اس کے برعکس وہ سائنس کو ملحد اور دہریہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ سائنس کے ان نیم پختہ ادھورے نظریات کی بناپر (جن کو آج شد و مد سے ثابت کیا جاتا ہے، اور کل ان کے غلط ثابت کرنے پر دلائل دیئے جاتے ہیں) سائنس کے بہت سے مسلم طلبہ نے اسلام کے مقابلے میں دہریت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا شروع کردیا، یوں دہریت اور بددِینی سائنسی دور کا فیشن بن کر رہ گئی۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے مقابلے میں سائنس دانوں کی اس متکبرانہ رَوِش کا سبب مادّیت کا غلط نشہ تھا، علمائے سائنس نے یہ فرض کرلیا کہ مادّیت کا یہ عروج، یہ برق اور بھاپ، یہ سیارے اور طیارے، یہ ایٹم اور قوّت انسانیت کا کمال بس انہی چیزوں کی خیرہ سامانی ہے، فضاؤں میں اُڑنا، دریاؤں میں تیرنا، چاند پر پہنچنا، سورج کے طول وعرض کو ناپنا اور زہرہ ومشتری کی خبریں لانا، بس یہی انسانیت کی آخری معراج ہے، اور یہ ترقی چونکہ انبیاء علیہم السلام کے زمانے میں نہیں ہوئی اس لئے نہ صرف یہ کہ سائنسی دور، دورِ نبوّت سے افضل ہے، بلکہ یہ ترقی یافتہ لوگ خود تمام انسانوں سے بڑھ کر ہیں، اور اس کا پروپیگنڈا اس شدت سے کیا گیا کہ آج بہت سے مسلمان بھی موجودہ دور کو ''مہذب دور'' سے اور دورِ قدیم کو (جو انبیاء علیہم السلام کا دور تھا) ''تاریک دور'' سے تعبیر کرتے ہوئے نہیں شرماتے، اناللہ وانا الیہ راجعون!

حالانکہ نبوّت سے کٹ کر جس ترقی پر آج کی دُنیا پھولی نہیں سماتی انبیائے کرام علیہم السلام کی نظر میں اس کی قیمت پرِکاہ کے برابر بھی نہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة لما سقٰى كافرًا منها شربةً." (مشکوٰۃ)

فہرست

ترجمہ:...... ''اگر اللہ کے نزدیک پوری دُنیا کی قیمت مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو اس میں سے پانی کا ایک گھونٹ تک نہ دیتے۔''

انبیائے کرام علیہم السلام کے سامنے آخرت کی لامحدود زندگی ہے، جہاں کی نعمت ولذّت اور راحت وآرام کا تصوّر بھی یہاں نہیں کیا جاسکتا۔ انسان کی کوئی چاہت ایسی نہیں جو وہاں پوری نہ کی جائے، اور کسی قسم کا غم اور اندیشہ ایسا نہیں جس کے لاحق ہونے کا خطرہ وہاں درپیش ہو، زندگی ایسی کہ موت کا احتمال تک نہیں، صحت ایسی کہ مرض کا اندیشہ تک نہیں، جوانی ایسی کہ پیری کا تصوّر تک نہیں، راحت ایسی کہ کلفت کا نام ونشان تک نہیں، سلطنت اتنی بڑی کہ اس کے مقابلے میں یہ زمین وآسمان بیضۂ مور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے جس کی آنکھوں کے سامنے آخرت کی یہ بے حد ونہایت زندگی اپنی تمام تر جلوہ افروزی ونعمت سامانی کے ساتھ پھیلی ہوئی ہو وہ ہماری مکروہات وحوادث سے بھرپور زندگی کو کھیل تماشے سے تعبیر نہ کرے تو اس سے زیادہ صحیح تعبیر اور کیا ہوسکتی ہے...؟ قرآنِ کریم نے بار بار یہ کہہ کر خوابیدہ انسانیت کو خوابِ غفلت سے چونکایا ہے:

''وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ، وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ.'' (العنکبوت:۶۴)

ترجمہ:...... ''اور یہ دُنیوی زندگی (فی نفسہٖ) بجز لہو ولعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالمِ آخرت ہے، اگر ان کو علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے (کہ فانی میں منہمک ہوکر باقی کو بھلا دیتے اور اس کے لئے سامان نہ کرتے)۔'' (بیان القرآن)

چار پانچ سالہ بچہ اگر لکڑی کے چند ٹکڑے اِدھر اُدھر جمع کرکے اور انہیں کیف ما اتفق جوڑ کر ''چاند گاڑی'' بنالے تو یہ کھیل اس کی ذہانت کی دلیل ہے، اور اگر ابا میاں بھی صاحبزادے کی نقالی میں اس طرح کی ''گاڑیاں'' بنانے کو زندگی کا موضوع بنالیں تو یہ ذہانت کی نہیں، بلکہ دماغ چل نکلنے کی علامت ہے۔ آپ ننھے بچوں کو ریت اور مٹی کے

فہرست

گھروندے بناتے روزانہ دیکھتے ہیں، اور اگر آپ کسی دن کسی ''بڑے صاحب'' کو یہی شغل فرماتے دیکھ لیں تو ان صاحب کے بارے میں آپ کی رائے کچھ اور ہوگی۔ کپڑوں کی کترنیں جمع کر کے گڑیاں بنانا ننھی بچیوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے، اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے کبھی ان کی امی جان بھی ان کی راہ نمائی فرماتی ہیں، لیکن اگر بیگم صاحبہ تمام کاموں کو چھوڑ چھاڑ کر گڑیوں کے کھیل ہی کو زندگی کا مشن بنالیں تو علاج کی ضرورت ہے۔

ٹھیک اسی طرح دُنیا کی پوری زندگی اپنی دِل فریبیوں اور فتنہ سامانیوں کے باوجود انبیائے کرام علیہم السلام کی نظر میں ایک کھیل ہے، اور جن لوگوں نے اسی کھیل کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنالیا ہے، جن کی ساری محنت اسی پر صَرف ہو رہی ہے، اور جو اسی کے لئے چلتے پھرتے اور جیتے مرتے ہیں، وہ اگرچہ بزعمِ خویش بہت بڑے کارنامے انجام دے رہے ہیں، نئی نئی ایجادیں کر رہے ہیں، یا بڑی بڑی جمہوریتیں چلا رہے ہیں، مگر انبیائے کرام علیہم السلام کے نزدیک ان کی انسانیت قابلِ علاج ہے۔

فرمایا گیا ہے:

''قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ أَعْمَالًا. اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا.'' (الکہف:۱۰۳، ۱۰۴)

ترجمہ:...... ''آپؐ (ان سے) کہئے کہ کیا تم کو ایسے لوگ بتائیں جن کے کارنامے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں؟ (لو سنو!) یہ وہ لوگ ہیں جن کی دُنیا میں کی کرائی ساری محنت (یہیں) ضائع ہوکر رہ گئی، اور وہ (بربنائے جہل) اسی خیال میں ہیں کہ وہ (بڑا) اچھا کام کر رہے ہیں۔''

الغرض! انبیائے کرام علیہم السلام کے دور میں خود ان کے ہاتھوں مادّی ترقی کے نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ ان کا دور آج کے دور کی بہ نسبت -معاذ اللہ- تاریک اور غیر مہذب تھا اور انسانیت نے ارتقا کی ابتدائی منزلیں ابھی طے نہیں کی تھیں، بلکہ اس کا اصل سبب یہ

ہے کہ ان کے بلند ترین منصب اور عظیم تر مشن کے مقابلے میں مادّیت کا یہ سارا کھیل بازیچۂ اطفال کی حیثیت رکھتا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام ''ایٹم'' کی دریافت کے لئے نہیں آتے، بلکہ وہ اس ذاتِ عالی سے انسانیت کو آشنا کرتے ہیں جن کے ادنیٰ اشارہ ''کُــنْ'' میں ہزاروں ''ایٹم'' پوشیدہ ہیں، ان کی نگہِ بلند صرف کائنات کے باہمی ربط میں کھو کر نہیں رہ جاتی، بلکہ وہ اس پر غور کرتے ہیں کہ کائنات کا، خالق کی قدرت سے کیا ربط ہے؟ ان کا موضوع چیزوں کی محنت نہیں ہوتا، بلکہ انسان سازی کی محنت ہوتا ہے، ان کے نزدیک ان چیتھڑوں کی کوئی اہمیت نہیں جن کو دُنیا کے نابالغوں نے بڑی خوبصورتی سے الماریوں میں سجا رکھا ہے، ان مٹی کے گھروندوں کی کوئی قیمت نہیں جن کو یہ نادان بچے نقش و نگار سے آراستہ کرتے ہیں، اور دُنیا کی ظاہری زرق برق میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں جس پر یہ طفلانِ بے شعور ریجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ وہ ایک فناپذیر تودۂ خاک کے سوا کچھ نہیں، اسی حقیقت کا اظہار بھی وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''ما لی وللدنیا؟ وما أنا والدنیا الا کراکبٍ استظل تحت شجرة ثم راح وترکھا.'' (مشکوٰۃ)

ترجمہ:...... ''مجھے دُنیا سے کیا واسطہ؟ اور میری اور دُنیا کی مثال تو ایسی ہے کہ ایک راہ رو کسی درخت کے سائے میں اُترا، تھوڑی دیر سستایا، پھر اسے چھوڑ کر چل پڑا (اور پھر اسے دوبارہ وہاں لوٹ کر آنے کی نوبت کبھی نہیں آئی)۔''

اور کبھی لوگوں کو اس حقیقتِ کبریٰ سے یوں آگاہ کرتے ہیں:

''کن فی الدُّنیا کأنک غریب أو عابر سبیل وعد نفسک فی أھل القبور.'' (صحیح بخاری)

ترجمہ:...... ''دُنیا میں ایسے رہو گویا تم یہاں چند روزہ مسافر ہو یا راہ نورد۔ اور یوں سمجھو کہ تم اہلِ قبور کی صف میں شامل ہو (آج نہیں تو کل تمہارا نام بھی پکارا جائے گا)۔''

فہرست

مابعد الطبعیات سے اندھی بہری سائنس، جس کے نزدیک کسی چیز کو تسلیم کرنے کے لئے اس کو مشاہدے کے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھنا شرط ہے، چونکہ اس حقیقت کو سمجھنے سے عاجز ہے اس لئے وہ ''ایمان بالغیب'' کے تمام سرمایۂ نبوّت کو ایک خندۂ استہزاء کی نذر کردیتی ہے، اور یہاں سے اس کی ملحدانہ شفقت کا آغاز ہوتا ہے۔

الغرض سائنس دانوں کی تمام تر محرومی کا باعث ''نبوّت'' سے انحراف ہے، اور اس انحراف کا باعث جہل و غرور۔ اگر ان پر کائنات کی اندرونی حقیقت کھل جاتی تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ کائنات صرف یہی نہیں جس کا تعلق موت سے قبل کے مشاہدے سے ہے، بلکہ یہ تو اصل کائنات کا ایک حقیر ذرّہ ہے، اور اس ایک ذرّہ کی حقیقت کا بھی ایک ذرّہ آج تک ان پر منکشف نہیں ہوا، اگر اصل کائنات اور پھر کائنات سے آگے خالقِ کائنات کا راز ان پر کھل جائے تو انہیں معلوم ہوجائے کہ کھربوں ڈالر خرچ کرکے چاند سے چار سیر مٹی لے آنا ترقی کی علامت نہیں، بلکہ سفاہت و کم عقلی کا نشان ہے۔ دامنِ نبوّت سے کٹ کر سائنس کی اس ''سفیہانہ محنت'' نے انسانیت کو بے قراری و بے چینی اور کرب و اضطراب کا ''تحفہ'' عطا کیا، اور اس بے چینی کی وقتی تسکین کے لئے مختلف قسم کی مصنوعی تفریحات اور منشیات کا نسخہ تجویز کیا۔ آج کا مفلوج انسان جن اخلاقی، رُوحانی، نفسیاتی اور جسمانی امراض کا تختۂ مشق بن کر رہ گیا ہے، اہلِ عقل کو تجزیہ کرنا چاہئے کہ ان میں ''سائنسی ترقی'' کا حصہ کتنا ہے...؟ راقم الحروف کا ایمان ہے کہ جب تک سائنس کی تگ و دو نبوّت کے تابع نہیں ہوجاتی، جب تک سائنس کا رُخ دُنیا سے آخرت کی طرف نہیں مڑ جاتا اور جب تک سائنس دان انبیائے کرام علیہم السلام کے سامنے اپنے علمی عجز کا اعتراف نہیں کرتے، تب تک سائنس بدستور ملحد رہے گی اور اس کا سارا ترقیاتی کارنامہ انسانیت کی ہلاکت اور بربادی کے کام آئے گا۔ رہا یہ سوال کہ کیا سائنس کو نبوّت کے دامن سے وابستہ کرنا ممکن ہے؟ اس کا جواب مسلم سائنس دانوں کی جرأت و ہمت اور فہم و فراست کا منتظر ہے۔

سائنس کے جدید نظریات نے کٹر سے کٹر دہریت نواز سائنس دانوں کو بھی

"وجودِ خدا" کے اعتراف پر مجبور کردیا ہے (اگرچہ وہ اتنی جرأت نہیں رکھتے کہ کھل کر اس کا اعلان کریں)، مگر یہ کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ صرف "وجودِ خدا" کا مبہم تصوّر دہریت کے مارگزیدوں کا تریاق نہیں ہے، نہ محض اس تصوّر سے ایک آدمی "خداپرست" کہلانے کا مستحق قرار پاتا ہے، بلکہ اسے یقین وایمان کی روشنی میں اس سے آگے کے مراحل طے کرنا ہوں گے، یعنی خدا کی صفات کیا ہیں؟ اس عالم کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اس نے انسان کی اچھائی اور بُرائی کے کیا معیار تجویز کئے ہیں؟

خواب میں زیارتِ نبوی

س...... کیا خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ممکن ہے؟ اگر ممکن ہے تو کیسے پتہ چلے کہ یہ خواب سچا ہے؟ بعض لوگ خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی دوسری شکل میں دیکھتے ہیں، کیا وہ بھی صحیح خواب ہوگا؟

ج...... صحیحین کی روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد متعدد اور مختلف الفاظ میں مروی ہے کہ:

"من رانی فی المنام فقد رانی، فان الشیطان لا یتمثل بی!"

ترجمہ:...... "جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے مجھ ہی کو دیکھا، کیونکہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا!"

ایک اور روایت میں ہے:

"من رانی فقد رأی الحق!" (مشکوٰۃ ص:۳۹۴)

ترجمہ:...... "جس نے مجھے دیکھا اس نے سچا خواب دیکھا!"

خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارتِ شریفہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی شکل اور حلیہ مبارک میں دیکھے۔ دوم یہ کہ کسی دوسری ہیئت و شکل میں دیکھے۔ اہلِ علم کا اس پر تو اتفاق ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت آپؐ کے اصل حلیہ مبارک میں ہو تو ارشادِ نبویؐ کے مطابق، واقعی آپؐ کی زیارت نصیب

ہوئی، لیکن اگر کسی دوسری ہیئت وشکل میں دیکھے تو اس کو بھی زیارتِ نبویؐ کہا جائے گا یا نہیں؟ اس میں علماء کے دو قول ہیں: ایک یہ کہ یہ زیارتِ نبویؐ نہیں کہلائے گی، کیونکہ ارشادِ نبویؐ کے مطابق خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا صرف یہ مطلب ہے کہ آپؐ کو اصلی شکل وصورت اور حلیہ مبارک میں دیکھے، پس اگر کسی نے مختلف حلیہ میں آپؐ کو دیکھا تو یہ حدیثِ بالا کا مصداق نہیں۔ اور بعض اہلِ علم کا قول یہ ہے کہ آپؐ کو خواہ کسی شکل وصورت اور حلیہ میں دیکھے وہ آپؐ ہی کی زیارت ہے، اور آپؐ کے اصل حلیہ مبارک سے مختلف شکل میں دیکھنا خواب دیکھنے والے کے نقص کی علامت ہے۔ شیخ عبدالغنی نابلسی رحمہ اللہ "تعطیر الانام فی تعبیر المنام" میں دونوں قسم کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"فعلم ان الصحيح بل الصواب كما قاله بعضهم ان رؤياه حق علىٰ اى حالته فرضت ثم ان كانت بصورته الحقيقية فى وقت ما، سواء كان فى شبابه او رجوليته او كهولته او آخر عمره لم تحتج الىٰ تأويل. والا احتيجت لتعبير يتعلق بالرائى. ومن ثم قال بعض علماء التعبير: من راٰه شيخا فهو غاية سلم، ومن راٰه شابا فهو غاية حرب، ومن راٰه متبسمًا فهو متمسک بسنته.

وقال بعضهم: من راٰه علىٰ هيئته وحاله كان دليـلًا علىٰ صلاح الرائى وكمال جاهه وظفره بمن عاداه، ومن راٰه متغير الحال عابسا كان دليـلًا علىٰ سوء حال الرائى.

وقال ابن ابى جمرة: رؤياه فى صورة حسنة حسن فى دين الرائى، ومع شين او نقص فى بعض بدنه خلل فى دين الرائى. لانه صلى الله عليه وسلم كالمراٰة الصقيلة ينطبع فيها ما يقابلها. وان كانت ذات المراٰة

علی احسن حالہ واکملہ، وھذہ الفائدۃ الکبریٰ فی رؤیاہ صلی اللہ علیہ وسلم اذ بہ یعرف حال الرائی."

(ج:۲ ص:۲۷۶، ۲۷۷)

ترجمہ:......"پس معلوم ہوا کہ صحیح بلکہ صواب وہ بات ہے جو بعض حضرات نے فرمائی کہ خواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بہرحال حق ہے۔ پھر اگر آپؐ کے اصل حلیہ مبارک میں دیکھا خواہ وہ حلیہ آپؐ کی جوانی کا ہو یا پختہ عمری کا، یا زمانہ پیری کا، یا آخر عمر شریف کا، تو اس کی تعبیر کی حاجت نہیں، اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اصل شکل مبارک میں نہیں دیکھا تو خواب دیکھنے والے کے مناسب حال تعبیر ہوگی، اسی بنا پر بعض علمائے تعبیر نے کہا ہے کہ جس نے آپؐ کو بڑھاپے میں دیکھا تو یہ نہایت صلح ہے، اور جس نے آپؐ کو جوان دیکھا تو یہ نہایت جنگ ہے، اور جس نے آپؐ کو مسکراتے دیکھا تو یہ شخص آپؐ کی سنت کو تھامنے والا ہے۔

اور بعض علمائے تعبیر نے فرمایا ہے کہ: جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلی شکل و حالت میں دیکھا تو یہ دیکھنے والے کی درست حالت، اس کی کمالِ وجاہت اور دشمنوں پر اس کے غلبہ کی علامت ہے، اور جس نے آپؐ کو غیر حالت میں (مثلاً) تیور چڑھائے ہوئے دیکھا تو یہ دیکھنے والے کی حالت کے بُرا ہونے کی علامت ہے۔

حافظ ابن ابی جمرہؒ فرماتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی صورت میں دیکھنا، دیکھنے والے کے دین کے اچھا ہونے کی علامت ہے، اور عیب یا نقص کی حالت میں دیکھنا دیکھنے والے کے دین میں خلل کی علامت ہے، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی مثال شفاف آئینہ کی سی ہے، کہ آئینہ کے سامنے جو چیز آئے اس کا عکس اس میں آجاتا ہے، آئینہ بذاتِ خود کیسا ہی حسین و باکمال ہو (مگر بھدی چیز اس میں بھدی ہی نظر آئے گی)، اور خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارتِ شریفہ کا بڑا فائدہ یہی ہے کہ اس سے خواب دیکھنے والے کی حالت پہچانی جاتی ہے۔''

اس سلسلے میں مسند الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ کی ایک تحقیق فتاویٰ عزیزی میں درج ہے، جو حسبِ ذیل ہے:

''سوال:...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں اہل سنت اور شیعہ دونوں فرقہ کو میسر ہوتی ہے، اور ہر فرقہ کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لطف و کرم اپنے حال پر ہونا بیان کرتے ہیں، اور اپنے موافق احکام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سننا بیان کرتے ہیں، غالباً دونوں فرقہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں افراط کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا، اور خطراتِ شیطانی کو اس مقام میں دخل نہیں تو ایسے خواب کے بارے میں کیا خیال کرنا چاہئے؟

جواب:...... یہ جو حدیث شریف ہے: ''من رآنی فی المنام فقد رآنی!'' یعنی جناب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: جس نے مجھ کو خواب میں دیکھا تو اس نے فی الواقع مجھ کو دیکھا ہے، تو اکثر علماء نے کہا ہے کہ یہ حدیث خاص اس شخص کے بارے میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صورتِ مبارکہ میں دیکھے جو بوقتِ وفات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مبارکہ تھی، اور بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ حدیث عام ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی وقت کی صورت میں دیکھے تو وہ خواب صحیح ہوگا، یعنی ابتدائے نبوت سے تا وقتِ وفات جوانی اور کلاں سالی اور سفر

فہرست

اور حضر اور صحت اور مرض میں جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صورتِ مبارک تھی، ان صورتوں میں سے جس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھے تو وہ خواب صحیح ہوگا، یعنی فی الواقع اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہوگا۔ اور جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں سنّی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے اسی طرح شیعہ نے کبھی نہ دیکھا ہے، اور فرضیات کا اعتبار نہیں۔

تحقیق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنا چار قسموں پر ہے۔ ایک قسم رؤیائے الٰہی ہے کہ اتصال تعین کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے۔ اور دوسری قسم ملکی ہے اور وہ متعلقاتِ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا ہے، مثلاً: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ورثہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبِ اطہر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور محبت میں سالک کا درجہ اور اس کے مانند اور جو امور ہیں تو ان امور کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مقدس میں دیکھنا پردۂ مناسبات میں ہو جو فنِ تعبیر میں معتبر ہے۔ اور تیسری قسم رؤیائے نفسانی ہے کہ اپنے خیال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صورت ہے اس صورت میں دیکھنا۔ اور یہ تینوں اقسام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کے بارے میں صحیح ہیں۔

چوتھی قسم شیطانی ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مقدس میں شیطان اپنے کو خواب میں دکھلائے، اور یہ صحیح نہیں ہوسکتا، یعنی ممکن نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ

مقدس کے مطابق شیطان اپنی صورتِ خبیث بنا سکے اور خواب میں دکھلا وے، البتہ مغالطہ دے سکتا ہے، اور تیسرے قسم کے خواب میں بھی کبھی شیطان ایسا کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز اور بات کے مشابہ شیطان بات کرتا ہے اور وسوسہ میں ڈالتا ہے، چنانچہ بعض روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ نجم پڑھتے تھے اور بعض آیات کے بعد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا تو شیطان نے کچھ عبارت خود بنا کر پڑھ دی کہ اس سے بعض سامعین مشرکین کا شبہ قوی ہوگیا، اور یہ روایت اوپر ایک مقام میں مفصل مذکور ہوئی ہے، تو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ حیات میں شیطان نے ایسا کیا تو خواب میں ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟ اسی وجہ سے شریعت میں ان احکام کا اعتبار نہیں جو خواب میں معلوم ہوں، اور خواب کی بات حدیث نہیں شمار کی جاتی۔ اور اگر کاش کوئی بدعتی کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں حکم فرمایا ہے اور وہ حکم خلافِ شرع ہو تو اس بدعتی کے قول پر اعتبار نہ کیا جائے گا، واللہ اعلم!''

(فتاویٰ عزیزی ج:۱ ص:۲۸۵ تا ۲۸۷)

فہرست

گزشتہ دنوں قادیانیوں کے نئے سربراہ مرزا طاہر احمد صاحب کی ''خلافت'' کی تائید میں قادیانی اخبار ''الفضل ربوہ'' میں آسمانی بشارات کے عنوان سے بعض چیزیں شائع کی گئیں، ان میں سے ایک کا تعلق خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے ہے، اس لئے اس کا اقتباس بلفظہٖ درج ذیل ہے:

''دیکھا کہ مسجد مبارک (ربوہ) میں داخل ہو رہا ہوں، ہر طرف چاندنی ہی چاندنی ہے، جتنی تیزی سے ورد کرتا ہوں سرور بڑھتا جاتا ہے اور چاندنی واضح ہوتی جاتی ہے۔ محراب میں حضرت

بابا گرونانک رحمۃ اللہ علیہ جیسی بزرگ شبیہ کی صورت میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گردنور کا ہالہ اس قدر تیز ہے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں، باوجود کوشش کے شبیہ مبارک پر نظر نہیں ٹکتی۔" (الفضل ربوہ ۶/نومبر ۱۹۸۲ء)

علم تعبیر کی رو سے اس خواب کی تعبیر بالکل واضح ہے، صاحبِ خواب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سکھوں کے پیشوا کی شکل میں نظر آنا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا دین و مذہب - جسے وہ غلط فہمی سے "اسلام" سمجھتے ہیں - دراصل سکھ مذہب کی شبیہ ہے، اور ان کے روحانی پیشوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بروز نہیں، بلکہ سکھوں کے پیشوا بابا نانک کے بروز ہیں۔

اور صاحبِ خواب کو انوارات کا نظر آنا جس کی وجہ سے وہ خواب کی اصل مراد کو نہیں پہنچ سکے، شیطان کی وہی تلبیس ہے جس کا تذکرہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے، اور ان انوارات میں یہ اشارہ تھا کہ ان کے پیشوا نے بابا نانک کا بروز ہونے کے باوجود تلبیس و تدلیس کے ذریعہ اپنے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی طرح بہت سے حقیقت ناشناس لوگوں نے دھوکا کھایا۔

چونکہ خواب کی یہ تعبیر بالکل واضح تھی اسی لئے صاحبِ خواب کو مرزا بشیر احمد صاحب اور مرزا ناصر احمد صاحب نے خواب کے اظہار سے منع کیا، چنانچہ صاحبِ خواب لکھتے ہیں:

"پھر (مرزا بشیر احمد صاحب نے) فرمایا: کسی سے خواب بیان نہیں کرنی، خلافتِ ثالثہ کا انتخاب ہوا تو پھر یہ نظارہ لکھ کر (مرزا ناصر احمد صاحب کی خدمت میں) بھجوادیا۔ حضرت مولانا جلال الدین شمس صاحب کے ذریعہ پیغام ملا کہ حضور (یعنی مرزا ناصر احمد صاحب) فرماتے ہیں کہ: خواب آگے نہیں بیان کرنی۔"

(مرزا عبدالرشید وکالت تبشیر ربوہ)

مناسب ہے کہ اس خواب کی تائید میں بعض دیگر اکابر کے خواب وکشوف بھی ذکر کردیئے جائیں۔

۱:......مولانا محمد لدھیانوی مرحوم ''فتاویٰ قادریہ'' میں لکھتے ہیں:

''مولانا صاحب (مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ، صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند) نے حسبِ وعدہ کے ایک فتویٰ اپنے ہاتھ سے لکھ کر ہمارے پاس ڈاک میں ارسال فرمایا، جس کا مضمون یہ تھا کہ یہ شخص میری دانست میں غیرمقلد معلوم ہوتا ہے، اور اس کے الہامات اولیاء اللہ کے الہامات سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے اور نیز اس شخص نے کسی اہل اللہ کی صحبت میں رہ کر فیضِ باطنی حاصل نہیں کیا، معلوم نہیں کہ اس کو کس روح کی اویسیت ہے۔''

(فتاویٰ قادریہ ص:۱۷)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہٗ نے تو اس سے لاعلمی کا اظہار فرمایا کہ مرزا صاحب کو کس روح سے ''فیض'' پہنچا ہے، مگر الفضل میں ذکر کردہ خواب سے یہ عقدہ حل ہوجاتا ہے کہ مرزا صاحب کو سکھوں کے مذہبی پیشوا سے روحانی ارتباط تھا، مرزا صاحب نے جو کچھ لیا ہے انہی سے لیا ہے۔

۲:......''مرزا غلام احمد قادیانی نے شہر لودیانہ میں آکر ۱۳۰۱ھ میں دعویٰ کیا کہ میں مجدد ہوں۔ عباس علی صوفی اور منشی احمد جان مع مریدان اور مولوی محمد حسن مع اپنے گروہ اور مولوی شاہدین اور عبدالقادر اور مولوی انور محمد مہتمم مدرسہ حقانی وغیرہ نے اس کے دعویٰ کو تسلیم کرکے امداد پر کمر باندھی۔ منشی احمد جان نے مع مولوی شاہدین و عبدالقادر ایک مجمع میں جو واسطے اہتمام مدرسہ اسلامیہ کے اوپر مکان شاہزادہ صفدر جنگ صاحب کے تھا، بیان کیا کہ علی الصباح مرزا غلام احمد قادیانی صاحب اس شہر لودیانہ میں تشریف لائیں گے،

اوراس کی تعریف میں نہایت مبالغہ کرکے کہا کہ جو شخص اس پر ایمان لائے گا گویا وہ اول مسلمان ہوگا۔

مولوی عبداللہ صاحب مرحوم برادرم نے بعد کمال بردباری اور تحمل کے فرمایا:

اگرچہ اہل مجلس کو میرا بیان کرنا ناگوار معلوم ہوگا لیکن جو بات خدا جل شانہ نے اس وقت میرے دل میں ڈالی ہے، بیان کئے بغیر میری طبیعت کا اضطرار دور نہیں ہوتا، وہ بات یہ ہے کہ مرزا قادیانی جس کی تم تعریف کررہے ہو بے دین ہے۔

منشی احمد جان بولا کہ: میں اول کہتا تھا کہ اس پر کوئی عالم یا صوفی حسد کرے گا۔

راقم الحروف (مولانا محمد عبدالقادر لودیانویؒ) نے مولوی عبداللہ صاحب کو بعد برخاست ہونے جلسہ کے کہا کہ جب تک کوئی دلیل معلوم نہ ہو بلاتأمل کسی کے حق میں زبان طعن کی کھولنی مناسب نہیں، مولوی عبداللہ صاحب نے فرمایا کہ: اس وقت میں نے اپنی طبیعت کو بہت روکا لیکن آخرالامر یہ کلام خدا جل شانہ نے جو میرے سے اس موقع پر سرزد کرایا ہے، خالی از الہام نہیں!

اس روز مولوی عبداللہ صاحب بہت پریشان خاطر رہے، بلکہ شام کو کھانا بھی تناول نہیں کیا، بوقتِ شب دو شخصوں سے استخارہ کروایا اور آپ بھی اسی فکر میں سوگئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ میں ایک مکان بلند پر مع مولوی محمد صاحب و خواجہ احسن شاہ صاحب بیٹھا ہوں، تین آدمی دور سے دھوتی باندھے ہوئے چلے آتے معلوم ہوئے، جب نزدیک پہنچے تو ایک شخص جو آگے آگے آتا تھا اس نے دھوتی کو کھول کر تہبند کی طرح باندھ لیا، خواب ہی میں غیب سے آواز

آئی کہ مرزا غلام احمد قادیانی یہی ہے۔ اسی وقت سے بیدار ہوگئے اور دل کی پراگندگی یک لخت دور ہوگئی اور یقینِ کُلّی حاصل ہوا کہ یہ شخص پیرایۂ اسلام میں لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ موافق تعبیر خواب کے دوسرے دن قادیانی مع دو ہندوؤں کے لودھیانہ میں آیا۔ (اس خواب میں بھی یہی اشارہ تھا کہ یہ صاحب ہندومت کو اسلام کا لبادہ اوڑھا رہے ہیں۔ ناقل)۔'' (فتاویٰ قادریہ ص:۲)

۳،۴:...... مولانا عبداللہ لدھیانویؒ کے ساتھ جن دو شخصوں نے استخارہ کیا تھا، ان کے بارے میں مولانا محمد صاحبؒ لکھتے ہیں:

''استخارہ کنندگان میں سے ایک کو معلوم ہوا کہ یہ شخص بے علم ہے، اور دوسرے شخص نے خواب میں مرزا کو اس طرح دیکھا کہ ایک عورت برہنہ تن کو اپنی گود میں لے کر اس کے بدن پر ہاتھ پھیر رہا ہے، جس کی تعبیر یہ ہے کہ مرزا دنیا کو جمع کرنے کے درپے ہے، دین کی کوئی پروا نہیں۔'' (حوالہ بالا)

۵:...... اسی فتاویٰ قادریہ میں ہے کہ:

''شاہ عبدالرحیم صاحب سہارنپوری مرحوم نے (جو صاحبِ کشف و کرامت بزرگ تھے) بروقتِ ملاقات فرمایا کہ: مجھ کو بعد استخارہ کرنے کے یہ معلوم ہوا کہ یہ شخص بھینسے پر اس طرح سوار ہے کہ منہ اس کا دم کی طرف ہے۔ جب غور سے دیکھا تو زنار اس کے گلے میں پڑا ہوا نظر آیا، جس سے اس شخص کا بے دین ہونا ظاہر ہے، اور یہ بھی میں یقیناً کہتا ہوں کہ جو اہلِ علم اس کی تکفیر میں اب متردد ہیں کچھ عرصہ بعد سب کافر کہیں گے۔ (زنار بھی بطورِ خاص کسی کے ہندو ہونے کی علامت ہے، اس سے الفضل میں درج شدہ خواب کی تائید ہوتی ہے کہ یہ صاحب ہندوؤں سے مستفید ہیں۔ ناقل)۔'' (حوالہ بالا)

۶:......مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی ''شہادۃ القرآن'' میں (جو ۱۳۲۱ھ میں مرزا صاحب کی زندگی میں شائع ہوئی) لکھتے ہیں:

''جب اس فرقہ مبتدعہ مرزائی کو کوئی پچھلی تفسیر بتائیں تو کفار کی طرح ''اساطیر الاولین'' کہہ کر جھٹ انکار کردیتے ہیں، اور اگر ان کے روبرو حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھیں تو اسے بوجہ بے علمی کے مخالف ومعارضِ قرآن بناکر دور پھینک دیتے ہیں، اور اپنی تفسیر بالرائے کو جو حقیقت میں تحریف وتأویل منہی عنہ ہوتی ہے مؤید بالقرآن کہتے ہیں (ظاہر ہے یہ طرزِ عمل کسی مسلمان کا نہیں ہوسکتا۔ ناقل)، بیچارے کم علم لوگ اس سے دھوکا کھاجاتے ہیں اور ورطۂ تردّدات وگردابِ شبہات میں گھر جاتے ہیں، سو ایسے شبہات کے وقت میں اللہ عزیز وحکیم نے مجھ عاجز کو محض اپنے فضل وکرم سے راہِ حق کی ہدایت کی اور ہر طرح سے ظاہراً وباطناً معقولاً ومنقولاً مسئلہ حقہ سمجھایا۔ چنانچہ عنفوانِ شباب میں ۱۸۹۱ء میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زیارت بابرکت سے مشرف ہوا، اس طرح کہ آپ ایک گاڑی پر سوار ہیں اور بندہ اس کو آگے سے کھینچ رہا ہے، اس حالتِ باسعادت میں آپ سے قادیانی علیہ ما علیہ کی نسبت عرض کی، آپ نے زبانِ وحی ترجمان سے بالفاظِ طیبہ یوں فرمایا کہ: کوئی خطرے کی بات نہیں! اللہ تعالیٰ اس کو جلدی ہلاک کردے گا۔''

(شہادۃ القرآن طبع اول ص:۴)

مذہب اور سائنس میں فرق

س......مولانا صاحب! گزارش یہ ہے کہ جو طلبہ سائنس پڑھتے ہیں ان کی نظر میں مذہب کے بارے میں عجیب کشمکش پیدا ہوجاتی ہے، اگر وہ سائنس کو مانتے ہیں تو مذہب کو جھٹلا بھی نہیں سکتے، لیکن سائنس میں بعض ایسے مظاہر ہیں جو ایک شش وپنج کی کیفیت میں مبتلا

کردیتے ہیں۔ اب ہم سائنس میں سب سے پہلے نظریۂ ارتقا کو لیتے ہیں کہ انسان نے بندروں اور بن مانسوں سے ترقی پائی ہے، لیکن قرآنِ کریم میں ارشاد ہے کہ پہلے خدا نے انسان کا مٹی کا بت بنایا، پھر جان ڈالی اور حوا کو آدم کی پسلی سے پیدا کیا، جبکہ سائنس کہتی ہے کہ جب سے آدم بنا ہے تو حوا اس کے ساتھ ہے بلکہ اسی نے اس کو جنم دیا ہے، اور آدم کو بہشت سے زمین پر نہیں اُتارا گیا، بلکہ اسے پیدا ہی زمین پر کیا گیا ہے۔ اس سے سوال یہ اُبھرتا ہے کہ کیا نعوذ باللہ بندر اور بن مانس یا دُوسرے جانور بھی جنت یا دوزخ میں جائیں گے؟ کیونکہ سائنس کے مطابق ان کی جان بھی تو ہماری جیسی ہے۔

ایک حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ رات کو سورج اللہ تعالیٰ کے پاس سجدے میں گرجاتا ہے، اور صبح کو اسے مشرق کی طرف سے نکلنے کا حکم ہوتا ہے، لیکن ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ رات کو سورج امریکہ میں ہوتا ہے، یعنی زمین کی دُوسری طرف۔

ایک حدیثِ مبارکہ میں آیا ہے کہ ستارے آسمان کی چھت کے ساتھ رسوں سے باندھے گئے ہیں، قبلہ! اگر خلا میں جاکر دیکھا جائے تو زمین بھی چاند کی طرح آسمان پر نظر آتی ہے، یعنی ہر طرف آسمان ہی آسمان نظر آتا ہے۔ اور سائنس دان کہتے ہیں کہ کوئی چھت نہیں۔ یہ سب باتیں شک میں مبتلا کردیتی ہیں۔

اور ''جن'' کے بارے میں یہ عرض ہے کہ کیا ''جن'' صرف ''جنوں'' کو ماننے والوں ہی کو کیوں پڑتے ہیں؟ انگریز اور رُوسی وغیرہ جو کہ شراب اور دُوسری چیزیں جو کہ انسان کے لئے ناپاک سمجھی جاتی ہیں، استعمال کرتے ہین، لیکن ان کو ''جن'' نہیں پڑتے۔ کیا یہ تمام خیالات ایک انسان کے دماغ کو منجمد نہیں کردیتے اور وہ بلاوجہ خوف و ہراس کی کیفیت میں رہتا ہے؟ کیا مذہب اور سائنس ایک ساتھ چل سکتے ہیں؟ اگر آپ نے جواب نہ دیا تو میں سمجھوں گا کہ آپ بھی شک میں پڑ گئے ہیں۔

ج...... آپ کا خط تفصیلی جواب کا متقاضی ہے، جبکہ میں فرصت سے محروم ہوں، تاہم اشارات کی زبان میں مختصراً عرض کرتا ہوں۔ پہلے چند اُصول ذہن نشین کرلیجئے:

۱:...... سائنس کی بنیاد مشاہدہ و تجربہ پر ہے، اور جو چیزیں مشاہدہ یا تجربہ سے

ماورا ہیں وہ سائنس کی دسترس سے باہر ہیں، ان کے بارے میں سائنس دانوں کا کوئی دعویٰ لائقِ التفات نہیں، جبکہ وحی اور نبوّت کا موضوع ہی وہ چیزیں ہیں جو انسانی عقل، تجربہ اور مشاہدہ سے بالاتر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اُمور میں وحی کی اطلاع قابلِ اعتبار ہوگی۔

۲:...... بہت سی چیزیں ہمارے مشاہدے سے تعلق رکھتی ہیں مگر ان کے مخفی علل و اسباب کا مشاہدہ ہم نہیں کرسکتے بلکہ ان کے علم کے لئے ہم کسی صحیح ذریعۂ علم کے محتاج ہوتے ہیں، ایسے اُمور کا محض اس بنا پر انکار کردینا حماقت ہے کہ یہ چیزیں ہمیں نظر نہیں آرہیں۔

۳:...... دو چیزیں اگر آپس میں اس طرح ٹکراتی ہوں کہ دونوں کو بیک وقت تسلیم کرنا ممکن نہ ہو تو یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ دونوں صحیح ہوں، لامحالہ ایک صحیح ہوگی اور ایک غلط ہوگی۔ ان میں سے کون صحیح ہے اور کون غلط ہے؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کس کا ثبوت یقینی و قطعی ذریعہ سے ہوا ہے؟ اور کس کا ظن و تخمین کے ذریعہ؟ پس جس چیز کا ثبوت کسی یقینی ذریعہ سے ہو وہ حق ہے اور دُوسری باطل یا مؤوّل۔

۴:...... جو بات اپنی ذات کے اعتبار سے ممکن ہو اور کسی سچے خبر دینے والے نے اس کی خبر دی ہو، اس کو تسلیم کرنا لازم ہے، اور اس کا انکار کرنا محض ضد و تعصب اور ہٹ دھرمی ہے، جو کسی عاقل کے شایانِ شان نہیں۔

۵:...... انسانی عقل پر اکثر و بیشتر وہم کا تسلط رہتا ہے، بہت سی چیزیں جو قطعاً صحیح اور بے غبار ہیں، لوگ غلبۂ وہم کی بنا پر ان کو خلافِ عقل تصوّر کرنے لگتے ہیں، اور بہت سی چیزیں جو عقلِ صحیح کے خلاف ہیں، غلبۂ وہم کی وجہ سے لوگ ان کو نہ صرف صحیح مان لیتے ہیں بلکہ ان کو مطابقِ عقل منوانے پر اصرار کرتے ہیں۔

یہ پانچ اُصول بالکل فطری ہیں، ان کو اچھی طرح سمجھ لیجئے، ان میں سے اگر کسی نکتے میں آپ کو اختلاف ہو تو اس کی تشریح کردُوں گا۔ اب میں ان اُصول کی روشنی میں آپ کے سوالات پر غور کرتا ہوں۔

نظریۂ ارتقا

مسٹر ڈاروِن کا نظریۂ ارتقا تو اَب خود سائنسی دُنیا میں دَم توڑ رہا ہے اور سائنس

فہرست

دانوں میں بدنام ہو چکا ہے، لیکن آپ اسے قرآنی وحی کے مقابلے میں پیش کر کے شبہ کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ سوال کہ انسان کی آفرینش کا آغاز کیسے ہوا؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے اور کسی اندازے اور تخمینے کی بنا پر اس بارے میں کوئی دوٹوک بات نہیں کہی جاسکتی۔ موجودہ دور کا انسان نہ تو ابتدائے آفرینش کے وقت خود موجود تھا کہ وہ جو کچھ کہتا چشمِ دیدہ مشاہدہ کی بنا پر کہتا، نہ یہ ایسی چیز ہے کہ انسانی تجربے نے اس کی تصدیق کی ہو، ورنہ ہزاروں برس میں کسی ایک بندر کو انسان بنتے ہوئے ضرور دیکھا ہوتا، یا کسی ایک بندر کو انسان بنا دینے کا اس نے تجربہ ضرور کیا ہوتا۔ پس جب یہ نظریہ مشاہدہ اور تجربہ دونوں سے محروم ہے تو اس کی بنیاد اَٹکل پچو تخمینوں، اندازوں اور وہم کی کرشمہ سازیوں پر ہی قائم ہوگی۔ اس کے مقابلے میں خود خالقِ کائنات کا قطعی، غیر مبہم اور دوٹوک ارشاد ہے جسے آپ نے سوال میں نقل کیا ہے۔ اب دادِ انصاف دیجئے کہ ایک مسئلے میں، جو انسانی مشاہدہ و تجربہ سے ماورا ہے، مسٹر ڈارون اور ان کے مقلدوں کا اَٹکل پچو تخمینہ لائقِ اعتبار ہے یا خدائے علام الغیوب کا ارشاد...؟ اگر وحیٔ الٰہی نے اس مسئلے میں ہماری کوئی راہ نمائی نہیں کی ہوتی تب بھی عقل کا تقاضا یہ تھا کہ ہم ڈارون کے غیر مشاہداتی اور غیر تجرباتی تیر تکوں کو قبول نہ کرتے، کیونکہ اہلِ عقل، عقل کی مانا کرتے ہیں، غیر عقلی قیاسات اور تخمینوں پر اندھا دُھند ایمان نہیں لایا کرتے۔ پس نظریۂ ارتقا کے حامیوں کا انسان کے سلسلۂ نسب کو بندر سے ملانا، جبکہ وحیٔ الٰہی اور مشاہدہ و تجربہ اس کی تکذیب کرتے ہیں، تو یہ نظریہ اہلِ عقل کے نزدیک کیسے لائقِ التفات ہوسکتا ہے؟

حضرت آدمؑ اور جنت

نظریۂ ارتقا کے موجدوں نے انسان کا سلسلۂ نسب بندر تک پہنچا کر انسانی عقل کی جو مٹی پلید کی ہے، اسی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ انسانِ اوّل کے بارے میں ان کے دیگر تخمینوں اور قیاسات میں کتنی جان ہوگی، خصوصاً ان کا یہ کہنا کہ: ''انسانِ اوّل کو جنت سے نہیں اُتارا گیا تھا، بلکہ اسی زمین پر بندر سے اس کی جنس تبدیل ہوئی تھی''، یا یہ کہ: ''حوا اس کی بیوی نہیں بلکہ ماں تھی''۔ کون نہیں جانتا کہ جنت و دوزخ عالمِ غیب کے وہ حقائق ہیں جو

اس عالم میں انسانی مشاہدہ و تجربہ سے بالاتر ہیں، اور جن کے بارے میں صحیح معلومات کا ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ ہے انبیائے کرام علیہم السلام پر نازل شدہ وحی۔ پس جو غیبی حقائق کہ انسان کے مشاہدہ و تجربہ کی دسترس سے قطعاً باہر ہیں اور مشاہدہ کی کوئی خوردبین ان تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی، خود ہی سوچئے کہ ان کے بارے میں وحیٔ الٰہی پر اعتماد کرنا چاہئے یا ان لوگوں کی لاف گزاف پر جو وہم و قیاس کے گھوڑے پر سوار ہوکر ایک ایسے میدان میں ترکتازیاں کرنا چاہتے ہیں جو ان کے احاطۂ عقل و ادراک سے ماوراء ہے...؟ سائنس کے دقیق اسرار و رموز کے بارے میں ایک گھسیارے کا قول جس قدر مضحکہ خیز ہوسکتا ہے، اس سے کہیں بڑھ کر ان لوگوں کے اندازے اور تخمینے مضحکہ خیز ہیں جو وحیٔ الٰہی کی روشنی کے بغیر اُمورِ الٰہیہ میں تگ و تاز کرتے ہیں۔ یہ مسکین نہیں سمجھتے کہ ان کی تحقیقات کا دائرہ مادّیات ہیں، نہ کہ مابعد الطبعیات، جو چیز ان کے دائرۂ عقل و ادراک سے ماوراء ہے اس کے بارے میں وہ جو قیاس آرائی کریں گے اس کی حیثیت رجم بالغیب اور اندھیرے میں تیر چلانے کی ہوگی۔ قطعاً ممکن نہیں کہ ان کا تیر صحیح نشانے پر بیٹھے، وہ خود بھی مدۃ العمر وادیٔ ضلالت کے گم گشتہ مسافر رہیں گے اور ان کے مقلدین بھی۔ مسلمانوں کو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے اور ان وادیوں میں بھٹکنے کی ضرورت نہیں، بحمداللہ ان کے پاس آفتابِ نبوّت کی روشنی موجود ہے، اور وہ ان اُمورِ الٰہیہ کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں، دن کی روشنی میں کہتے ہیں۔

سورج کا سجدہ کرنا

سورج کے سجدہ کرنے کی جو حدیث آپ نے نقل کی ہے، وہ صحیح ہے، اور وہ کسی سائنسی تحقیقات یا عام انسانی مشاہدے کے خلاف نہیں۔ انسانی مشاہدہ یہ ہے کہ سورج چلتا ہے، لیکن اس کی رفتار خود اس کی ذاتی ہے یا کسی قادرِ مطلق ہستی کی حکمت و مشیت کے تابع ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب اس حدیثِ پاک میں دیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ آفتاب کے طلوع و غروب کا نظام خودکار مشین کی طرح نہیں، بلکہ حق تعالیٰ کی مشیت و ارادہ کے ماتحت ہے، اور وہ اپنے طلوع و غروب کے لئے حق تعالیٰ شانہ سے اجازت لیتا ہے،

ایک وقت آئے گا کہ حسبِ دستور طلوع کی اجازت لے گا، مگر اس کو اجازت نہیں ملے گی، بلکہ اُلٹی سمت چلنے کا حکم ہوگا، چنانچہ اس دن آفتاب بجائے مشرق کے مغرب سے طلوع ہوگا اور قریباً چاشت کے وقت جتنا اُونچا ہوجانے کے بعد پھر مغرب کی جانب لوٹ جائے گا اور اس کے بعد قیامت برپا ہونے تک پھر حسبِ معمول طلوع وغروب ہوتا رہے گا۔

اب یہاں چند اُمور لائقِ توجہ ہیں:

اوّل:...... یہ کہ نظامِ شمسی کا حق تعالیٰ شانہ کی مشیت کے تابع ہونا تمام ادیان و مذاہب کا مُسلَّمہ عقیدہ ہے، اور جو سائنس دان خدا تعالیٰ کے وجود کا اقرار کرتے ہیں انہیں بھی اس عقیدے سے انکار نہیں ہوگا۔ جو لوگ اس کارخانۂ جہان کو خودکار مشین سمجھتے ہیں اور اسے کسی صانع حکیم کی تخلیق نہیں سمجھتے، ان کا نظریہ عقل و حکمت کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ صانعِ عالم کے وجود پر دلائل کا یہ موقع نہیں کیونکہ میرا مخاطب بحمداللہ مسلمان ہے، اس لئے اس کے سامنے وجودِ باری کی بحث لے بیٹھنا غیرضروری ہی نہیں، بے موقع بھی ہے۔ یہاں صرف اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ جب یہ مُسلَّم ہے کہ نہ صرف نظامِ شمسی بلکہ پورا کارخانۂ عالم ہی اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ کے تابع ہے تو آفتاب کے روزمرّہ طلوع و غروب کو بھی اسی مشیت کے تابع تسلیم کرنا ہوگا۔ اسی نکتے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج کے روزمرّہ سجدہ کرنے اور آئندہ دن میں طلوع کی اجازت لینے سے تعبیر فرمایا ہے۔

دوم:...... جیسا کہ سوال میں ذکر کیا گیا ہے، مشاہدہ یہ ہے کہ ہر آن اور ہر لمحہ سورج کے طلوع وغروب کا عمل جاری ہے، اگر ایک اُفق پر ڈُوبتا ہے تو دُوسرے سے نکلتا ہے، اگر ایک جگہ سفیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے تو دُوسری جگہ تاریکیٔ شب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لئے حدیثِ پاک میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاص اُفق (مثلاً مدینہ طیبہ کا اُفق، یا عام آبادی کا اُفق) کو مراد لیا ہو۔ اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ جب آفتاب اس خاص اُفق میں غروب ہوتا ہے تو اگلے دن کے طلوع کے لئے اجازت طلب کرتا ہے، اور اجازت ملنے پر طلوع ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اہلِ ریاضی نے ہفتہ کے دنوں کی تعیین کے لئے آفتاب کا ایک خاص اُفق مقرّر کر رکھا ہے جسے

فہرست

’’ڈیٹ لائن‘‘ کہا جاتا ہے۔ اس خطِ فاصل سے اس طرف جمعہ کا دن ہوتا ہے تو دُوسری طرف ہفتہ کا دن، اگر یہ صورت اختیار نہ کی جاتی تو دنوں کا تعین ہی ممکن نہ ہوتا، کیونکہ آفتاب تو دُنیا میں کبھی غروب ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے ’’ڈیٹ لائن‘‘ کے بغیر تاریخ اور دن کے تعین کی کوئی صورت نہیں تھی۔ پس جس طرح اہلِ فن کو دنوں کی تعیین کے لئے ایک خاص اُفق مقرّر کئے بغیر کوئی چارہ نہیں، اسی طرح اگر اس کے طلوع و غروب کے لئے بھی علمِ الٰہی میں اُفق کا کوئی خاص نقطہ متعین ہو جس پر پہنچنے کے بعد اسے اگلے دن کے لئے نئی اجازت لینی پڑے تو اس پر کوئی عقلی اِشکال نہیں۔

دُوسرا احتمال یہ ہے کہ اس اجازتِ طلوع کے لئے کوئی خاص اُفق متعین نہ کیا جائے، بلکہ یہ کہا جائے کہ اس کا کسی بھی اُفق سے طلوع ہونا اجازت کے بعد ہوتا ہے، اور چونکہ اس کا طلوع ہر لمحہ کسی نہ کسی اُفق سے ہوتا رہتا ہے اس لئے حدیثِ پاک کا منشا یہ ہوگا کہ آفتاب کی حرکت کا ایک ایک لمحہ خدا تعالیٰ کی اجازت و مشیت کا مرہونِ منّت ہے اور ایک لمحے کے لئے بھی اس کی حرکت (جس پر طلوع و غروب کا نظام قائم ہے) اجازت کے بغیر جاری نہیں رہ سکتی۔

سوم:...... رہا سورج کا سجدہ کرنا، سو یہ چیز اگرچہ ہم ایسے عامیوں کے لئے اچھوتی اور اچنبھا معلوم ہوتی ہے لیکن اہلِ عقل جانتے ہیں کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہے اور ہر چیز اس کی عظمت و تقدس کی تسبیح پڑھتی ہے۔ لیکن ہر چیز کی سجدہ ریزی و تسبیح خوانی اس کی حالت و فطرت اور شان کے مطابق الگ نوعیت کی ہے، ہم لوگ چونکہ ان کی ’’زبانِ بے زبانی‘‘ سمجھنے سے قاصر ہیں، اس لئے ہمیں یہ بات ایک اعجوبہ معلوم ہوتی ہے، اسی کی طرف قرآنِ کریم میں یہ کہہ کر اشارہ فرمایا گیا ہے: ’’وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ‘‘ (مگر تم ان چیزوں کی تسبیح کو نہیں سمجھتے)۔ ہم لوگ جو عقل و ادراک اور شعور و فہم کا ایک عام درجہ رکھتے ہیں، یہ کہہ کر دِل کو سمجھا لیتے ہیں کہ کائنات کی ہر چیز خدا تعالیٰ کے قبضہ و تصرف میں مسخر ہے، اور ان کا مسخر ہونا ہی ان کا سجدہ و تسبیح ہے۔ لیکن جو حضرات علم و ادراک اور عقل و فہم میں عام انسانوں سے بالاتر ہیں، ان کا کہنا ہے کہ کائنات صرف زبانِ حال ہی سے خدا

فہرست

تعالیٰ کی تسبیح خوانی اور اس کے سامنے سجدہ ریزی کے فرائض انجام نہیں دیتی بلکہ ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے اس کے حسبِ حال شعور و ادراک کی نعمت عطا کر رکھی ہے، اور ہر ایک کو اس کے مناسب زبانِ گویائی بھی عطا فرمائی ہے، اس لئے ہر چیز اپنے اپنے شعور و ادراک کے مطابق خدا تعالیٰ کو سجدہ کرتی ہے اور اپنی اپنی زبان میں اس کی تسبیح پڑھتی ہے:

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند

بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

بہرحال! آفتاب کا حق تعالیٰ کو سجدہ کرنا بلاشبہ حق اور صحیح ہے، خود قرآنِ کریم میں اس کی تصریح موجود ہے، اب وہ سجدہ زبانِ حال سے ہے یا زبانِ مقال سے؟ اس کی توجیہ ہر شخص اپنے اندازۂ عقل و پیمانۂ فکر کے مطابق کرسکتا ہے۔ اور اگر کسی کی عقل اس کو محض اس لئے نہ مانتی ہو کہ یہ اعجوبہ ہے، تو اس سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دُنیا عجائبِ قدرت ہی کا نام ہے۔

یہ آتشیں کرہ، جسے ہم آفتاب کہتے ہیں، اس کا وجود بجائے خود عجائبِ قدرت کا ایک نمونہ ہے، اور پھر اس کے طلوع و غروب کا نظام ایک مستقل اعجوبہ ہے، اگر خدانخواستہ سورج کبھی ایک آدھ بار ہی طلوع ہوا ہوتا تو دُنیا اس اعجوبہ کے مشاہدہ کی بھی شاید تاب نہ رکھتی، پس جب دُنیا میں ہزاروں اعجوبے ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں اور ہم بغیر کسی ہچکچاہٹ اور شرمندگی کے ان عجائبات پر یقین رکھتے ہیں اور محض ان کا اعجوبہ ہونا ہمارے انکار کے لئے وجۂ جواز نہیں بنتا، اور اس کے انکار کرنے والے کے حق میں دیوانہ اور پاگل ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ جو چیز ہمارے مشاہدہ و تجربہ، ہمارے علم و ادراک اور ہماری عقل و شعور سے بالاتر ہو اور ایک شناسائے راز اور دانائے رموز ہمیں اس کی اطلاع دے، ہم محض اعجوبہ ہونے کی بنا پر اس کا انکار کر ڈالیں، کیا موجودہ دور کی سائنسی ایجادات ایک عام عقل و فہم کے آدمی کے لئے کم اعجوبہ ہیں...؟ کیا ایک سادہ لوح آدمی کے لئے ان کا انکار کردینا محض اس بنا پر جائز ہوگا کہ اس کی عقل ان عجائب کی گرفت سے قاصر ہے...؟ نہیں...! بلکہ جو شخص اس کی جرأت کرے گا آپ اسے انتہائی درجے کا احمق قرار دیں گے۔ ٹھیک اسی طرح جو لوگ ان عجائباتِ قدرت کا انکار کرتے ہیں جو صرف نبوّت کے علم و

ادراک میں آسکتے ہیں، یہ لوگ بھی اپنی عقل کی پستی کا اظہار کرتے ہیں۔

چہارم:...... آفتاب کا طلوع وغروب کے لئے اجازت لینا، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی حرکت میں ٹھہراؤ پیدا ہوجائے، بلکہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع ہوسکتی ہیں کہ اس کی حرکت بھی جاری رہے اور وہ اپنی حرکت جاری رکھنے یا بند کردینے کے لئے اجازت بھی لیتا ہو۔ ہماری جدید دُنیا میں اس کی بہت سی مشاہداتی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، مگر میں اس نکتے کی مزید وضاحت وتشریح ضروری نہیں سمجھتا، اہلِ فہم کے لئے صرف اشارہ کافی ہے۔

ایک حدیث کا حوالہ

آپ نے ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے کہ: ''ستارے آسمان کی چھت کے ساتھ رسوں سے باندھے گئے ہیں''۔ مجھے ایسی کوئی حدیث یاد نہیں جس کا یہ مضمون ہو، اگر آپ اس کا حوالہ دے سکیں تو اس کے الفاظ ومفہوم ومطالب کے بارے میں کچھ عرض کیا جاسکتا ہے۔ قرآنِ کریم میں دوجگہ (الاعراف:۵۴، النحل:۱۲) ستاروں کو ''مُسَخَّرَات بِأَمْرِہٖ'' فرمایا گیا ہے، یعنی ستارے حکمِ خداوندی کے مسخر ہیں۔ ان کا فضا میں معلق ہونا اسی تسخیر کا ایک مظہر ہے، یہی وہ رسے ہیں جن سے یہ فضائی کرّے بندھے ہوئے ہیں، اور جب اس کائنات کو درہم برہم کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا تو ان کے یہ رسے کھول دیئے جائیں گے اور ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر جھڑ جائیں گے، ان کا آپس میں تصادم قیامتِ کبریٰ کا پیش خیمہ ہوگا۔ پس اگر کسی حدیث میں ستاروں کے رسوں سے بندھے ہوئے ہونے کا ذکر آتا ہے تو اس سے ارادۂ الٰہی کی یہی آہنی زنجیریں مراد ہیں جنھوں نے فضا میں ان محیر العقول ستاروں کو تھام رکھا ہے، مادّی رسوں کی تلاش کی زحمت کیوں اُٹھائی جائے؟ اور اگر سائنس ان خلائی کروں کے استقرار واستحکام کے لئے کششِ ثقل کا کوئی اُصول پیش کرتی ہے تو ہمیں اسے جھٹلانے کی ضرورت نہیں۔ ظاہر بیں نگاہیں تحریر کو دستِ کاتب کی حرکت کا کرشمہ دیکھتی ہیں لیکن ہاتھ کی حرکت دماغ کی ارتعاشی لہروں کے تابع ہے اور دماغ، رُوح کی حس و حرکت کے تابع ہے، اور رُوح کی رُوح ارادۂ خداوندی ہے۔ اسی طرح ان خلائی سیاروں

کے لئے سائنسی دُنیا میں جو اُصول ونظریات پیش کئے جاتے ہیں وہ اس کی اپنی حدِ پرواز تک صحیح ہیں، اسلام ان کی نفی نہیں کرتا، بلکہ ان اُصولوں میں ارادۂ الٰہی کی کارفرمائی کا عقیدہ پیش کرتا ہے، اور اگر کوئی سائنس دان سلسلۂ اسباب وعلل کی کڑیوں کو درمیان میں ختم کردینے پر اصرار کرتا ہے تو یہ اس کی بصیرت ومشاہدہ کا قصور ہے۔

جنات کے بارے

جنات کے بارے میں دو باتیں قابلِ ذکر ہیں، ایک یہ کہ آیا جنات کا وجود ہے یا نہیں؟ دوم یہ کہ جنات آدمی کو کوئی تکلیف پہنچا سکتے ہیں یا نہیں؟ جس کو عرفِ عام میں ''جن لگنا'' کہا جاتا ہے۔

جہاں تک جنات کے وجود کا تعلق ہے، قرآنِ کریم میں جنات کا ذکر (''جن'' یا ''جان'' کے عنوان سے) ۲۹ جگہ آیا ہے، اور ''سورۃ الجن'' کے نام سے قرآنِ کریم کی ایک مستقل سورت ہے۔ سورۃ الانعام آیت:۱۲۸ میں صرف جنوں کو اور سورۃ الانعام آیت:۱۳۰، اور سورۃ الرحمٰن آیت:۳۳ میں ''یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ'' کہہ کر ''جن'' اور ''انسان'' کو خطاب ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی آیت ''فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ'' میں بھی، جو ۳۱ بار دُہرائی گئی ہے، دونوں کو خطاب ہے۔ سورۃ الجن آیت:۱، اور سورۃ الاحقاف آیت:۲۹ میں جنات کی ایک جماعت کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر ایمان لانے کا تذکرہ موجود ہے، وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ طیبہ میں بہت سی جگہ جنات کا ذکر آتا ہے، جس کی تفصیل غیرضروری ہے۔ قرآنِ کریم اور احادیثِ شریفہ سے واضح ہوتا ہے کہ:

۱:...... جنات ایک مستقل مخلوق ہے۔

۲:...... ان کی پیدائش آگ سے ہوئی ہے۔

۳:...... انسانوں کی طرح ان میں توالد وتناسل کا سلسلہ جاری ہے۔

۴:...... انسان کی طرح وہ بھی اَحکامِ الٰہیہ کے مکلّف ہیں۔

فہرست

۵:......انسان کی طرح ان میں بھی بعض مؤمن ہیں اور بعض کافر۔

۶:......وہ انسان کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔

۷:......ان میں سے جو کافر اور سرکش ہوں انہیں ''شیطان'' یا ''مردۃ الجن'' کہا جاتا ہے۔

۸:......ان کا جدِاَبعد ابلیس ہے۔

قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہؐ میں جنات کے بارے میں جتنا کچھ ذکر کیا گیا ہے اسے سامنے رکھ کر ایک مستقل کتاب تألیف کی جاسکتی ہے، اور علمائے اُمت نے اس موضوع پر کتابیں لکھی بھی ہیں، جن میں ''آکام المرجان فی أحکام الجان'' عربی میں مشہور کتاب ہے۔ جو لوگ قرآنِ کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں ان کو تو جنات کا وجود تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، اور جو لوگ ان کے وجود کی نفی کرتے ہیں ان کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ یہ مخلوق ان کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ اس لئے اگر یہ اُصول صحیح ہے کہ جو چیز نظر نہ آئے اس کا انکار کردیا جائے تو صرف جنات کے وجود ہی کا نہیں بلکہ ان بے شمار چیزوں کے وجود کا بھی انکار کرنا ہوگا جو آنکھوں سے نظر نہیں آتیں، ان میں سرِفہرست انسان کی اپنی رُوح ہے جسے کسی نے آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ موجودہ سائنس نے ایسے جراثیم کا انکشاف کیا ہے جن کو ایک لاکھ گنا بڑا کردیا جائے تب بھی ان کا نظر آنا مشکل ہے۔ پس اگر یہ اُصول صحیح ہے تو لوگوں کو مشورہ دینا چاہئے کہ تمام غیرمرئی چیزوں کا انکار کیا کریں، لیکن میں جانتا ہوں کہ ایسے مشورے کو آپ احمقانہ مشورہ کہیں گے، اس لئے کہ اگرچہ یہ چیزیں عام انسانوں کو نظر نہیں آتیں، لیکن آثار و قرائن ان کے وجود کا پتہ دیتے ہیں، اور سائنسی ایجادات نے ایسی بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کرادیا ہے، میں بہ ادب گزارش کروں گا کہ اگر سائنسی دُوربین یا خوردبین سے نظر آنے والے کسی ننھے منے جرثومے پر ''ایمان'' لانا واجب ہے اور اس کو جھٹلانے والا احمق ہے تو نبوّت کی دُوربین اور خوردبین جن چیزوں کا مشاہدہ کرکے ان کے وجود کی خبر دیتی ہیں ان کے وجود پر ایمان لانا کیوں ضروری نہیں...؟ اور ان کو جھٹلانا کیوں حماقت نہیں...؟ جبکہ جھٹلانے والوں کے ہاتھ میں اس

کے سوا کوئی دلیل نہیں کہ ان کی نظرِ کوتاہ ان چیزوں کے مشاہدے سے قاصر ہے۔

مجھے آپ سے شکایت ہے کہ جنات کے وجود کی بحث کو آپ نے سائنس سے پیدا شدہ اِشکالات میں کیوں جگہ دی؟ سائنس تو (مادّیات کی حد تک) علم و تحقیق کا نام ہے، جبکہ جنات کے وجود کی نفی کسی علم و تحقیق پر مبنی نہیں بلکہ ناواقفی و جہل پر اس کی بنیاد ہے۔ جنات کا وجود کسی سائنسی اُصول سے نہیں ٹکراتا، اور نہ کوئی سائنسی اُصول جنات کے وجود کی نفی کرتا ہے۔ ہمارے اس دورِ جدید کی ایک مصیبت یہ ہے کہ اس میں ''جہل'' کا نام ''علم'' رکھ لیا گیا ہے، اور ''یہ بات میرے علم میں نہیں'' کو اس کے وجود کی نفی پر دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ گویا یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اشیاء کا وجود ہمارے علم کے تابع ہے، ہمیں کسی چیز کا علم ہے تو وجود بھی رکھتی ہے، اور اگر ہمیں علم نہیں تو سمجھنا چاہئے کہ واقعے میں وہ اپنے وجود سے بھی محروم ہے۔ یہ ہے دورِ جدید کا وہ منفرد اُصول جس کے ذریعہ حقائق و واقعات کو بڑی جرأت سے جھٹلایا جاتا ہے۔

دُوسری بحث یہ کہ آیا جنات آدمی کو لگ سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عقلاً کوئی چیز اس سے مانع نہیں۔ آج مسمریزم اور عملِ تنویم کے ذریعہ دُنیا جن عجائبات کا مشاہدہ کر رہی ہے وہ کسی صاحبِ عقل سے مخفی نہیں۔ پس اگر ایک آدمی اپنے خاص مشقی عمل سے معمول کو مسخر اور کچھ دیر کے لئے اسے آپے سے باہر کرسکتا ہے، اس کی رُوح سے گفتگو کرسکتا ہے اور اس سے جو چاہے اُگلوا سکتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ اس امکان کا انکار کیا جائے کہ یہی سب کچھ جنات بھی کرسکتے ہیں، جبکہ آدمی اور جن کی قوّت کا مقابلہ چیونٹی اور ہاتھی کا مقابلہ ہے۔ پس جو تصرف مسکین چیونٹی کرسکتی ہے کیوں انکار کیا جائے کہ وہی تصرف ہاتھی نہیں کرسکتا...؟

یہ گفتگو تو امکان پر تھی، جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اس بارے میں بہت سے لوگ توہم پرستی کا شکار ہیں، اور وہ معمولی طبّی امراض پر بھی ''آسیب زدگی'' کا شبہ کرنے لگتے ہیں، کسی صحیح معالج کی طرف رُجوع کرنے کے بجائے وہ غلط قسم کے عاملوں کے چکر میں ایسے پھنستے ہیں کہ مدۃ العمر انہیں اس جال سے رہائی نصیب نہیں ہوتی، لیکن عوام

فہرست

کی فضول تو ہم پرستی کا علاج یہ نہیں کہ واقعات کا بھی انکار کردیا جائے۔ واقعہ یہی ہے کہ بعض شاذ و نادر حالات میں آسیب کا اثر ضرور ہوتا ہے، قرآنِ کریم میں دو جگہ اس کا ذکر آیا ہے۔

ایک جگہ سورۂ بقرہ میں سودخوروں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

”اَلَّذِیْنَ یَأْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ.“ (البقرہ:۲۷۵)

ترجمہ:...... ”جو لوگ کھاتے ہیں سود، نہیں اُٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اُٹھتا ہے وہ شخص، جس کے حواس کھودیئے ہوں جن نے لپٹ کر۔“ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”ارشاد ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ آدمی جس کو شیطان جن نے لپٹ کر خبطی بنادیا ہو۔ حدیث میں ہے کہ کھڑے ہونے سے مراد محشر میں قبر سے اُٹھنا ہے کہ سودخور جب قبر سے اُٹھے گا تو اس پاگل اور مجنون کی طرح اُٹھے گا جس کو کسی شیطان جن نے خبطی بنادیا ہو۔

اس جملے سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جنات و شیاطین کے اثر سے انسان بیہوش یا مجنون ہوسکتا ہے اور اہلِ تجربہ کے متواتر مشاہدات اس پر شاہد ہیں۔ اور حافظ ابنِ قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اطباء و فلاسفہ نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے کہ صرع، بیہوشی یا جنون مختلف اسباب سے ہوا کرتا ہے، ان میں بعض اوقات جنات و شیاطین کا اثر بھی اس کا سبب ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے ان کے پاس بجز ظاہری استبعاد کے کوئی دلیل نہیں۔“ (معارف القرآن ج:۱ ص:۶۴۷)

دُوسری جگہ سورۃ الانعام میں ہدایت چھوڑ کر گمراہی اختیار کرنے والوں کی مثال

دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

”کَالَّذِی اسۡتَہۡوَتۡہُ الشَّیٰطِیۡنُ فِی الۡاَرۡضِ حَیۡرَانَ لَہٗۤ اَصۡحٰبٌ یَّدۡعُوۡنَہٗۤ اِلَی الۡہُدَی ائۡتِنَا.“ (الانعام:۷۱)

ترجمہ:...... ”مثل اس شخص کے کہ راستہ بھلا دیا ہو اس کو جنوں نے جنگل میں، جبکہ حیران ہو، اس کے رفیق بلاتے ہوں اس کو راستے کی طرف کہ چلا آ ہمارے پاس۔“

پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ جنات لپٹ کر آدمی کو مخبوط الحواس بنادیتے ہیں، اور دُوسری آیت میں اسی مخبوط الحواسی کی ایک مثال ذکر کی گئی ہے کہ شیطان اس کو راستے سے بہکا دیتے ہیں، وہ حیران و سراسیمہ ہوکر مارا مارا پھرتا ہے، اس کے رفقاء اس کو آواز دیتے ہیں کہ ہم اِدھر ہیں، ہمارے پاس آجاؤ، مگر وہ اپنی اس مخبوط الحواسی کی بنا پر ان کی آواز پر بھی توجہ نہیں دیتا۔

رہا آپ کا یہ شبہ کہ: ”جن صرف ماننے والوں کو کیوں لگتے ہیں؟“ آپ کا یہ شبہ بھی اصل حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر ہے۔ تقریبِ فہم کے لئے عرض کرتا ہوں کہ بطور مثال کسی دُور افتادہ بادیہ نشین صحرائی کا تصوّر کیجئے، اسے کوئی خطرناک مرض لاحق ہوتا ہے مگر وہ مسکین اپنی ناواقفی کی بنا پر نہیں سمجھتا کہ اس مرض کے اسباب و علل کیا ہیں؟ اور اس کے علاج کی صحیح تدبیر کیا ہوسکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کے اس جہل کی وجہ سے مرض کے اسباب و علل کی نفی کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہوگا۔ اس مثال کے بعد میں یہ عرض کروں گا کہ امریکہ اور یورپ میں نفسیاتی مریضوں کی جو بہتات ہے وہ ہمارے ہاں بحمداللہ نہیں۔ ان ممالک میں ایسے مریضوں کے لئے بڑے بڑے شفاخانے بھی موجود ہیں، علاج معالجے کی سہولتوں کی بھی فراوانی ہے، ہر مرض کے لئے اعلیٰ درجے کے ماہرین اور متخصّصین بھی موجود ہیں، نفسیاتی معالج بھی ایک سے بڑھ کر ایک موجود ہے، لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود ان کے ہاں نفسیاتی مریضوں کی تعداد روز افزوں ہے، جن پر کوئی علاج کارگر نہیں ہو پاتا۔ اور آپ، ابنِ قیمؒ کی زبانی اطباء و فلاسفہ کا فیصلہ سن چکے ہیں کہ ان نفسیاتی امراض کے اسباب میں سے

ایک سبب آسیب کا اثر بھی ہوسکتا ہے، جبکہ جدید مغرب اس سبب کا ہی منکر ہے۔ اور عرض کرچکا ہوں کہ اس کے اس انکار کا منشا جہل کے سوا کچھ نہیں۔ اندریں صورت مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ جدید مغرب کی مثال اس بادیہ نشین صحرائی کی ہے جو مرض کے اصل سبب سے بے خبر اور جاہل ہے۔ لطیفہ یہ کہ جو لوگ مرض کے اصل سبب کی نشاندہی کرتے ہیں، یہ جاہل ان کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ فرمائیے! کہ ایسی صورت میں اس کے نفسیاتی مریض لاعلاج نہ ہوں تو اور کیا ہو؟ پس یہ کہنا کہ: ''انگریز اور رُوسی چونکہ جنات کے وجود ہی سے منکر ہیں اس لئے ان کو جنات بھی نہیں لگتے'' حقیقت پسندانہ بات نہیں، بلکہ صحیح یہ ہے کہ مشرق میں تو جنات ہزاروں لاکھوں میں سے کسی ایک آدھ کو لگتے ہیں، لیکن مغرب میں بڑی کثرت سے لگتے ہیں اور بے شمار لوگوں کو مخبوط الحواس اور نفسیاتی مریض بناتے ہیں۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ مشرق، جنات کے وجود کا قائل ہے اور نفسیاتی مرض کے اسباب کی فہرست میں ''جن'' لگنے کو بھی شمار کرتا ہے، اس صحیح تشخیص کی بنا پر وہ علاج میں بھی کامیاب ہوجاتا ہے، اِلَّا ماشاء اللہ۔ اس کے برعکس مغرب اپنی ناواقفی، تعصب اور جہل کی بنا پر نفسیاتی امراض کے اس اہم سبب کی نہ تشخیص کرسکتا ہے، نہ اس کے علاج و مداوا کی قدرت رکھتا ہے۔ لیکن کیسی ستم ظریفی ہے کہ آپ قصوروار ''مشرق'' کو سمجھتے ہیں، اور مغرب کے جہل کو بھی ہنر تصوّر فرماتے ہیں، اور یہ کھلی ہوئی بات نہیں سوچتے کہ اگر مغرب کو جن نہیں لگتا تو مشرق کے مقابلے میں اس کے لاعلاج نفسیاتی مریضوں کی اتنی بہتات کیوں ہے؟

مذہب اور سائنس میں تصادم

رہا آپ کا یہ سوال کہ: ''کیا مذہب اور سائنس ایک ساتھ چل سکتے ہیں؟'' کاش! فرصت ہوتی تو اس نکتے پر تفصیل سے لکھتا، مگر یہاں صرف آپ کے جواب میں اتنا عرض کروں گا کہ مذہب سے مراد اگر وہ غیرفطری اور باطل مذاہب ہیں جو (بطور مثال) ''تین اور ایک تین'' جیسے نظریات پر اپنی بنیادیں استوار کرتے ہیں تو میرا جواب نفی میں ہے۔ سائنس کے مقابلے میں ایسے فرسودہ و بوسیدہ مذاہب نہیں ٹھہر سکتے، نہ اس کے ساتھ چل سکتے ہیں، اور اگر مذہب سے مراد وہ دینِ فطرت ہے جس کا اعلان خالقِ فطرت نے ''اِنَّ

فہرست

الدِّیْنَ عِنْدَ اللہِ الْاِسْلَامُ“ میں فرمایا ہے تو میرا جواب یہ ہے کہ مذہب سائنس کے ساتھ چل سکتا ہے، چلتا ہے اور اِن شاء اللہ چلے گا، کیونکہ ”سائنس“ (اگر واقعتاً سائنس ہو) رموزِ فطرت کی نقاب کشائی کا نام ہے اور اسلام خود فطرت ہے: ”فِطْرَةَ اللہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا“۔

فطرت کبھی فطرت سے نہیں ٹکراتی، اس لئے اسلام کو سائنس سے کوئی خطرہ نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سائنس نے بہت سے ان اسلامی نظریات کو قریب الفہم کردیا ہے جن کو قرونِ وسطیٰ کا انسان حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھتا تھا۔ یہیں سے ہمارے اس یقین میں اضافہ ہوجاتا ہے کہ اسلام بلاشبہ خالقِ فطرت کا نازل کردہ دینِ فطرت ہے، اور اگر سائنس دان کوئی ایسا راگ اَلاپتے ہیں جو اسلام کے قطعی نظریات سے ٹکراتا ہے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ فطرت کے خلاف کہتے ہیں۔ اگر آج نہیں تو کل ان کے نظریہ کا غلط اور باطل ہونا ان پر آشکارا ہوجائے گا۔ بادل کے سیاہ ٹکڑے آفتاب کو تھوڑی دیر کے لئے نظروں سے اوجھل ضرور کرسکتے ہیں مگر وہ نہ اس کے وجود کو ختم کرسکتے ہیں، نہ اس کی روشنی کو غائب کرسکتے ہیں۔ اسلام، پوری انسانیت کے لئے آفتابِ ہدایت ہے، اندھے اس سے آنکھیں بند کرسکتے ہیں، گمراہ اور کج رو لوگ اپنے نظریات کے بادل اُٹھاسکتے ہیں لیکن ان بادلوں کو بہرحال چھٹنا ہوگا اور آفتابِ اسلام کی تابانی کو بہرحال چمکنا ہوگا۔

الغرض! سائنس کا کوئی صحیح نظریہ اسلام سے نہیں ٹکراتا، اور جو نظریات بظاہر اسلام سے متصادم نظر آتے ہیں وہ سائنس کے فطری نظریات نہیں بلکہ یا تو خام عقل لوگوں کی ہوا و ہوس کو ”سائنسی نظریہ“ کا نام دے دیا گیا ہے یا وہ تحقیق و تجسّس کے خلانوردوں کے سفر کی درمیانی منزلیں ہیں جنھیں غلط فہمی و عجلت پسندی سے ”حرفِ آخر“ سمجھ لیا گیا ہے۔ اس لئے ہمارے نوجوانوں کو ان نظریات سے خائف ہونے یا شکوک و شبہات کی تاریکیوں میں بھٹکنے کی ضرورت نہیں، ان کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا قطعی پیغامِ ہدایت اور دینِ فطرت موجود ہے، آسمان و زمین اپنی جگہ سے ٹل سکتے ہیں مگر پیغامِ محمدیؐ میں بال برابر بھی اُونچ نیچ کی گنجائش نہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے نوجوان ایمان و یقین کی غیر متزلزل قوّت سے آراستہ ہوکر آگے بڑھیں، خود مسلمان بنیں، اور سائنس کو مسلمان

بنائیں۔ سائنس کی مثال تلوار کی ہے، اگر وہ غازیانِ اسلام کے ہاتھ میں ہوگی تو جہاد فی سبیل اللہ کا کام دے گی، اور اگر رہزنوں کے ہاتھ میں ہوگی تو فساد فی الارض میں اضافہ کرے گی، والسلام!

مسئلہ حاضر و ناظر اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

س...... السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج شریف! خلاصۃ المرام اینکہ: بندۂ ناچیز ماہنامہ بینات میں آپ کے مضامین پوری دلچسپی سے پڑھتا ہے جو عقائد و اعمال و اخلاق میں کافی مفید ثابت ہوتے ہیں، اور بندہ کو آپ کی علمی قابلیت پر کافی اعتماد ہے، اس لئے پیش آمدہ اشکالات کے ازالہ کے لئے آپ کی ذات ہی کو منتخب کیا ہے، امید ہے کہ آنجنابِ عالی اپنے قیمتی لمحات میں سے کچھ وقت جوابات کے لئے نکال کر محقق بات لکھ کر بندہ کی تسلی و تشفی فرمائیں گے۔

اشکال نمبر:۱:......آپ نے اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم ص:۴۰ پر حاضر و ناظر کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے:

> ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عقیدہ کہ آپؐ ہر جگہ موجود ہیں اور کائنات کی ایک ایک چیز آپؐ کی نظر میں ہے، بداہتِ عقل کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں، چہ جائیکہ یہ شرعاً درست ہو، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اس کو کسی دوسری شخصیت کے لئے ثابت کرنا غلط ہے۔''

اِدھر آپ کا نظریہ پڑھا، اُدھر شیخ اجل حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ ''اقرب التوسل بالتوجہ الی سیّد الرسل بر حاشیہ اخبار الاخیار'' ص:۱۷۰ میں فرماتے ہیں:

> ''وبا چندیں اختلافات و کثرتِ مذاہب کہ در علمائے امت ست یک کس را اختلافے نیست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باحقیقت بے شائبہ مجاز تو ہم تاویل باقی ست و بر اعمال امت حاضر و ناظر است۔''

اس عبارت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت محدث دہلویؒ کے زمانے تک حاضر و ناظر کے مسئلے میں امتِ محمدیہ کے کسی ایک فرد نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ شاہ صاحبؒ کے زمانے کے بعد کسی کا اختلاف شاہ صاحب کے قول کو باطل نہیں کرسکتا۔ نیز اس میں براعمالِ امت کا لفظ ہے، اگر امت کو امتِ اجابت و دعوت دونوں کے لئے عام رکھا جائے اور ابتدا سے انتہا تک تمام کائنات کے احوال کو نگاہِ رسالت پر منکشف مانا جائے، اس میں کون سا استحالہ لازم آتا ہے؟ جیسا کہ شیخ رحمہ اللہ خود تصریح فرمارہے ہیں:

"ہر چہ در دنیاست از زمان آدم تا نفخۂ اولیٰ بروے صلی اللہ علیہ وسلم منکشف ساختند تا ہمہ احوال اورا از اول تا آخر معلوم گردید۔" (مدارج النبوۃ ج:۱)

اور اس بارے میں طبرانی کی حدیث بھی موجود ہے:

"ان اللہ قد رفع لی الدنیا وانی انظر الیھا والی ما ھو کائن فیھا."

نیز یہی شیخ رحمۃ اللہ علیہ مدارج النبوۃ ج:۲ ص:۷۸۷ مطبوعہ نولشکور میں فرماتے ہیں:

"بدانکہ وے صلی اللہ علیہ وسلم مے بیند و مے شنود کلام ترا زیرا کہ وے متصف است بہ صفات اللہ تعالیٰ و یکے از صفات الٰہی آنست کہ "انا جلیس من ذکرنی" و پیغمبر را صلی اللہ علیہ وسلم نصیب وافرست ازیں صفت۔"

نیز مدارج النبوۃ ج:۲ ص:۷۸۹ مطبوعہ نولشکور میں فرماتے ہیں:

"وصیت میکنم ترا اے برادر! بدوام ملاحظہ صورت و معنی او اگرچہ باشی تو بتکلف و مستحضر پس نزدیک است کہ الفت گیرد روح تو بوے، پس حاضر آید ترا وے صلی اللہ علیہ وسلم عیاناً و یابی اورا، وحدیث کنی باوے وجواب دہد ترا وی وحدیث گوید با دو خطاب کند ترا، پس

فائز شوی بدرجہ صحابہ عظام ولاحق شوی بایشاں انشاء اللہ تعالیٰ۔“

موجودہ علماء کی فہم و فراست بھی مسلّم، لیکن متقدمین علماء کی فہم و فراست یقیناً بدرجہا فائق ہے۔ جن دلائل کی بنا پر مسئلہ حاضر و ناظر کی تردید کی جاتی ہے کیا وہ دلائل حضرت محدث مرحوم کے سامنے نہ تھے؟ اگر حاضر و ناظر کا عقیدہ شرک ہوتا تو ایسے عظیم المرتبت شیخ اس عقیدہ کو متفق علیہ علمائے امت کیسے فرماتے ہیں؟ کیا تمام اکابر شرک میں مبتلا تھے؟ نعوذ باللہ من ذالک! اگر آپ کا نظریہ صحیح ہے تو ان عباراتِ بالا کا کیا جواب ہے؟

امید ہے کہ آپ میری اس بات سے پوری تحقیق سے کامل تشفی فرمائیں گے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

الجواب

مسئلہ حاضر و ناظر کے سلسلے میں اس ناکارہ نے یہ لکھا تھا:

> ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ آپؐ روضۂ اطہر میں استراحت فرما ہیں، اور دنیا بھر کے مشتاقانِ زیارت وہاں حاضری دیتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عقیدہ کہ آپؐ ہر جگہ موجود ہیں اور کائنات کی ایک ایک چیز آپؐ کی نظر میں ہے، بداہتِ عقل کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں، چہ جائیکہ یہ شرعاً درست ہو۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور اس کو کسی دوسری شخصیت کے لئے ثابت کرنا غلط ہے۔“

حضرت اقدس شاہ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ کا عقیدہ بھی یہی ہے، چنانچہ وہ اپنے رسالہ ”تحصیل البرکات بہ بیان معنی التحیات“ میں (جو کتاب المکاتیب والرسائل میں اڑتیسواں رسالہ ہے) ”السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

> ”اگر گویند کہ خطاب مرحاضر را بود، وآنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم دریں مقام نہ حاضر است بس توجیہ ایں خطاب چہ باشد؟

جوابش آنست کہ چوں ورود ایں کلمہ دراصل یعنی در شبِ معراج بصیغہ خطاب بود، دیگر تغیرش ندادند و بر ہماں اصلی گزاشتند۔

ودر شرح صحیح بخاری میگوید کہ صحابہ در زمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بصیغہ خطاب میگفتند وبعد از زمانِ حیاتش ایں چنین میگفتند السلام علی النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، نہ بلفظ خطاب۔''

(تحصیل البرکات بہ بیان معنی التحیات ص:۱۸۹)

ترجمہ:......''اگر کہا جائے کہ خطاب تو حاضر کو ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام میں حاضر نہیں، پس اس خطاب کی توجیہ کیا ہوگی؟

جواب اس کا یہ ہے کہ چونکہ اصل میں یعنی شبِ معراج میں یہ کلمہ صیغۂ خطاب کے ساتھ وارد ہوا تھا، اس لئے اس کو اپنی اصل حالت پر رکھا گیا، اور اس میں کوئی تغیر نہیں کیا گیا۔

اور صحیح بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صیغۂ خطاب کے ساتھ سلام کہتے تھے اور آپؐ کے وصال کے بعد ''السلام علی النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہتے تھے، خطاب کا صیغہ استعمال نہیں کرتے تھے۔''

اور مدارج النبوۃ باب پنجم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص وفضائل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وازاں جملہ خصائص ایں را نیز ذکر کردہ اند کہ مصلّی خطاب میکند آنحضرت را صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بقول خود السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وخطاب نمی کند غیر اورا۔

فہرست

اگر مراد بایں اختصاص آں داشتہ اند کہ سلام بر غیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بخصوص واقع نہ شدہ است پس ایں معنی موافق است بحدیثے کہ از ابن مسعود رضی اللہ عنہ آمدہ است۔

......و اگر مراد ایں دارند کہ خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم با وجود غیبت از خصائص است، نیز وجہے دارد۔

وجہ ایں میگویند کہ چوں در اصل شبِ معراج درود بصیغۂ خطاب بود کہ از جانب رب العزت سلام آمد بر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد ازاں ہم بریں صیغہ گزاشتند۔

ودر کرمانی شرح صحیح البخاری گفتہ است کہ صحابہ بعد از فوت حضرت السلام علی النبی میگفتند، نہ بصیغۂ خطاب، واللہ اعلم!“

ترجمہ:......”اور علماء نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں ایک یہ بات ذکر کی ہے کہ نمازی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو السلام علیک ایہا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہہ کر خطاب کرتا ہے، آپؐ کے سوا کسی دوسرے کو خطاب نہیں کرتا۔

اگر خصوصیت سے علماء کی مراد یہ ہے کہ نماز میں سلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا خصوصیت کے ساتھ کسی دوسرے کے لئے واقع نہیں ہوا تو یہ مضمون اس حدیث کے موافق ہے جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اور اگر علماء کی مراد یہ ہو کہ غائب ہونے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرنا آپؐ کی خصوصیات میں سے ہے تو یہ بات بھی ایک معقول وجہ رکھتی ہے، اور اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ چونکہ دراصل شبِ معراج میں دُرود صیغۂ خطاب کے ساتھ تھا کہ حضرت رب العزت کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

سلام کہا گیا، اس لئے بعد میں اسی صیغہ کو برقرار رکھا گیا۔

اور کرمانی شرح صحیح بخاری میں ہے کہ صحابہ کرامؓ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ''السلام علی النبی'' کہتے تھے، صیغۂ خطاب کے ساتھ نہیں کہتے تھے، واللہ اعلم!'' (ج:۱ ص:۱۶۵)

حضرت شیخ محدث دہلوی قدس سرہٗ کی ان عبارتوں سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر نہیں سمجھتے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو غائب تسلیم کرتے ہوئے سلام بصیغۂ خطاب کی توجیہ فرماتے ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ شیخ رحمہ اللہ سے پہلے کے علماء بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے۔ اور تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی حاضر و ناظر کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے، چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفاتِ شریفہ کے بعد التحیات میں ''السلام علیک ایہا النبی'' کے بجائے غائب کا صیغہ استعمال کرتے اور ''السلام علی النبی'' کہا کرتے تھے۔

واضح رہے کہ شیخ رحمہ اللہ نے جو بات کرمانی شرح بخاری کے حوالے سے نقل کی ہے وہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے ہم التحیات میں ''السلام علیک ایہا النبی'' پڑھا کرتے تھے، مگر جب آپؐ کا وصال ہوگیا تو ہم اس کے بجائے ''السلام علی النبی'' کہنے لگے۔'' (صحیح بخاری ج:۲ ص:۹۲۶)

اس ناکارہ نے ''اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم'' میں اس حدیث کو نقل کرکے لکھا تھا:

''صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مقصد اس سے یہ بتانا تھا کہ التحیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کے صیغہ سے جو سلام کہا جاتا ہے وہ اس عقیدہ پر مبنی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و موجود ہیں اور ہر شخص کے سلام کو خود سماعت

فہرست

فرماتے ہیں، نہیں! بلکہ خطاب کا صیغہ اللہ تعالیٰ کے سلام کی حکایت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں فرمایا گیا تھا۔‘‘

(ص:۴۷)

اس تمہید کے بعد شیخ رحمہ اللہ کی ان عبارتوں کی وضاحت کرتا ہوں جن کا آپ نے حوالہ دیا ہے۔

ا:......’’اقرب الی التوسل‘‘ کی جو عبارت آپ نے نقل کی ہے اس میں آپ کے نسخے میں شاید طباعت کی غلطی سے ایک لفظ رہ گیا ہے، جس سے مطلب سمجھنے میں اُلجھن پیدا ہوگئی ہے، میرے سامنے ’’المکاتیب والرسائل‘‘ مجتبائی نسخہ ہے جو ۱۲۹۷ھ میں شائع ہوا تھا، اس میں یہ عبارت صحیح نقل کی ہوئی ہے، اور وہ اس طرح ہے:

’’وباچندیں اختلافات و کثرت مذاہب کہ در علمائے امت است یک کس را خلافے نیست کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحقیقت حیات بے شائبہ مجاز وتوہم تأویل دائم وباقی ہست، وبر اعمال امت حاضر وناظر، ومر طالبان حقیقت راومتوجہان آنحضرت رامفیض ومربی است۔‘‘ (ص:۹۵)

ترجمہ:......’’اور باوجود اس قدر اختلافات اور کثرتِ مذاہب کے جو علمائے اُمت میں موجود ہیں ایک شخص کو بھی اس میں اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حیاتِ حقیقی کے ساتھ، جس میں مجاز اور تأویل کے وہم کا کوئی شائبہ نہیں، دائم وباقی ہیں۔ اور اُمت کے اعمال پر حاضر وناظر ہیں، اور طالبانِ حقیقت اور اپنی طرف متوجہ ہونے والوں کو فیض پہنچاتے ہیں اور ان کی تربیت فرماتے ہیں۔‘‘

اس عبارت میں زیرِ بحث مسئلہ حاضر وناظر سے تعرض نہیں بلکہ یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو روضۂ اطہر میں حیاتِ حقیقیہ حاصل ہے، آپؐ کی بارگاہِ عالی

فہرست

میں امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طالبانِ حقیقت کو بدستور افاضۂ باطنی فرماتے ہیں۔

پس ''بر اعمال امت حاضر و ناظر'' کا وہی مطلب ہے جو عرضِ اعمال کی احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ خصائصِ نبوی کے بیان میں لکھتے ہیں:

> ''وازاں جملہ آنست کہ عرض کردہ می شود بر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعمالِ امت و استغفار می کند مر ایشاں را و روایت کردہ است ابن المبارک از سعید بن المسیب کہ ہیچ روزے نیست مگر آنکہ عرض کردہ میشود بر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعمال امت صبح و شام وی شناسد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایشاں را بسیمائے ایشاں و اعمال ایشاں۔''
>
> ترجمہ:...... ''اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ایک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں اور آپؐ ان کے لئے استغفار فرماتے ہیں۔ ابن مبارکؒ، سعید بن مسیّبؒ سے روایت کرتے ہیں کہ کوئی دن نہیں گزرتا مگر یہ کہ امت کے اعمال صبح و شام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں ان کی علامتوں سے اور ان کے اعمال سے پہچانتے ہیں۔''

الغرض! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روضۂ اقدس میں استراحت فرما ہیں اور وہیں آپؐ پر امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں، اور انہیں ملاحظہ فرماتے ہیں، یہ نہیں آپؐ ہر جگہ موجود ہیں اور ہر شخص کے ہر عمل کو بچشم خود ملاحظہ فرماتے ہیں، کیونکہ جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے اس بات کے نہ حضرت شیخ دہلویؒ خود قائل ہیں، نہ ان سے پہلے کے اہل علم قائل تھے، اور نہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی یہ عقیدہ رکھتے تھے، ورنہ نماز میں ''السلام علیک ایہا النبی'' کہنے پر ان کو اشکال نہ ہوتا، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کے

بجائے ''السلام علی النبی'' بصیغۂ غائب کہنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے، واللہ الموفق!

۲:...... مدارج النبوۃ جلد اول کے حوالے سے جو ذکر فرمایا ہے کہ: ''دنیا اول سے آخر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر منکشف کی گئی ہے اور آپؐ کو اول سے آخر تک اس کے تمام حالات معلوم ہوگئے'' اور طبرانی کی جو حدیث نقل کی ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے دنیا کو پیش کیا، درآں حالیکہ میں اس کی طرف اور جو کچھ اس میں ہونے والا ہے اس کی طرف دیکھ رہا تھا'' اس سے یہ مراد نہیں کہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ کا علم آپؐ کو ہر لمحہ رہتا ہے، یا یہ کہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ کے پاس آپؐ حاضر و ناظر ہیں، بلکہ مراد اس سے کشف اور رؤیت ہے، اس کی مثال ایسی سمجھ لیجئے کہ آپ کسی معزز مہمان کو اپنے کارخانے کی سیر کراتے ہیں، پورا کارخانہ اس کی نظر کے سامنے ہے اور اس کے سارے حالات اسے معلوم ہوگئے، اس کے باوجود یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس معزز مہمان کو کارخانے کی ایک ایک چیز کا تفصیلی علم ہوگیا اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ اس کارخانے کی ادنیٰ ادنیٰ جزئیات اس کے ذہن میں ہر لمحہ محفوظ رہا کریں، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:

> ''واز جملہ معجزاتِ باہرہ وے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بودن اوست مطلع بر غیوب، وخبر دادن بانچہ حادث خواہد شد از کائنات، علمِ غیب اصالۃ مخصوص است بہ پروردگار تعالیٰ وتقدس کہ علام الغیوب است وہرچہ بر زبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وبعضے از تابعان وے ظاہر شدہ بوحی یا بالہام۔ ودر حدیث آمدہ است: واللہ! انی لا اعلم الا ما علمنی ربی۔'' (مدارج النبوۃ ج:۱ ص:۲۴۶)

> ترجمہ:...... ''اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزاتِ باہرہ میں سے ایک آپؐ کا مطلع ہونا ہے غیب کی چیزوں پر، اور خبر دینا ہے کائنات کے ان حوادث کی جو آئندہ واقع ہوں گے۔ علمِ غیب دراصل مخصوص ہے پروردگار تعالیٰ و تقدس کے ساتھ جو کہ علام الغیوب ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر یا آپؐ

کے بعض پیرووں کی زبان پر جو کچھ ظاہر ہوا وہ وحی والہام کے ذریعہ ہے، اور حدیث میں آیا ہے کہ: اللہ کی قسم! میں نہیں جانتا مگر جو کچھ میرے رب نے مجھے سکھایا ہے۔''

حضرت شیخ رحمہ اللہ نے اس مقام پر جو کچھ فرمایا ہے اس ناکارہ نے یہی کچھ ''اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم'' میں رقم کیا تھا، شیخ رحمہ اللہ کی اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علمِ غیب اور چیز ہے اور غیب کی باتوں پر بذریعہ وحی یا الہام کے مطلع ہوجانا دوسری چیز ہے۔ علمِ غیب خاصۂ خداوندی ہے جس میں کوئی دوسرا شریک نہیں اور اطلاع علی الغیب بذریعہ وحی اور الہام کی دولت حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام اور اولیاءِ عظام رحمہم اللہ کو حسبِ مراتب حاصل ہے۔

۳:...... تیسری عبارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور اور آپؐ کی صورتِ مبارکہ کے استحضار سے متعلق ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے اس امر کو بیان فرمارہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق پیدا کرنے اور آپؐ کی ذاتِ بابرکات سے فیض حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ظاہری اور دوسری معنوی۔ اور تعلق معنوی کی دو قسمیں ہیں۔ اول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مبارکہ کا دائمی استحضار رکھا جائے (قسم اوّل: استحضار آں صورت بدیع مثال)۔

اور اس استحضار کے مختلف طریقے بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: تمہیں کبھی خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ جہاں آرا کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے تو اسی صورتِ مبارکہ کا استحضار کرو جو خواب میں نظر آئی تھی، اور اگر کبھی خواب میں زیارت نصیب نہیں ہوئی تو:

''ذکر کن او را و درود بفرست بروے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وباش در حال ذکر گویا حاضر است در پیش در حالتِ حیات، ومی بینی تو او را متادب با جلال وتعظیم وہمت وحیا۔''

ترجمہ:...... ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کر، اور آپؐ پر

درود بھیج اور یاد کرنے کی حالت میں ایسا ہو کہ گویا تم آپؐ کی حیات میں سامنے حاضر ہو، اور تم اجلال و تعظیم اور ہمت و حیا کے ساتھ آپؐ کو دیکھ رہے ہو۔''

آگے وہی عبارت ہے جو آپ نے نقل کی ہے، پس یہ ساری گفتگو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معنوی تعلق پیدا کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ مبارکہ کا ذہن میں استحضار رکھنے سے متعلق ہے، خود سوچئے کہ ہمارے زیرِ بحث مسئلہ حاضر و ناظر سے اسے کیا تعلق ہے؟

۴:......اسی طرح آپ کی نقل کردہ آخری عبارت بھی زیرِ بحث مسئلہ سے تعلق نہیں رکھتی، بلکہ جیسا کہ خود اسی عبارت میں موجود ہے: ''دوام ملاحظہ صورت و معنی'' کے ذریعہ روحِ نبویؐ سے تعلق پیدا کرنے کی تدبیر بتائی گئی ہے، جس کا حاصل وہی مراقبہ و استحضار ہے۔ اور اس دوام و استحضار کا نتیجہ یہ ذکر فرمایا گیا ہے کہ: ''پس حاضر آید ترا وے صلی اللہ علیہ وسلم عیانا''، یعنی بذریعہ کشف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو جانا۔

جس طرح خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوتی ہے، اسی طرح بعض اکابر کو بیداری میں زیارت ہوتی ہے، (اور شیخ رحمہ اللہ اسی دولت کے حصول کی تدبیر بتا رہے ہیں) مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر مانا جائے، یا یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم روضۂ مقدسہ سے باہر تشریف لے آئیں، بلکہ خواب کی طرح بیداری میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت متمثل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ شیخ رحمہ اللہ نے ''مدارج النبوۃ'' (قسم اول باب پنجم) میں اس مسئلہ پر طویل گفتگو کی ہے، اس کے آخر میں فرماتے ہیں:

''وہمچنا کہ جائز است کہ در منام جوہر شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم متصور و متمثل گردد بے شوب شیطان، در یقظہ نیز حاصل گردد و آنچہ نائم در نوم می بیند مستیقظ در یقظہ بہ نیند...... وتمثیل ملکوتی بصورت ناسوتی امرے مقرر است، و ایں مستلزم نیست کہ

فہرست

آنحضرت علیہ السلام از قبر برآمدہ باشد۔

بالجملہ دیدن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعد از موت مثال است، چنانچہ در نوم مرئی شود در یقظہ نیز می نماید۔ وآں شخص شریف کہ در مدینہ در قبر آسودہ وحی است ہماں متمثل میگردد و در یک آن متصور بصور متعددہ، عوام را در منام می نماید و خواص را در یقظہ۔''

ترجمہ:......''جس طرح یہ جائز ہے کہ خواب میں شیطانی تمثّل کی آمیزش کے بغیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جوہر شریف متصور اور متمثّل ہوجائے اسی طرح بیداری میں بھی یہ چیز حاصل ہوجائے، اور جس چیز کو سونے والا خواب میں دیکھتا ہے، بیدار اسے بیداری میں دیکھ لے ......اور ملکوتی چیز کا ناسوتی شکل میں متمثّل ہوجانا ایک طے شدہ امر ہے، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس روضۂ اطہر سے باہر تشریف لے آئیں۔

خلاصہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کی وفات کے بعد دیکھنا بصورتِ مثال ہوتا ہے، وہ مثال جیسا کہ خواب میں نظر آتی ہے، بیداری میں بھی نظر آتی ہے اور وہ ذاتِ اقدس جو مدینہ طیبہ میں روضۂ مقدسہ میں استراحت فرما ہیں اور زندہ ہیں، وہی بصورتِ مثال متمثّل ہوتی ہے، اور ایک آن میں متعدد صورتوں میں متمثّل ہوتی ہے، عوام کو خواب میں نظر آتی ہے اور خواص کو بیداری میں۔''

شیخ رحمہ اللہ کی اس عبارت سے واضح ہوجاتا ہے کہ خواب یا بیداری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بصورتِ مثال ہوتی ہے، یہ نہیں کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف سے نکل کر دیکھنے والے کے پاس آجاتے ہوں۔ خلاصہ یہ کہ حاضر و ناظر کے مسئلے

فہرست

میں شیخ رحمہ اللہ کا عقیدہ وہی ہے جو اس ناکارہ نے لکھا تھا، شیخ رحمہ اللہ کی ان عبارتوں میں جو آپ نے نقل کی ہیں، اس مسئلہ سے کوئی تعرض نہیں۔

۵:...... شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے اپنی متعدد کتابوں میں بعض عارفین کے حوالے سے لکھا ہے کہ حقیقتِ محمدیہؐ تمام کائنات میں ساری ہے، چنانچہ ''السلام علیک ایہا النبیؐ'' کی بحث میں مدارج النبوۃ کی جو عبارت اوپر گزر چکی ہے، اس کے متصل فرماتے ہیں:

''و در بعضے کلام بعضے عرفا واقع شدہ کہ خطاب از مصلّی بملاحظہ شہود روحِ مقدس آنحضرت و سریان وے در زواری موجودات خصوصاً در ارواحِ مصلیین است و بالجملہ دریں حالت از شہود وجود حضور از آنحضرت غافل و ذاہل نباید بود، بامید ورود فیوض از روح پرفتوح وے صلی اللہ علیہ وسلم۔'' (مدارج النبوۃ ج:۱ ص:۱۶۵)

یہی مضمون ''تحصیل البرکات''، ''لمعات'' اور ''اشعة اللمعات'' میں بھی ذکر فرمایا ہے۔

اس سے بعض حضرات کو یہ وہم ہوا کہ شیخ رحمہ اللہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، حالانکہ ''حقیقتِ محمدیہ''، ''حقیقتِ کعبہ'' اور ''حقیقتِ قرآن'' حضراتِ عارفین کی خاص اصطلاحات ہیں، جن کا سمجھنا عقولِ عامہ سے بالاتر چیز ہے، حضراتِ عارفین کے حقائق و معارف اپنی جگہ برحق ہیں، مگر انہیں اپنی فہم کے پیمانے میں ڈھال کر ان پر عقائد کی بنیاد رکھنا بڑی بے انصافی ہے۔

ڈارون کا نظریۂ ارتقا اور اسلام

''گزشتہ دنوں یہاں کے ایک ڈاکٹر صاحب نے جو ''تنظیم اسلامی'' کے بانی ہیں، امریکہ جاکر اپنے خطبات میں یہ فرمایا کہ: ''حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا (اور جو احادیثِ صحیحہ میں محفوظ ہے) وہ صحیح نہیں، کیونکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا میدان

فہرست

نہیں تھا، اس لئے اس مسئلے میں اُمت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد لائقِ التفات نہیں، بلکہ فلاسفہ طبیعیین (ڈارون واَتباعہٗ) نے جو نظریۂ ارتقا پیش کیا ہے وہ صحیح ہے۔'' اس سلسلے میں متعدّد حضرات نے ہمیں خطوط بھیجے، ان میں سے ایک کا جواب مع اصل خط کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔''

(سعید احمد جلال پوری)

س…… کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص عقیدہ رکھتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام روح ڈالے جانے سے پہلے بھی زندہ تھے مگر حیوان کی شکل میں، اور اس حیوانی شکل میں بھی وہ جمادات ونباتات کے مراحل سے گزر کر پہنچے تھے۔ والله أنبتكم من الأرض نباتا. الآية ۔ اس آیتِ کریمہ سے وہ شخص اپنے اسی عقیدہ پر استدلال لیتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی روح ڈالے جانے سے پہلے کی کیفیت کو وہ شخص ''حیوان آدم'' قرار دیتا ہے۔

یہ شخص حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق کی بابت انہی مراحل سے گزر کر حیوان کی شکل تک پہنچنے کا عقیدہ رکھتا ہے، جن مراحل کا تذکرہ ڈارون نے اپنے ''نظریۂ ارتقا'' میں کیا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق سے متعلق جناب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح صحیح اور واضح احادیثِ مبارکہ کو یہ شخص درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا، چونکہ اس کے نزدیک صرف وہ احادیث قابلِ اتباع ہیں جو علم الاحکام یا حلال وحرام سے متعلق ہوں، علم الحقائق اور حکمت سے متعلق احادیث کی بات ان کے نزدیک دوسری ہے۔

یہ شخص کہتا ہے کہ جو کوئی سمجھتا ہو کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مٹی کا پُتلا بنایا گیا تھا اور پھر اس بے جان پُتلے میں روح پھونکی گئی تھی تو یہ کفر تو نہیں ناسمجھی ضرور ہے۔

یہ شخص حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق سے متعلق تفصیل وتحقیق کو ''امورِ دنیا'' میں سے قرار دیتا ہے، پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضراتِ صحابہ کرام رضوان

فہرست

اللہ علیہم اجمعین کو کھجوروں کی پیوندکاری کے بابت: ”أنتم أعلم بأمور دنیاکم!“ والی حدیث کو اپنے لئے دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق سے متعلق اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی واضح موقف اختیار نہیں فرمایا تو کوئی بات نہیں کہ یہ معاملہ اُمورِ دنیا میں سے ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا میدانِ کار نہیں۔

یہ شخص مذکورہ تمام باتیں برسرِ منبر جمعہ کے خطبہ میں لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے، اس شخص کی متذکرہ بالا باتوں کی روشنی میں دریافت طلب اُمور یہ ہیں:

✽:......کیا اس شخص کے مذکورہ بالا عقائد کو اہل سنت والجماعت کے عقائد کہا جاسکتا ہے؟

✽:......حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق سے متعلق احادیث کے بارے میں اس شخص کا رویہ گستاخی اور گمراہی نہیں ہے؟

✽:......حضرت آدم علیہ السلام کو ”حیوان آدم“ کہنا گستاخی نہیں ہے؟

✽:......کیا یہ شخص تفسیر بالرائے کا مرتکب نہیں ہوا؟

✽:......آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلافِ امت کا عقیدہ حضرت آدم علیہ السلام کے مٹی کے پُتلے سے بنائے جانے کا ہے یا نہیں؟

✽:......اس شخص کی بیعت یا کسی قسم کا تعلق اس کے ساتھ آپ کے نزدیک کیسا ہے؟ کتاب وسنت کی روشنی میں تفصیلات سے آگاہ فرماکر ثوابِ دارین حاصل کریں۔

ج......آنجناب نے ان صاحب کے جو افکار وخیالات نقل کئے ہیں، مناسب ہوگا کہ پہلے ان کا تنقیدی جائزہ لیا جائے، بعدازاں آپ کے سوالوں کا جواب عرض کیا جائے۔

آنجناب کے سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات ان صاحب کے علم میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق کے بارے میں کچھ تصریحات فرمائی ہیں، جن کو یہ صاحب ”اُمورِ دنیا“ قرار دیتے ہوئے لائقِ توجہ اور درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے، اس لئے یہاں دو باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

اول:...... یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی

فہرست

تخلیق کے بارے میں امت کو کیا بتایا ہے؟

دوم:...... یہ کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات امت کے لئے لائقِ توجہ نہیں؟

اَمرِ اوّل:

تخلیقِ آدم علیہ السلام کے بارے میں تصریحاتِ نبوی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیقِ جسمانی کی کیفیت اور اس تخلیق کے مدارج کے سلسلے میں جو تصریحات فرمائی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو تمام روئے زمین سے مٹی کا خلاصہ لیا، پھر اس میں پانی ملاکر اس کا گارا بنایا گیا، پھر اسے ایک مدت تک پڑا رہنے دیا گیا، یہاں تک کہ وہ گارا سیاہ ہوگیا، اس سے بو آنے لگی اور اس میں چپکاہٹ کی کیفیت پیدا ہوگئی، پھر اس گارے سے حضرت آدم علیہ السلام کا ساٹھ ہاتھ لمبا قالب بنایا گیا، پھر یہ قالب کچھ عرصہ پڑا رہا یہاں تک کہ خشک ہوکر اس میں کھنکھناہٹ پیدا ہوگئی اور وہ ٹھیکری کی طرح بجنے لگا، اس دوران شیطان اس قالب کے گرد گھومتا تھا، اسے بجا بجا کر دیکھتا جاتا تھا اور کہتا تھا کہ: اس مخلوق کے پیٹ میں خلا ہے، اس لئے اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکے گی۔

پھر اس بے جان قالب میں روح پھونکی گئی اور وہ جیتے جاگتے انسان بن گئے، جب ان کے نصفِ اعلیٰ میں روح داخل ہوئی تو انہیں چھینک آئی اور ان کی زبانِ مبارک سے پہلا کلمہ جو نکلا وہ ''الحمد للہ'' تھا، جس پر حق تعالیٰ شانہ نے ان کو جواب میں فرمایا: ''یرحمک ربک!'' (تیرا رَبّ تجھ پر رحم فرمائے)۔ حضرت آدم علیہ السلام جس وقت پیدا کئے گئے اس وقت ان کا قد ساٹھ ہاتھ لمبا تھا، اور ان کے تمام جسمانی اعضا اور ظاہری و باطنی قویٰ کامل و مکمل تھے، ان کو نشو و نما کے ان مراحل سے گزرنا نہیں پڑا جن سے اولادِ آدم گزر کر اپنے نشو و نما کے آخری مدارج تک پہنچتی ہے۔

یہ خلاصہ ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان بہت سے ارشادات کا جو حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق کے بارے میں مروی ہیں۔ میں ان بہت سی احادیث میں

سے یہاں صرف چار احادیث کے ذکر کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

حدیثِ اوّل:

”عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: خلق الله عز وجل آدم على صورته، طوله ستون ذراعا، فلما خلقه قال: اذهب فسلم على اولئک النفر! وهم نفر من الملٰئكة جلوس، فاستمع ما يحيونک به؟ فانها تحيتک وتحية ذريتک. قال: فذهب فقال: السلام عليكم! فقالوا: السلام عليک ورحمة الله! قال: فزادوه ”ورحمة الله“. قال: فكل من يدخل الجنة على صورة آدم وطوله ستون ذراعا، فلم يزل الخلق ينقص بعده حتى الآن.“

(صحیح بخاری ج:۲ ص:۹۱۹، صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۸۰، مسند احمد ج:۲ ص:۲۴۴)

ترجمہ:...... ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ان کی صورت پر پیدا کیا تھا، ان کا قد ساٹھ ہاتھ تھا، جب ان کو پیدا کیا گیا تو ان سے فرمایا کہ: جاؤ! اس جماعت کو جا کر سلام کہو۔ یہ فرشتوں کی ایک جماعت بیٹھی تھی۔ پس سنو! کہ یہ تمہیں کیا جواب دیتے ہیں؟ کیونکہ یہی تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے جا کر ان فرشتوں کو ”السلام علیکم!“ کہا، انہوں نے جواب میں کہا: ”وعلیک السلام ورحمۃ اللہ“ فرشتوں نے جواب میں ”ورحمۃ اللہ“ کے لفظ کا اضافہ کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: جتنے لوگ جنت میں داخل ہوں گے وہ آدم علیہ السلام کی

صورت پر ہوں گے اور ان کا قد ساٹھ ہاتھ کا ہوگا، بعد میں انسانوں کے قد چھوٹے ہوتے رہے جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔“

حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ”اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ان کی صورت پر پیدا کیا“ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”والمعنیٰ ان اللہ تعالیٰ اوجدہ علی الھیئۃ التی خلقہ علیھا لم ینتقل فی النشاۃ احوالا، ولا تردد فی الارحام اطوارا کذریتہ، بل خلقہ اللہ رجلا کاملا سویا من اول ما نفخ فیہ الروح، ثم عقب ذالک لقولہ: وطولہ ستون ذراعا.“

(فتح الباری ج:۶ ص:۳۶۶، کتاب الانبیاء باب خلق آدم وذریتہ)

ترجمہ:...... ”اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جس شکل و ہیئت میں پیدا فرمایا ان کو اسی ہیئت و شکل میں وجود بخشا، وہ اپنی ذریت کی طرح پیدائش کے مختلف حالات سے نہیں گزرے، نہ شکم مادر میں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوئے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق اس طرح فرمائی کہ نفخ روح کے وقت ہی سے وہ مردِ کامل تھے، اور ان کی تمام جسمانی قوتیں بدرجہ کمال تھیں، اسی بنا پر اس کے بعد فرمایا کہ اس وقت ان کا قد رساٹھ ہاتھ تھا۔“

اس حدیث کی یہی تشریح اور بہت سے اکابر نے فرمائی ہے۔

حدیثِ دوم:

”عن ابی موسی الاشعری رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ تعالیٰ خلق آدم من قبضۃ قبضھا من جمیع الارض فجاء بنو آدم

علی قدر الارض، منهم الابیض والاحمر والاسود وبین ذالک والسهل والحزن والخبیث والطیب."

(ترمذی ج:۲ س:۱۲۰، ابوداؤد ج:۲ ص:۶۴۴، مسنداحمد ج:۴ ص:۴۰۰، مستدرک حاکم ج:۲ ص:۲۶۱، صحیح ابن حبان، الاحسان ج:۹ ص:۱۱)

ترجمہ:...... "حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا مٹی کی مٹھی سے، جس کو تمام زمین سے لیا تھا، چنانچہ اولادِ آدم زمین کے اندازے کے مطابق ظاہر ہوئی، ان میں کوئی سفید ہے، کوئی سرخ، کوئی کالا اور کوئی ان رنگوں کے درمیان، کوئی نرم، کوئی سخت، کوئی خبیث کوئی پاکیزہ۔"

حدیثِ سوم:

"عن انس رضی الله عنه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: لما صور الله آدم فی الجنة ترکه ما شاء الله ان یترک، فجعل ابلیس یطیف به ینظر ما هو، فلما راٰه اجوف عرف انه خلق خلقا لا یتمالک."

(صحیح مسلم ج:۲ ص:۳۲۷، مسند احمد ج:۳ ص:۲۴۰، مسند طیالسی ص:۲۷۰ حدیث:۲۰۳۴)

ترجمہ:...... "حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جب اللہ تعالیٰ نے جنت میں آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ بنایا تو اس کو اسی حالت میں رہنے دیا جتنی مدت کہ اللہ تعالیٰ کو منظور تھی، تو شیطان اس کے گرد گھومنے لگا یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ کیا چیز ہے؟ پس جب اس نے دیکھا کہ اس کے پیٹ میں خلا ہے تو اس نے پہچانا کہ اس کی تخلیق

فہرست

ایسی کی گئی ہے کہ یہ اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکے گا۔“

حدیثِ چہارم:

”عن ابی هريرة رضی الله عنه عن النبی صلی الله عليه وسلم قال: ان الله خلق آدم من تراب، ثم جعله طينا، ثم تركه حتیٰ اذا كان حماء مسنونا خلقه وصوره، ثم تركه حتیٰ اذا كان صلصالا كالفخار، قال: فكان ابليس يمر به فيقول: ”لقد خلقت لامر عظيم!“ ثم نفخ الله فيه من روحه، فكان اول شیء جری فيه الروح بصره وخياشيمه، فعطس فلقاه الله حمد ربه، فقال الرب: يرحمک ربک! ..... الخ“

(فتح الباری ج:۶ ص:۳۶۴، مسند ابویعلیٰ ج:۶ ص:۹۷ حدیث:۶۵۴۹، مجمع الزوائد ج:۸ ص:۱۹۷)

ترجمہ:......”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے بنایا آدم علیہ السلام کو مٹی سے، پھر اس مٹی میں پانی ڈال کر اس کو گوندھ دیا، پھر اس کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ سیاہ گارا بن گیا تو اس کا قالب بنایا، پھر اس کو چھوڑ دیا، یہاں تک کہ وہ آگ میں پکی ہوئی چیز کی طرح کھنکھنانے لگا، ابلیس اس کے پاس سے گزرتا تو کہتا کہ: ”تجھے کسی بڑے کام کے لئے بنایا گیا ہے!“ پھر اللہ تعالیٰ نے اس قالب میں اپنی روح ڈالی، پس سب سے پہلی چیز جس میں روح جاری ہوئی وہ حضرت آدم علیہ السلام کی آنکھیں اور نتھنے تھے، پس ان کو چھینک آئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ”الحمدللہ“ کہنے کا الہام فرمایا، انہوں نے الحمدللہ کہا تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا: ”یرحمک ربک!“

(تیرا رَبّ تجھ پر رحم فرمائے)۔“

ان احادیثِ شریفہ کا خلاصہ و مضمون پہلے ذکر کرچکا ہوں، اب اس پر غور فرمایئے کہ ان احادیثِ مقدسہ میں تخلیقِ آدم علیہ السلام کے جو مدارج ذکر کئے گئے اور اس تخلیق کی جو کیفیت بیان فرمائی گئی ہے، قرآن کریم کی بہت سی آیات میں اس کی تصدیق و تصویب فرمائی گئی ہے۔

اوّل:...... یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق بلاواسطہ مٹی سے ہوئی اور یہ ان کی تخلیق کا نقطۂ آغاز اور مبداء اول ہے، حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

”اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللهِ کَمَثَلِ اٰدَمَ، خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ.“ (آل عمران:۵۹)

ترجمہ:......”بے شک حالتِ عجیبہ (حضرت) عیسیٰ کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشابہ حالتِ عجیبہ (حضرت) آدم کے ہے کہ ان (کے قالب) کو مٹی سے بنایا، پھر ان کو حکم دیا کہ (جاندار) ہوجا، پس وہ (جاندار) ہوگئے۔“ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

دوم:...... یہ کہ اس مٹی کو پانی سے گوندھا گیا، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ.“ (صٓ:۷۱)

ترجمہ:......”جب آپؐ کے رَبّ نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ: میں گارے سے ایک انسان (یعنی اس کے پتلے کو) بنانے والا ہوں۔“ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

سوم:...... یہ کہ گارا ایک عرصہ تک پڑا رہا، یہاں تک کہ سیاہ ہوگیا، اور اس میں سے بو آنے لگی، چنانچہ ارشاد ہے:

”وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ.“ (الحجر:۲۶)

ترجمہ:...... ’’اور ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے، جو کہ سڑے ہوئے گارے کی بنی تھی پیدا کیا۔‘‘ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

چہارم:...... یہ کہ مزید پڑا رہنے سے اس گارے میں چپکنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی، ارشاد ہے:

’’اِنَّا خَلَقْنٰـهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ.‘‘ (الصافات:۱۱)

ترجمہ:...... ’’ہم نے ان لوگوں کو چپکتی مٹی سے پیدا کیا ہے۔‘‘ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

پنجم:...... یہ کہ اس گارے سے قالب بنایا جو خشک ہوکر بجنے لگا، ارشاد ہے:

’’وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ.‘‘ (الحجر:۲۸)

ترجمہ:...... ’’اور جب آپؐ کے رب نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں ایک بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے جو کہ سڑے ہوئے گارے سے بنی ہوگی، پیدا کرنے والا ہوں۔‘‘

’’خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ. وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ.‘‘ (الرحمٰن:۱۴،۱۵)

ترجمہ:...... ’’اس نے انسان کو ایسی مٹی سے جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی، پیدا کیا، اور جنات کو خالص آگ سے پیدا کیا۔‘‘

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

ششم:...... یہ کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کا قالب مندرجہ بالا مدارج سے گزر چکا تو اس میں روح پھونکی گئی اور یہ ان کی تخلیق کی تکمیل تھی، ارشاد ہے:

’’اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ. فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ

سٰجِدِیْنَ.‘‘ (صٓ:۷۱،۷۲)

ترجمہ:......’’جب آپؐ کے رب نے فرشتوں سے ارشاد فرمایا کہ میں گارے سے ایک انسان (یعنی اس کے پتلے کو) بنانے والا ہوں، سو جب میں اس کو پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی طرف سے روح ڈال دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔‘‘

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے بنایا

قرآن کریم میں یہ بھی صراحت فرمائی گئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے فرمائی، چنانچہ ارشاد ہے:

’’قَالَ یٰٓاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَکَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ.‘‘ (صٓ:۷۵)

ترجمہ:......’’حق تعالیٰ نے فرمایا کہ: اے ابلیس جس چیز کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اس کو سجدہ کرنے سے تجھ کو کون چیز مانع ہوئی؟‘‘ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

یہ تو ظاہر ہے کہ ساری کائنات حق تعالیٰ شانہ ہی کی پیدا کردہ ہے، مگر حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں جو ارشاد فرمایا کہ: ’’میں نے اس کو اپنے ہاتھوں سے بنایا‘‘ اس سے حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت و شرف کا اظہار مقصود ہے۔ یعنی ان کی تخلیق توالد و تناسل کے معروف طریقہ سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بدستِ خود مٹی سے بنایا اور ان میں رُوح پھونکی، چنانچہ امام ابوالسعود رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

’’ای خلقه بالذات من غیر توسط أب و أم.‘‘

(تفسیر ابی السعود ج:۷ ص:۳۲۶)

ترجمہ:......’’یعنی میں نے ان کو ماں باپ کے واسطے کے بغیر بذاتِ خود پیدا فرمایا۔‘‘

اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں: ”خَلَقْتُ بِیَدَیَّ“ (بنایا میں نے اس کو اپنے ہاتھوں سے) فرمانا، اس حقیقتِ کبریٰ کا اظہار ہے کہ ان کی تخلیق تولید و تناسل کے معروف ذرائع سے نہیں ہوئی، یہیں سے اہل عقل کو یہ سمجھنا چاہئے کہ جس شخصیت کی تخلیق میں ماں اور باپ کا واسطہ بھی قدرت کو منظور نہ ہوا، اس کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ: ”وہ جمادات، نباتات، حیوانات اور بندروں کی ”جون“ تبدیل کرتے ہوئے انسانی شکل میں آیا“ کتنی بڑی ستم ظریفی ہوگی...! الغرض ”خلقت بیدی“ کے قرآنی الفاظ سے جہاں حضرت آدم علیہ السلام کے توالد و تناسل کے ذریعہ پیدا ہونے کی نفی ہوتی ہے، وہاں ان کے جمادات، نباتات اور حیوانوں اور بندروں سے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے انسان بننے کی بدرجہ اَولیٰ نفی ہوتی ہے، اس لئے اہل ایمان کے نزدیک حق وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اور جس کی تفصیلات اوپر گزر چکی ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں انبیائے کرام علیہم السلام کا عقیدہ

قرآن کریم کے ارشاد: ”خلقت بیدی“ (بنایا میں نے اس کو اپنے ہاتھوں سے) کے مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد اب اس پر بھی غور فرمایئے کہ اس بارے میں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا عقیدہ کیا تھا؟

حدیث کی قریباً تمام معروف کتابوں (صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مؤطا امام مالک اور مسند احمد وغیرہ) میں حضرت موسیٰ اور حضرت آدم علیہما السلام کا مباحثہ مذکور ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا:

”انت آدم الذی خلقک اللہ بیدہ ونفخ فیک من روحہ واسجد لک ملٰئکتہ واسکنک فی جنتہ.“

(مشکوٰۃ ص:۱۹)

ترجمہ:...... ”آپ وہی آدم (علیہ السلام) ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے بنایا اور اس میں اپنی طرف سے

روح ڈالی اور آپ کو اپنے فرشتوں سے سجدہ کرایا اور آپ کو اپنی جنت میں ٹھہرایا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں ٹھیک وہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو مذکورۃ الصدر آیتِ شریفہ میں وارد ہوئے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کا آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں سے بنانا اور ان کے قالب میں اپنی جانب سے روح ڈالنا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قالب اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اس میں روح ڈالی، وہ توالد و تناسل کے معروف مراحل سے گزر کر انسان نہیں بنے، نہ جمادات و نباتات اور حیوانوں اور بندروں سے شکل تبدیل کرتے ہوئے آدمی بنے۔

محشر کے دن اہل ایمان بھی اسی عقیدہ کا اظہار کریں گے

حدیثِ شفاعت میں آتا ہے کہ اہل ایمان قیامت کے دن شفاعتِ کبریٰ کے لئے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور ان سے عرض کریں گے:

”انت آدم ابو الناس خلقک اللہ بیدہ واسکنک جنتہ واسجد لک ملٰئکتہ وعلمک اسماء کل شیء۔“ (مشکوٰۃ ص:۴۸۸)

ترجمہ:...... ”آپ آدم ہیں، تمام انسانوں کے باپ ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھوں سے بنایا، اور آپ کو اپنی جنت میں ٹھہرایا، اور اپنے فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا، اور آپ کو تمام اشیاء کے ناموں کی تعلیم فرمائی۔“

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن اہل ایمان بھی اسی عقیدے کا اظہار کریں گے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق حق تعالیٰ شانہ نے براہِ راست اپنے دستِ قدرت سے فرمائی۔ مٹی سے ان کا قالب بنا کر اس میں روح پھونکی اور ان کو جیتا جاگتا

انسان بنایا، ان کی تخلیق میں نہ توالد وتناسل کا واسطہ تھا، اور نہ وہ جمادات سے بندر تک ارتقائی مراحل سے گزر کر ''انسان آدم'' بنے۔

قرآن کریم کی آیاتِ بینات، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ طیبات، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرمودات، اور میدانِ محشر میں اہلِ ایمان کی تصریحات آپ کے سامنے موجود ہیں، جو شخص ان تمام امور پر بشرطِ فہم وانصاف غور کرے گا اس پر آفتابِ نصف النہار کی طرح یہ حقیقت روشن ہوجائے گی کہ حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق کے بارے میں حقیقتِ واقعیہ وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی اور ان صاحب کا فلاسفہ طبیعیین کی تقلید میں تخلیقِ آدم علیہ السلام کو کرشمۂ ارتقا قرار دینا، صریح طور پر غلط اور نصوصِ قطعیہ سے انحراف ہے، واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل!

امرِ دوم

احادیثِ نبویہؐ کے بارے میں اس شخص کے خیالات کا جائزہ

اس شخص کا یہ کہنا کہ: ''اس مسئلے میں احادیثِ نبویہؐ لائق توجہ اور درخورِ اعتنا نہیں'' چند وجوہ سے جہلِ مرکب کا شکار ہے:

اولاً:...... اوپر قرآن کریم کی جو آیاتِ بینات ذکر کی گئی ہیں انہیں ارشاداتِ نبویہؐ کے ساتھ ملاکر پڑھئے تو واضح ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تخلیقِ آدم علیہ السلام کے سلسلے میں جو کچھ فرمایا ہے، وہ ان آیاتِ بینات ہی کی شرح وتفصیل ہے، اور جس مسئلے میں قرآن وحدیث دونوں متفق ہوں، کسی مؤمن کے لئے اس سے انحراف کی گنجائش نہیں رہتی، اور جو شخص فرمانِ الٰہی اور ارشادِ نبویؐ کو تسلیم کرنے سے ہچکچاتا ہے، انصاف فرمائیے کہ ایمان واسلام میں اس کا کتنا حصہ ہے؟

ثانیاً:...... بالفرض قرآن کریم سے ان احادیث کی تائید نہ ہوتی تب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کو سن کر یہ کہنا کہ: ''یہ لائقِ توجہ اور درخورِ اعتنا نہیں!'' بارگاہِ رسالتؐ میں نہایت جسارت اور حد درجہ کی گستاخی ہے، جس کے سننے کی بھی کسی مؤمن کو تاب نہیں ہوسکتی کہ اس کے سنتے ہی روحِ ایمان لرز جاتی ہے! کجا کہ کوئی

فہرست

مسلمان ایسے موذی الفاظ زبان پر لانے کی جرأت کرے، ذرا سوچئے کہ جس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تخلیقِ آدم علیہ السلام کے بارے میں ان حقائق کو بیان فرمارہے تھے، کوئی شخص (بالفرض یہی صاحب) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ کہہ دیتا کہ: -نعوذ باللہ- ''یہ آپؐ کا میدانِ کار نہیں، بلکہ یہ ڈارون کا میدانِ تحقیق ہے!'' تو فرمائیے کہ ایسا شخص کس صف میں شمار کیا جاتا...؟

حافظ ابن حزمؒ لکھتے ہیں:

''وکل من یکفر بما بلغه وصح عنده عن النبی صلی اللہ علیه وسلم او جمع علیه المؤمنون مما جاء به النبی علیه السلام فهو کافر! کما قال اللہ تعالیٰ: ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدی ویتبع غیر سبیل المؤمنین نوله ما تولی ونصله جهنم.''

(المحلیٰ ج:۱ ص:۱۲)

ترجمہ:...... ''اور ہر وہ شخص جس نے کسی ایسی بات کا انکار کیا جو اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچی اور اس کے نزدیک اس کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح تھا، یا اس نے ایسی بات کا انکار کیا جس پر اہل ایمان کا اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، تو ایسا شخص کافر ہے! چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے: اور جس نے مخالفت کی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی، بعد اس کے کہ اس پر صحیح بات کھل گئی اور وہ چلا اہل ایمان کا راستہ چھوڑ کر، تو ہم اسے پھیر دیں گے جدھر پھرتا ہے، اور ہم اسے جھونک دیں گے جہنم میں۔''

ثالثاً:...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں ان کے بارے میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم کو ان کا علم کس ذریعہ سے ہوا؟ ظاہر ہے کہ حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس وحی الٰہی کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں، لہٰذا دلیلِ عقل سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں جو کچھ بیان فرمایا اس کا سرچشمہ وحیٔ الٰہی ہی ہوسکتا ہے، اور اس کو رَدّ کرنا گویا وحیٔ خداوندی کو رَدّ کرنا ہے، ظاہر ہے کہ یہ شیوہ کسی کافر و منافق کا ہوسکتا ہے، کسی مسلمان کا نہیں! خصوصاً جب یہاں اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا واقعہ اس دور کا ہے جس کو مؤرخین ’’قبل از تاریخ‘‘ سے تعبیر کرتے ہیں، جب اس وقت کوئی انسانی وجود ہی نہیں تھا تو اس دور کی تاریخ اور اس واقعہ کی تفصیلات کون قلم بند کرتا؟ ہاں! اللہ تعالیٰ جو آدم علیہ السلام کی تخلیق فرما رہے تھے، یہ پورا واقعہ ان کے سامنے تھا اور اس کی ضروری تفصیلات سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آگاہ فرمایا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تفصیلات سے اُمت کو آگاہی بخشی، اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشاداتِ صحیحہ کو رَدّ کردینا اور فلاسفہ کی ہفوات کی تقلید کرنا، کیا کسی صاحبِ ایمان کی شان ہوسکتی ہے...؟

رابعاً:......آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ: ’’حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اس طرح ہوئی‘‘ یہ ایک خبر ہے، اور خبر یا تو واقعہ کے مطابق ہوگی، یا واقعہ کے خلاف ہوگی، جو خبر واقعہ کے مطابق ہو وہ سچی کہلاتی ہے، اور خبر دینے والا سچا سمجھا جاتا ہے، اور جو خبر واقعہ کے خلاف ہو وہ جھوٹی کہلاتی ہے، اور خبر دینے والا جھوٹا قرار پاتا ہے۔ اب یہ صاحب جو کہہ رہے ہیں کہ: ’’آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں جو خبریں دی ہیں، وہ واقعہ کے خلاف ہیں‘‘ اہلِ عقل غور فرمائیں کہ اس کا مطلب کیا ہوسکتا ہے؟ کیا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح تکذیب نہیں؟ اور کیا یہ بات عقلاً ممکن ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبر کو غلط بھی سمجھتا ہو اور آپؐ پر ایمان بھی رکھتا ہو...؟ ہرگز نہیں! ’’ضدان لا یجتمعان!‘‘ (یہ دونوں ضدیں ہیں، جو کبھی جمع نہیں ہوسکتیں)۔

خامساً:......ان صاحب کا یہ کہنا کہ: ’’حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا واقعہ

اُمورِ دنیا میں سے ہے، اس لئے اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد لائقِ التفات نہیں!'' ان کی دلیل کا صغریٰ و کبریٰ دونوں غلط ہیں، اس لئے کہ گفتگو حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں ہے، اور ہر شخص جانتا ہے کہ تخلیق اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور خالقیت اس کی صفت ہے، اب ان صاحب سے دریافت کیا جائے کہ حق تعالیٰ شانہ کی صفات و افعال کو بیان کرنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب ہے یا -نعوذ باللہ- ڈارون کا میدانِ کار...؟ اور یہ کہ اگر صفاتِ الٰہیہ کے بیان میں بھی -بقول اس کے- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ لائقِ التفات نہیں تو پھر اور کس چیز میں آپؐ کی بات لائقِ اعتماد ہوگی؟ نعوذ باللہ من سوء الفهم و فتنة الصدر!

حق تعالیٰ شانہ کے صفات و افعال وہ میدان ہے جہاں دانش و خرد کے پاؤں شل ہیں، یہ وہ فضا ہے جہاں عقل و فکر کے پَر جلتے ہیں، اور عقلِ انسانی ان حقائقِ الٰہیہ کا ٹھیک ٹھیک ادراک کرنے سے عاجز و درماندہ ہے، جہاں سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ فرمانے پر مجبور ہوں:

''اَللّٰهُمَّ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ!''

ترجمہ:......''یا اللہ! میں تیری تعریف کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوں، آپ بس ویسے ہی ہیں جیسا کہ آپ نے خود اپنی ثنا فرمائی ہے۔''

وہاں کسی دوسرے کی عقلِ نارسا کے عجز و درماندگی کا کیا پوچھنا؟ یہی وجہ ہے کہ جن فلاسفہ نے انبیاء کرام علیہم السلام کا دامن چھوڑ کر محض اپنی عقلِ نارسا کے گھوڑے پر سوار ہوکر اس میدان میں ترکتازیاں کیں حیرت و گمراہی کے سوا ان کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ یہ حق تعالیٰ شانہ کا انعام ہے کہ اس نے حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ ان حقائقِ الٰہیہ میں سے اتنے حصہ کو بیان فرمادیا جس کا انسانوں کی عقل تحمل کرسکتی تھی، کیسی عجیب بات ہے کہ ایک مسلمانی کا دعویدار اس انعامِ الٰہی کا یہ شکر ادا کر رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے ارشادات کو نالائقِ التفات قرار دے کر فلاسفۂ ملحدین کی دُم پکڑنے کی تلقین کر رہا ہے۔

سادساً:......ان صاحب کا یہ کہنا کہ: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں کوئی واضح موقف اختیار نہیں فرمایا'' خالص جھوٹ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر افتراء ہے، کیونکہ گزشتہ سطور میں آپ ملاحظہ فرماچکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری وضاحت اور کامل تشریح کے ساتھ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کی مٹی لے کر اس کو پانی سے گوندھا، پھر اس گارے سے آدم علیہ السلام کا ساٹھ ہاتھ کا قالب بنایا، پھر اس قالب میں روح ڈالی، وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام صراحتوں اور وضاحتوں کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ: ''اس مسئلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی واضح موقف اختیار نہیں فرمایا''، اور اگر اتنی صراحت و وضاحت اور تاکید و اصرار کے ساتھ بیان فرمائے ہوئے مسئلہ کے بارے میں بھی یہ کہا جائے کہ: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی واضح موقف اختیار نہیں فرمایا'' تو بتایا جائے کہ اس سے زیادہ ''واضح موقف'' کن الفاظ میں بیان کیا جاتا...؟

''أنتم أعلم بأمر دنیاکم!'' کی تشریح

ان صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ''أنتم أعلم بأمر دنیاکم!'' سے یہ کلیہ کشید کرلیا کہ دنیا کے کسی کام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد لائقِ الفات نہیں، اس سلسلے میں بھی چند گزارشات گوش گزار کرتا ہوں:

اوّل:......ان صاحب نے اس حدیث کو دیکھنے اور اسے غلط معنی پہنانے سے پہلے اگر قرآنِ مبین کو اُٹھاکر دیکھنے کی زحمت کی ہوتی تو اسے اس حدیث کو غلط معنی پہنانے کی جرأت نہیں ہوتی۔

قرآن کریم میں حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ، وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا.'' (الاحزاب:۳۶)

ترجمہ:......''اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجائش نہیں جبکہ اللہ اور اس کا رسولؐ کسی کام کا حکم دے دیں کہ (پھر) ان (مؤمنین) کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار باقی رہے، اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسولؐ کا کہنا نہ مانے گا وہ صریح گمراہی میں جا پڑا۔''   (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

یہ آیتِ شریفہ ایک دنیوی معاملہ کے بارے میں نازل ہوئی، جس کا واقعہ مختصراً یہ ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا عقد حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے کرنا چاہا، چونکہ زید غلام رہ چکے تھے، ادھر حضرت زینب بنت جحشؓ قریش کے اعلیٰ ترین خاندان کی چشم و چراغ تھیں، اس لئے ان کے خاندان والوں کو خاندانی وقار کے لحاظ سے یہ رشتہ بے جوڑ محسوس ہوا، اور حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے اس رشتہ کی منظوری سے عذر کردیا، اس پر یہ آیتِ شریفہ نازل ہوئی تو دونوں بہ جان و دل سمع و طاعت بجالائے۔

یہاں دو باتیں بطورِ خاص لائقِ غور ہیں، ایک یہ کہ کسی لڑکی کا رشتہ کہاں کیا جائے اور کہاں نہ کیا جائے؟ ایک خالص ذاتی اور نجی قسم کا دنیوی معاملہ ہے، لیکن کسی شخص کے خالص ذاتی اور نجی معاملے میں دخل دیتے ہوئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ رشتہ منظور فرمادیا تو قرآنِ کریم کی اس نصِ قطعی کی رو سے اس خاندان کو اپنے ذاتی دنیوی معاملے میں بھی اختیار نہیں رہا، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز کو بہ دل و جان منظور کرلینا شرطِ ایمان قرار پایا۔

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رشتہ کی جو تجویز فرمائی تھی، کسی روایت میں نہیں آتا کہ یہ تجویز وحیٔ الٰہی سے تھی، لیکن قرآنِ کریم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ذاتی تجویز کو ''اللہ و رسول کا فیصلہ'' قرار دے کر تمام لوگوں کو آگاہ کردیا کہ کسی دنیوی معاملے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی تجویز بھی فیصلۂ خداوندی ہے، جس سے انحراف کرنا کسی مسلمان کے لئے روا نہیں!

فہرست

قرآنِ کریم تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی رائے کو بھی اللہ تعالیٰ کا حتمی فیصلہ قرار دیتا ہے، مگر اس بدمذاقی کی داد دیجئے کہ کہنے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ کسی دنیوی کام میں معتبر نہیں!''

پھر قرآنِ کریم امت کو تلقین کرتا ہے:

''وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ، وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا.'' (الحشر:۷)

ترجمہ:...... ''رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہیں جو کچھ دے دیں اسے لے لو، اور جس سے روک دیں رُک جاوٴ!''

لیکن آج بتایا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں جو خبر دیں اسے قبول نہ کرو بلکہ ڈارون کی تقلید میں انسان کو بندر کی اولاد قرار دو، انا للہ وانا الیہ راجعون!

دوم:...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے بے شمار پہلووٴں میں انسانیت کی راہ نمائی کی اور اُمورِ دنیا کی ہزار ہا ہزار گتھیوں کو سلجھایا، جس کو علمائے امت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں شمار کیا ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ ''الشفاء'' میں لکھتے ہیں:

''ومن معجزاتہ الباھرۃ ما جمعہ اللہ لہ من المعارف والعلوم وخصہ بہ من الاطلاع علیٰ جمیع مصالح الدنیا والدین ...... الخ.''

ترجمہ:...... ''اور من جملہ آپؐ کے روشن معجزات کے ایک وہ علوم و معارف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لئے جمع فرمائے اور آپؐ کو (انسانی ضرورت کے) تمام مصالح دنیا و دین کی اطلاع کے ساتھ مخصوص فرمایا۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں جو ہمہ گیر

فہرست

تعلیمات فرمائی ہیں، بلاشبہ اسے معجزۂ نبوت اور تعلیم الٰہی ہی کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر طب و معالجات کا باب لیجئے! ظاہر ہے کہ علاج معالجہ ایک خالص بدنی و جسمانی اور دنیوی چیز ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طب کے ایسے اصول وکلیات اور فروع وجزئیات بیان فرمائے ہیں کہ عقل حیران ہے، حافظ شیرازی رحمہ اللہ کے بقول:

نگارمن کہ بہ مکتب نرفت وخط ننوشت

بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

اہل علم نے طب نبویؐ کے نام سے ضخیم کتابیں لکھی ہیں، اور حافظ ابن قیمؒ نے ''زادالمعاد'' میں اس کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کردیا ہے، یہاں بے ساختہ اس واقعہ کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے، جو صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی اور حدیث کی بہت سی کتابوں میں مروی ہے کہ: ایک صاحب آئے اور عرض کیا کہ: میرے بھائی کو اسہال کی تکلیف ہے۔ فرمایا: اسے شہد پلاؤ! اس نے شہد پلایا اور آکر عرض کیا کہ: میں نے شہد پلایا تھا مگر اس سے اسہال اور بڑھ گئے۔ فرمایا: اس کو شہد پلاؤ! چار بار یہی قصہ پیش آیا کہ اس کے اسہال میں اضافہ ہوگیا، آپؐ نے چوتھی مرتبہ فرمایا کہ:

''صدق اللہ و کذب بطن اخیک!''

(جامع الاصول ج:۷ ص:۵۱۷)

ترجمہ:...... ''اللہ کا کلام سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے!''

اس نے پھر شہد پلایا تو اسہال بند ہوگئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا جو واقعہ ارشاد فرمایا، اس کے مقابلے میں ان صاحب کا یہ کہنا کہ: ''حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اس طرح نہیں ہوئی'' اس کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

''صدق اللہ ورسولہ! و کذب داروین والدکتور!''

ترجمہ:...... ''اللہ ورسول کا فرمان برحق ہے! اور ڈارون

فہرست

اور ڈاکٹر جھوٹ بولتے ہیں!''

اور ایک طب اور معالجہ پر ہی کیا منحصر ہے، زندگی کے کسی ایک شعبہ کا تو نام لیجئے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے راہ نمائی نہ فرمائی ہو، اور جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات سے محروم رہا ہو، چلنا پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، بیوی بچوں، عزیز و اقارب اور دوست احباب سے ملنا جلنا، صلح و امن، حرب و ضرب، نکاح و طلاق، بیع و شراء، سیاست و ادب، الغرض دنیوی اُمور میں سے کون سا امر ایسا ہے جس میں معلّمِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات و تعلیمات کے نقوش ثبت نہ ہوں؟ صحیح مسلم ابوداؤد، نسائی اور ترمذی کی حدیث میں ہے کہ: یہود اور مشرکین نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر اعتراض کیا:

''قد علمکم نبیکم کل شیء حتی الخراءة؟

قال: اجل!'' (جامع الاصول ج:۷ ص:۱۳۳)

ترجمہ:...... ''تمہیں تو تمہارا نبی ہر چیز سکھاتا ہے یہاں تک کہ ہگنا موتنا بھی؟ فرمایا: ہاں! (ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بول و براز کے یہ آداب سکھائے ہیں)۔''

اس اعتراض سے یہودی کا مقصود -واللہ اعلم- یا تو مسلمانوں پر نکتہ چینی کرنا تھا کہ تم ایسے نادان اور کودن ہو کہ تمہیں ہگنا موتنا بھی نہیں آتا، تم اس کے لئے بھی نبی کی تعلیم کے محتاج ہو؟ یا اس لعین کا مقصد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنا تھا کہ انبیاء کرام علیہم السلام علوم عالیہ سکھانے کے لئے آتے ہیں، یہ کیسا نبی ہے کہ لوگوں کو ہگنے موتنے کے طریقوں کی تعلیم دیتا ہے۔

حضرت سلمان رضی اللہ عنہ اس کے اس بے ہودہ اعتراض سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ یہ فرمایا کہ: ''ہاں! ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بول و براز کا طریقہ بھی سکھاتے ہیں، اور آپؐ نے اس ضمن میں فلاں فلاں آداب کی تعلیم دی ہے۔'' اگر اس کا مقصود مسلمانوں پر اعتراض کرنا تھا تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہم نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیت الخلاء میں جانے کا طریقہ سیکھ لیا، تم اپنی فکر کرو کہ تم

جانوروں کی طرح یہ طبعی حوائج پوری کرتے ہو، مگر تم انسانوں کے طریقہ سے ابھی تک محروم ہو۔ اور اگر اس کا مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نکتہ چینی کرنا تھا تو جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال یہ ہے کہ ان طبعی انسانی ضرورتوں کی ایسی تعلیم فرماتے ہیں کہ انسان کی یہ طبعی حاجات بھی تقرب الی اللہ کا ذریعہ بن جائیں، اور یہ چیزیں بھی عبادات کے زمرے میں شمار ہونے لگیں، بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی رعایت کرتے ہوئے استنجا خانے میں جانا بھی عبادت کے زمرے میں آتا ہے۔ چنانچہ ہمارے شیخ المشائخ شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی مہاجر مدنی قدس سرہٗ حاشیہ ابن ماجہ میں لکھتے ہیں:

”قال علماءنا ان اتیان السنة ولو کان امرا یسیرا کادخال الرجل الایسر فی الخلا ابتداء اولیٰ من البدعة الحسنة وان کان امرا فخیما کبناء المدارس۔“

(حاشیہ ابنِ ماجہ ص:۳)

ترجمہ:...... ”ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ: سنت کا بجالانا اگرچہ وہ معمولی بات ہو، مثلاً: بیت الخلا میں جاتے ہوئے بایاں پاؤں پہلے رکھنا، بدعتِ حسنہ سے بہتر ہے، اگرچہ وہ عظیم الشان کام ہو، جیسے مدارس کا بنانا۔“

خلاصہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کی راہ نمائی نہ فرمائی ہو، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے:

”انما انا لکم بمنزلة الوالد اعلمکم!“

(ابوداوٗد ص:۳)

ترجمہ:...... ”میں تو تمہارے لئے بمنزلہ والد کے ہوں، میں تم کو تعلیم دیتا ہوں!“

اس لئے ان صاحب کا یہ کہنا کہ: ''اُمورِ دنیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا میدان نہیں تھا، اس لئے اُمورِ دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول -نعوذ باللہ- لائقِ التفات نہیں'' قطعاً غلط در غلط ہے...!

سوم:...... یہ صاحب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ''أنتم أعلم بأمر دنیاکم'' کا مدعا ہی نہیں سمجھے، اس لئے اس سے کشید کرلیا کہ دُنیوی معاملات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد لائقِ التفات نہیں۔ خوب سمجھ لیا جائے کہ اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا وہ بطور مشورہ کے تھا، شیخ المشائخ شاہ عبدالغنی محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ حاشیہ ابن ماجہ میں اس سلسلہ کی روایات کو جمع کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

''فعلم ان هذا الامر منه صلى الله عليه وسلم كان بطريق الاجتهاد والمشورة فما كان واجب الاتباع.'' (حاشیہ ابن ماجہ ص:۱۷۸)

ترجمہ:...... ''پس معلوم ہوا کہ اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ بطورِ رائے اور مشورہ کے تھا، اس لئے واجب الاتباع نہیں تھا۔''

مشورہ اور حکم کے درمیان فرق حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے قصہ سے واضح ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت بریرہؓ کو آزاد کردیا، یہ شادی شدہ تھیں، آزادی کے بعد انہوں نے اپنے شوہر مغیثؓ کو قبول کرنے سے انکار کردیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سفارش فرمائی کہ: بریرہ! تم مغیث کو قبول کرلو! انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ حکم ہے یا مشورہ؟ فرمایا: حکم تو نہیں، مشورہ ہے! عرض کیا کہ: اگر مشورہ ہے تو میں قبول نہیں کرتی!

اس واقعہ سے بھی معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم خواہ کسی دنیوی امر میں ہو واجب التعمیل ہے، البتہ اگر بطورِ مشورہ کچھ ارشاد فرمائیں تو اس کا معاملہ دوسرا ہے۔

فہرست

آیت سے غلط اِستدلال

اس شخص کا آیتِ شریفہ: ''واللہ انبتکم من الارض نباتا'' سے ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر استدلال کرتے ہوئے یہ کہنا کہ: ''حضرت آدم علیہ السلام بھی جمادات و نباتات اور حیوانات کے مراحل سے گزر کر ''انسان آدم'' بنے تھے'' سراسر مہمل اور لایعنی ہے، کیونکہ:

اوّلاً:...... یہ شخص خود تسلیم کرتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیقِ جسمانی کی ایک کیفیت بیان فرمائی ہے، جو ان صاحب کے ذکر کردہ نظریہ سے متضاد ہے۔ اب ان صاحب کو دو باتوں میں سے ایک بات تسلیم کرنی ہوگی۔ یا تو یہ کہ خود صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم -نعوذ باللہ- قرآن کی اس آیت کا صحیح مفہوم نہیں سمجھے، کیونکہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آیت کا وہ مفہوم منکشف ہوگیا ہوتا جو ان صاحب کو القا ہوا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیقِ جسمانی کے بارے میں اس سے متضاد اور مختلف کیفیت بیان نہ فرماتے۔ یا ان صاحب کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ وہ اپنے ذہن سے تراش کر جو معنی قرآنِ کریم کو پہنانا چاہتے ہیں وہ سراسر لغو و لایعنی ہے، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس سے بَری ہیں۔

ممکن ہے کہ یہ شخص بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ وہ قرآن کے حقائق و معارف کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر بیان کرسکتا ہے، چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی لکھتا ہے:

> ''پس یہ خیال کہ گویا جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم کے بارے میں بیان فرمایا اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، بدیہی البطلان ہے۔''

(کرامات الصادقین ص:۱۹، مندرجہ روحانی خزائن ج:۷ ص:۶۱)

الغرض کسی آیتِ شریفہ سے کسی ایسے نظریہ کا استنباط کرنا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات کے خلاف ہو، اس سے دو باتوں میں سے ایک بات لازم آتی ہے، یا تو

اس سے -نعوذ باللہ- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیل لازم آتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کا مطلب نہیں سمجھے۔ یا اپنی خام خیالیوں کو قرآنِ کریم میں ٹھونسنا لازم آتا ہے، جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”من قال فی القراٰن برأیه فلیتبوأ مقعده من النار!“ (مشکوٰۃ ص:۳۵)

ترجمہ:......”جس شخص نے اپنی رائے سے کوئی مفہوم قرآن میں ٹھونسا، اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے!“

ثانیاً:...... یہ آیتِ شریفہ، جس سے ان صاحب نے نظریۂ ارتقا کو حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق پر چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے، سورۂ نوح کی آیت ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کا وہ خطاب نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنی قوم کے کافروں سے فرمایا تھا۔ جو شخص معمولی غور و فکر سے بھی کام لے گا اس سے یہ بات مخفی نہیں رہے گی کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کے افراد کو ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی تعلیم و تلقین نہیں فرما رہے بلکہ ان لوگوں میں سے ایک ایک فرد کی تخلیق میں حق تعالیٰ شانہ نے اپنی قدرت کے جن عجائبات کا اظہار فرمایا ہے اس کو ذکر فرما رہے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے زمین کی مٹی سے غذائیں پیدا فرمائیں، ان غذاؤں سے اس قطرۂ آب کی تخلیق ہوئی جس سے تم پیدا ہوئے ہو، پھر اس قطرۂ آب کو شکمِ مادر میں مختلف شکلوں میں تبدیل کرکے اس میں روح ڈالی اور تم زندہ انسان بن گئے، پھر نفخِ روح کے بعد بھی شکمِ مادر میں زمین سے پیدا شدہ غذاؤں کے ذریعہ تمہارے نشو و نما کا عمل جاری رہا، یہاں تک کہ شکمِ مادر سے تمہاری پیدائش ہوئی اور پھر پیدائش کے بعد بھی تمہارے نشو و نما کا سلسلہ جاری رہا، اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے زمین کی مٹی اور اس سے پیدا شدہ غذاؤں کے ذریعہ کیا۔ الغرض ”واللہ انبتکم من الارض نباتا“ میں انسانی افراد کے اس طویل سلسلۂ نشو و نما کی جانب اشارہ فرمایا گیا ہے جس سے گزرتے ہوئے ہر انسان نشو و نما کے مدارج طے کرتا ہے، اس سلسلہ کی ابتداء مٹی سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا نشو و نما کی تکمیل پر۔ چنانچہ حضرت مفتی محمد

شفیع رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں ''خلاصۂ تفسیر'' کے عنوان سے اس آیتِ شریفہ کی حسبِ ذیل تفسیر فرمائی ہے، جو حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ کی ''بیان القرآن'' سے مأخوذ ہے:

> ''اور اللہ تعالیٰ نے تم کو زمین سے ایک خاص طور پر پیدا کیا، (یا تو اس طرح کہ حضرت آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے اور یا اس طرح کہ انسان نطفہ سے بنا، اور نطفہ غذا سے، اور غذا عناصر سے بنی اور عناصر میں غالب اجزاء مٹی کے ہیں۔''

(معارف القرآن ج:۸ ص:۵۶۲)

لہٰذا اس آیت شریفہ سے (یا دوسری آیاتِ کریمہ سے) ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو کشید کرنا اپنی عقل و فہم سے بھی زیادتی ہے اور قرآن کریم کے ساتھ بھی بے انصافی ہے۔

ان صاحب کے جو دلائل آپ نے ذکر کئے ہیں، ان کی علمی حیثیت واضح کرنے کے بعد اب میں آپ کے سوالات کے جواب عرض کرتا ہوں، چونکہ بحث طویل ہوگئی، اس لئے نمبروار آپ کا سوال نقل کرکے اس کے ساتھ مختصر سا جواب لکھوں گا۔

س......۱: کیا اس شخص کے مذکورہ بالا عقائد کو اہل سنت والجماعت کے عقائد کہا جاسکتا ہے؟

ج......اس شخص کے یہ عقائد اہل سنت والجماعت کے عقائد نہیں، ائمہ اہل سنت بالاجماع اسی کے قائل ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیقِ جسمانی کے بارے میں احادیثِ نبویہؐ میں بیان کیا گیا ہے، اس لئے اس شخص کا یہ نظریہ بدترین بدعت ہے۔

س......۲: حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق سے متعلق احادیث کے بارے میں اس شخص کا رویہ گستاخی اور گمراہی ہے؟

ج......حضرت آدم علیہ السلام کی جسمانی تخلیق سے متعلق واردشدہ احادیث کے بارے میں اس شخص کا رویہ بلاشبہ گستاخانہ ہے جس کی تفصیل اوپر عرض کرچکا ہوں اور یہ رویہ بلاشبہ گمراہی و کج روی کا ہے۔

س......۳: حضرت آدم علیہ السلام کو ''حیوان آدم'' کہنا گستاخی نہیں ہے؟

ج...... حضرت آدم علیہ السلام کو نصوصِ قطعیہ اور اجماعِ سلف کے علی الرغم ''حیوان آدم'' کہنا اور ان کا سلسلۂ نسب بندروں کے ساتھ ملانا ''اشرف المخلوقات'' حضرتِ انسان کی توہین ہے، اور یہ نہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کی شان میں گستاخی ہے، بلکہ ان کی نسل سے پیدا ہونے والے تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی بھی توہین و تنقیص ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام تمام انسانوں کے باپ ہیں، اب اگر کسی کے باپ کو ''جانور'' یا ''بندر'' کہا جائے تو سوچنا چاہئے کہ یہ گالی ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر کسی (مثلاً: انہی صاحب کو) ''جانور کی اولاد'' یا ''بندر کی اولاد'' کہا جائے تو یہ صاحب اس کو گالی سمجھیں گے یا نہیں؟ اور اس کو اپنی توہین و تنقیص تصور کریں گے یا نہیں؟

س...... ۴: کیا یہ شخص تفسیر بالرائے کا مرتکب نہیں؟

ج...... اوپر ذکر کرچکا ہوں کہ اپنے مزعومہ نظریہ پر قرآنِ کریم کی آیاتِ شریفہ کا ڈھالنا تفسیر بالرائے ہے اور یہ شخص، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی: ''فلیتبوأ مقعدہ من النار!'' کا مستحق ہے، یعنی اسے چاہئے کہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے۔

س...... ۵: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلافِ امت کا عقیدہ حضرت آدم علیہ السلام کے مٹی کے پُتلے بنائے جانے کا ہے یا نہیں؟

ج...... اوپر ذکر کرچکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ اور تمام سلف صالحین کا یہی عقیدہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا قالب مٹی سے بنایا گیا، پھر اس قالب میں روح ڈالی گئی تو وہ جیتے جاگتے انسان بن گئے، فلاسفہ طبیعیین نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ محض اٹکل مفروضے ہیں، جن کی حیثیت اوہام وظنون کے سوا کچھ نہیں، اور ظن و تخمین کی حق و تحقیق کے بازار میں کوئی قیمت نہیں، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ، اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ، وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا.'' (النجم:۲۸)

ترجمہ:...... ''اور ان کے پاس اس پر کوئی دلیل نہیں، صرف بے اصل خیالات پر چل رہے ہیں، اور یقیناً بے اصل

فہرست

خیالاتِ امرِ حق کے مقابلے میں ذرا بھی مفید نہیں ہوتے۔“

جو قومیں نورِ نبوت سے محروم ہیں، وہ اگر قبل از تاریخ کی تاریک وادیوں میں بھٹکتی ہیں تو بھٹکا کریں، اور ظن و تخمین کے گھوڑے دوڑاتی ہیں تو دوڑایا کریں، اہلِ ایمان کو ان کا پس خوردہ کھانے اور ان کی قے چاٹنے کی ضرورت نہیں! ان کے سامنے آفتابِ نبوت طلوع ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں دن کی روشنی میں کہتے ہیں، ان کو قرآن و سنت کی روشنی نے ظن و تخمین سے بے نیاز کردیا ہے۔

س……۶: اس شخص کی بیعت یا کسی قسم کا تعلق اس کے ساتھ آپ کے نزدیک کیسا ہے؟

ج……اوپر کی تفصیل سے واضح ہوچکا ہے کہ جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہی برحق ہے، اور اس شخص کا فلاسفہ کی تقلید میں ارشاداتِ نبویہؐ سے انحراف، اس کی کج روی و گمراہی کی دلیل ہے، اس لئے اس شخص کو لازم ہے کہ اپنے عقائد و نظریات سے توبہ کرکے رجوع الی الحق کرے اور ندامت کے ساتھ تجدیدِ ایمان کرے، اور کسی شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو، اس شخص کی ہم نوائی جائز نہیں، اگر کوئی مسلمان اس کی بیعت میں داخل ہے تو اس کے خیالات و نظریات کا علم ہوجانے کے بعد اس کی بیعت کا فسخ کردینا لازم ہے۔

ائمہ اربعہؒ کے حق پر ہونے کا مطلب

س……عرض یہ ہے کہ مسئلہ تقلید میں بندہ ایک عجیب مشکل کا شکار ہے۔ الحمدللہ میں حنفی سنی ہوں، کچھ عرصہ قبل مولانا مودودی کے ”مسلم اعتدال“ کے بارے میں پڑھتا رہا، ان کی رائے یہ ہے کہ جب چاروں امام حق پر ہیں، تو پھر ہم جس وقت جس کے مذہب پر چاہیں عمل کرلیں، کوئی نقصان نہ ہوگا۔ مثلاً: کبھی رفع یدین کرے، کبھی نہ کرے، کبھی امام کے پیچھے سورۃ پڑھے، کبھی نہ پڑھے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات واقعی متأثر کن ہے جس کے بعد درج ذیل سوالات میرے ذہن میں آئے ہیں:

۱:……چاروں امام کے حق پر ہونے کا کیا مطلب ہے؟ ایک امام کے نزدیک

امام کے پیچھے قراءت سختی سے منع ہے، جبکہ دوسرا امام اسے ضروری قرار دیتا ہے، اور نہ پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی، (اسی طرح کے اور دوسرے فرق ہیں جو آپ کے علم میں ہیں)۔

۲:...... اگر کوئی شخص کبھی کبھار چاروں اماموں کے مسلک پر عمل کرلے تو کیا حرج ہے؟

۳:...... چاروں اماموں کی باتوں پر عمل، کیا قرآن وحدیث پر عمل نہ ہوگا؟

۴:...... صرف امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کو ضروری سمجھ کر دوسروں کے مسلک پر عمل نہ کرنے کے کیا دلائل ہیں؟

۵:...... عقلی دلائل کے علاوہ چاروں مذہبوں پر عمل نہ کرنے کے شرعی دلائل کیا ہیں؟

۶:...... نیز تقلید کی اہمیت بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح کریں اور اہلِ حدیث حضرات جو تقلید کی وجہ سے ہم پر طعن کرتے ہیں، تو ان کی بات کہاں تک درست ہے؟ (آپ کی کتاب اختلافِ امت میں بھی غالباً ان سوالات کے مکمل یا تفصیلی جواب نہیں ہیں)۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ عورت اور مرد کی نماز میں جو فرق ہے تو قرآن وحدیث کے اس سلسلے میں کیا دلائل ہیں؟ کیونکہ اہلِ حدیث حضرات کی خواتین مردوں کی طرح نماز پڑھتی ہیں اور ہماری خواتین سے یہ لوگ دلیل مانگتے ہیں۔

ج...... چاروں اماموں کے برحق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اجتہادی مسائل میں ہر مجتہد اپنے اجتہاد پر عمل کرنے کا مکلّف ہے۔ چونکہ چاروں امام شرائطِ اجتہاد کے جامع تھے، اور انہوں نے انسانی طاقت کے مطابق مرادِ الٰہی کے پانے کی کوشش کی، اس لئے جس مجتہد کا اجتہاد جس نتیجہ تک پہنچا اس کے حق میں وہی حکمِ شرعی ہے، اور وہ من جانب اللہ اسی پر عمل کرنے کا مکلّف ہے۔ اب ایک مجتہد نے دلائلِ شرعیہ پر غور کرکے یہ سمجھا کہ امام کی اقتداء میں قراءت ممنوع ہے، لقولہ تعالیٰ: ”فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ“ ولقولہ علیہ السلام: ”واذا قرأ فانصتوا!“ وقولہ علیہ السلام: ”اذا امن القاری فامنوا!“ تو یہ مجتہد ان دلائلِ شرعیہ کے پیشِ نظر مجبور ہوگا کہ اس سے سختی کے ساتھ منع کرے۔

دوسرے مجتہد کی نظر اس پر گئی کہ نماز میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا ہر نمازی کے لئے ضروری ہے، خواہ امام ہو یا مقتدی، یا منفرد، تو یہ اپنے اجتہاد کے مطابق اس کے ضروری ہونے کا فتویٰ دے گا۔

الغرض ہر مجتہد اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرنے اور فتویٰ دینے کا مکلّف ہے، یہی مطلب ہے ہر امام کے برحق ہونے کا۔

۲:...... جو شخص شرائطِ اجتہاد کا جامع نہ ہو وہ اختلافی مسائل میں کسی ایک مجتہد کا دامن پکڑنے اور اس کے فتویٰ پر عمل کرنے کا مکلّف ہے، اسی کا نام تقلید ہے، پھر تقلید کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کبھی کسی امام کے فتویٰ پر عمل کرلیا، کبھی دوسرے امام کے فتویٰ پر، یا ایک مسئلے میں ایک امام کے فتویٰ کو لے لیا، اور دوسرے مسئلے میں دوسرے امام کے فتویٰ کو، لیکن آدمی کا نفس حیلہ جو ہے، اگر اس کی اجازت دے دی جائے تو عام لوگوں کے بارے میں اس کا احتمال غالب ہے کہ اپنے نفس کو جس مجتہد کا فتویٰ اچھا لگے گا، یا جو فتویٰ نفس کی خواہش کے مطابق ہوا کرے گا اس کو لے لیا کرے گا، اس صورت میں شریعت کی پیروی نہیں ہوگی بلکہ ہوائے نفس کی پیروی ہوگی، اس لئے عوام کو خواہشِ نفس کی پیروی سے بچانے اور انہیں شریعتِ خداوندی کا پابند کرنے کے لئے یہ قرار دیا گیا کہ کسی ایک امام کے پابند ہوجائیں۔

اور بعض صورتوں میں اس بے قیدی سے تلفیق لازم آئے گی، جس کی چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے وضو کی حالت میں عورت کو چھوا، یا اپنے عضوِ مستور کو ہاتھ لگایا، اس نے کہا کہ: میں اس مسئلے میں امام ابوحنیفہؒ کے قول کو لیتا ہوں - ان کے نزدیک ان چیزوں سے وضو نہیں ٹوٹتا - پھر اس کے بدن سے خون نکلا تو کہا کہ: میں اس مسئلے میں امام شافعیؒ کے قول کو لیتا ہوں کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ تو اس شخص کا وضو بالاجماع ٹوٹ گیا، مگر اس نے بزعمِ خود ایک مسئلے میں ایک امام کے اور دوسرے مسئلے میں دوسرے امام کے قول کو لے کر یہ سمجھا کہ اس کا وضو قائم ہے، ظاہر ہے کہ ایسی تلفیق شرعاً باطل ہے۔

البتہ بعض صورتوں میں اپنے امام مقتداء کے قول کو چھوڑ کر دوسرے امام کے قول

فہرست

کو لینا جائز اور بعض اوقات بہتر ہے، مثلاً: دوسرے امام کے قول میں احتیاط زیادہ ہے اور یہ شخص کمالِ احتیاط کی بنا پر دوسرے امام کے فتویٰ پر عمل کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال ابھی گزر چکی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مسِ مرأۃ اور مسِ ذکر ناقضِ وضو نہیں، دوسرے ائمہ کے نزدیک ناقض ہے، تو کوئی حنفی بہ تقاضائے احتیاط اپنے عمل کے لئے دوسرے ائمہ کے قول کو لے تو یہ ورع وتقویٰ کی بات ہے۔ یا امام شافعیؒ کے نزدیک خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اگر کوئی شافعی المذہب اس مسئلے میں حنفیہ کے فتویٰ پر عمل کرے تو یہ ورع وتقویٰ کی بات ہے۔ لیکن جس مسئلے میں دوسرے امام کے قول پر عمل کرنے میں اپنے امام کی مخالفت لازم آتی ہے، وہاں دوسرے کے قول پر عمل کرنا خلافِ احتیاط ہوگا۔ مثلاً: کوئی شخص فاتحہ خلف الامام کے مسئلے میں امام شافعیؒ کے قول پر عمل کرتا ہے تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ مکروہِ تحریمی بلکہ حرام کا مرتکب ہوگا، ایسی حالت میں امام ابوحنیفہؒ کے مذہب پر عمل کرنے والے کے لئے امام شافعیؒ کے فتویٰ پر عمل کرنا احتیاط نہیں، بلکہ ارتکابِ حرام کا اندیشہ ہے جو ظاہر ہے کہ خلافِ احتیاط ہے۔

اور اسی احتیاط کی ایک نوع یہ ہے کہ ایک شخص اگرچہ درجہ اجتہاد پر فائز نہیں لیکن قرآن وحدیث کے نصوص میں اچھی دسترس رکھتا ہے، شریعت کے اصول ومقاصد اور مبادی پر نظر رکھتا ہے، احکام کے علل واسباب کی معرفت میں اس کو فی الجملہ حذاقت ومہارت حاصل ہے، اس کا دل اپنے امامِ مقتداء کے کسی مسئلہ پر مطمئن نہیں ہوتا بلکہ اس کے مقابلے میں دوسرے امامِ مجتہد کا فتویٰ اسے اقرب الی الکتاب والسنۃ نظر آتا ہے، ایسے شخص کے لئے اس مسئلے میں دوسرے امام کی تقلید کرلینا روا ہوگا، مگر شرط یہ ہے کہ اس دوسرے امامِ مجتہد کے فتویٰ کے تمام شروط وقیود کا لحاظ رکھے، ورنہ وہی تلفیق لازم آئے گی جس کا حرام بالاجماع ہونا اوپر آچکا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ تفقہ اور اجتہاد بڑی ہی نازک اور دقیق ولطیف چیز ہے، ہم ایسے عامیوں کو اس کا ٹھیک ٹھیک سمجھنا بھی مشکل ہے، لہٰذا ہمارے لئے دین وایمان کی سلامتی اور خودرائی وکج روی سے حفاظت اسی میں ہے کہ ''یک در گیر محکم گیر'' پر عمل کریں۔ اور یہ جو آپ نے فرمایا کہ: ''کبھی رفع یدین کرلیا، کبھی نہ کیا، کبھی امام کے پیچھے

قراءت کی، کبھی نہ کی'' ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو کبھی یکسوئی نصیب نہ ہوگی، بلکہ ہمیشہ متحیر و متردد رہے گا کہ یہ صحیح ہے یا وہ؟ ''پھر کبھی کیا، کبھی نہ کیا'' کا کوئی معیار تو اس کے ذہن میں ہونا چاہئے کہ کبھی کرنے کی وجہ کیا تھی؟ اور کبھی نہ کرنے کا باعث کیا ہوا؟ کرید کر دیکھا جائے تو اس کا سبب بھی وہی تردد و تحیر نکلے گا، اور کبھی دل کی چاہت۔ جبکہ یہ طے شدہ بات ہے کہ چاروں امام اپنے اجتہاد کے مطابق برحق ہیں تو کیوں نہ ''یک در گیر محکم گیر'' پر عمل کیا جائے؟

۳:...... اختلافی مسائل میں بیک وقت سب پر عمل کرنا تو بعض صورتوں میں ممکن ہی نہیں کہ ایک قول کو لے کر دوسرے کو بہرحال چھوڑنا پڑے گا، اور اگر چاروں کے اقوال پر عمل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ جس مسئلے میں جس کے قول پر چاہا عمل کرلیا یا جب جی چاہا ایک ہی مسئلے میں ایک کے قول پر عمل کرلیا اور جب جی چاہا دوسرے کے قول پر، تو اس کے بارے میں اوپر عرض کرچکا ہوں، بلاشبہ چاروں اماموں کا عمل قرآن و حدیث ہی پر ہے، گو مدارکِ اجتہاد مختلف ہیں، لہٰذا کسی ایک کی باتوں کو عمل کے لئے اختیار کرلینا بھی قرآن و حدیث پر ہی عمل کرنا ہے۔

۴:...... کسی ایک امام کی اقتداء کو لازم پکڑنا (خواہ وہ امام ابوحنیفہؒ ہوں یا امام مالکؒ یا امام شافعیؒ یا امام احمدؒ) اس کی ضرورت تو اوپر عرض کرچکا ہوں کہ تشہی اور تلفیق سے دین کی حفاظت ہم عامیوں کے لئے اسی میں ہے۔ یہ دلیل تو تمام ائمہؒ کی تقلیدِ شخصی کی ہے، اس میں امام ابوحنیفہؒ کی تخصیص نہیں، مگر یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ جس امامِ مجتہد کی پیروی کی جائے اس کے اصول و فروع، راجح مرجوح، قوی وضعیف کا علم ہونا ضروری ہے، پاک و ہند اور افغانستان سے لے کر مشرقِ بعید تک امام ابوحنیفہؒ کا مذہب عام طور سے رائج رہا، اور ان ممالک میں فقہ حنفی کی کتابوں کا ذخیرہ اور اس مذہب کے ماہرین بہ کثرت رہے، جن سے رجوع کرنا ہر شخص کے لئے آسان تھا، دوسرے ائمہ کے مذاہب کا رواج ان علاقوں میں نہیں تھا، اس لئے ان علاقوں میں امام ابوحنیفہؒ کی تقلید رائج ہوئی، جیسا کہ بلادِ مغرب میں مالکی مذہب کا عام چرچا رہا، اور دوسرے مذاہب کا رواج وہاں شاذ و نادر کے حکم میں رہا، اس لئے ان علاقوں میں امام مالکؒ کی تقلید متعین ہوگئی۔ الغرض ہمارے علاقوں میں امام ابوحنیفہؒ

کی تقلید اس بنا پر ضروری قرار پائی کہ یہاں فقہ حنفی کے ماہرین موجود رہے، اور بلادِ مغرب میں فقہ مالکی کی تقلید ضروری ٹھہری کہ وہاں اس کے ماہرین موجود تھے، جہاں دوسری فقہ کے ماہرین ہی موجود نہ ہوں وہاں دوسری فقہ پر عمل کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اور اس پر عمل کیسے ممکن ہے؟

۵:...... گزشتہ بالا نکات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس سوال کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، اس لئے کہ مطلق تقلید یا تقلیدِ شخصی محض عقلی چیز نہیں، بلکہ شریعتِ مطہرہ کی تعمیل کی عملی شکل ہے، اور جو دلائل شریعت کی پیروی کے ہیں وہی ایک عامی کے لئے کسی امامِ مجتہد کی اقتداء کے مثبت ہیں۔ اور آیتِ شریفہ: ''فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ'' (النحل:۴۳) اور حدیثِ نبویؐ: ''قتلوہ، قتلھم اللہ، الا سئلوا اذا لم یعلموا، فانما شفاء العیّ السؤال'' (مشکوٰۃ ص:۵۵، بروایت ابی داؤد عن جابرؓ، وابن ماجہ عن ابن عباسؓ) میں اسی کا ضروری ہونا ذکر فرمایا گیا ہے۔

۶:...... تقلید کی اہمیت قرآن وحدیث کی روشنی میں اوپر واضح ہوچکی ہے، اور سچی بات تو یہ ہے کہ جو حضرات تقلید کی بنا پر ہم ضعفا پر طعن کرتے ہیں، تقلید سے ان کو بھی مفر نہیں، کیونکہ ایک عامی آدمی جو قرآن وحدیث کے فہم میں مرتبۂ اجتہاد پر فائز نہیں، لامحالہ وہ کسی کی مان کر ہی چلے گا، اور مختلف فیہ مسائل میں کسی نہ کسی امامِ مجتہد کی تحقیق پر اعتماد کرنا اس کے لئے ناگزیر ہوگا، مگر ہم ضعفا میں اور ان حضرات میں چند وجوہ سے فرق ہے:

اول:...... یہ کہ ہم ایک امامِ مجتہد کی تحقیق پر عمل کرتے ہیں، جس کی امامت اور درجۂ اجتہاد پر اس کا فائز ہونا تمام اکابرِ امت کو مسلّم ہے (اس کا خلاصہ میں اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم میں قلم بند کرچکا ہوں)، اس کے باوجود ہم دوسرے اکابر ائمہ اور ان کے متبعین کے بارے میں زبانِ طعن دراز نہیں کرتے، بلکہ ان کے حق میں ان کے اجتہاد کو واجب العمل جانتے ہیں۔ اور یہ حضرات اپنے سوا باقی سب کو باطل پرست جانتے ہیں، ان پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں، گویا ان حضرات کے نزدیک عمل بالحدیث کا تقاضا پورا نہیں ہوتا جب تک مقبولانِ الٰہی کی پوستین دری نہ کی جائے اور ان پر گمراہی و باطل پرستی کا فتویٰ

فہرست

صادر نہ کیا جائے...!

دوم:...... یہ کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کی تحقیق پر عمل پیرا ہیں، جنھوں نے صحابہ کرامؓ کا زمانہ پایا اور صحابہؓ و تابعینؒ کو دین پر عمل کرتے ہوئے بچشم خود دیکھا۔ اور یہ حضرات اکثر و بیشتر امام بخاریؒ یا شیخ ابن تیمیہؒ کی تحقیق کو اَولیٰ و راجح سمجھتے ہیں، اور کبھی ان کو بھی چھوڑ کر حافظ ابن حزمؒ کی تحقیقات کو سرمۂ چشم بصیرت سمجھتے ہیں، اب یہ حضرات ہی انصاف فرمائیں کہ صحابہؓ و تابعینؒ کے دور میں (جس کو حدیث شریف میں خیرالقرون فرمایا گیا ہے) دین پر بہتر عمل ہو رہا تھا یا مؤخرالذکر اکابرؒ کے زمانے میں؟

سوم:...... یہ کہ ہم لوگوں کو اپنے عامی ہونے کا اعتراف ہے، اس لئے کسی امامِ مجتہد کی اقتداء دین کی پیروی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ حضرات اس کے باوجود کہ ایک آیت یا حدیث کا ترجمہ کرنے کے لئے بھی اردو تراجم کے محتاج ہیں، اپنے آپ کو عامی ماننے میں عار سمجھتے ہیں اور اپنے کو ائمہ مجتہدینؒ کے ہم پلہ بلکہ ان سے بھی بالاتر سمجھتے ہیں!

بہرحال اہل حدیث حضرات اگر ہم عامیوں پر اس لئے طعن کرتے ہیں کہ ہم اپنے جہل کا اعتراف کرتے ہوئے کسی عالم ربانی اور عالم حقانی کی پیروی کو اتباعِ شریعت کے لئے کیوں ضروری سمجھتے ہیں؟ تو ہم ان کی طعن و تشنیع سے بدمزہ نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ ان کے علم و اجتہاد میں برکت فرمائیں، ہم لوگ بھی انشاء اللہ! اکابر ائمہؒ کی اقتداء کرتے ہوئے جنت میں پہنچ ہی جائیں گے۔

وہاں پہنچ کر انشاء اللہ! ان طعن کرنے والے حضرات کو بھی کھل جائے گا کہ ان کے طعن و تشنیع کی کیا قیمت تھی...؟

۷:...... عورت کی نماز کے بارے میں ''اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم'' حصہ دوم کے مسئلہ نمبر:۴ میں ضروری تفصیل لکھ چکا ہوں، وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے، مگر یہاں ایک نکتہ کا مزید اضافہ کروں گا:

میں نے وہاں تین روایات ذکر کی ہیں، دو مرفوع، ایک خلیفہ راشد حضرت علیؓ کا

قول۔ نیز میں نے وہاں یہ بھی ذکر کیا کہ قریب قریب تمام ائمہ اور فقہائے امت، مرد و عورت کی نماز میں (بعض مسائل میں) فرق کے قائل ہیں، جن کی تفصیل ان کی کتبِ فقہیہ سے معلوم ہوسکتی ہے۔

اہل حدیث حضرات جو نماز کے مسائل میں مرد و زن کی تفریق کے قائل نہیں، وہ عموماً احادیث کے عموم سے استدلال کرتے ہیں، جن میں فرمایا گیا ہے کہ رکوع اس طرح کیا جائے، سجدہ یوں کیا جائے اور قعدہ یوں کیا جائے۔ ان حضرات نے ان احادیث کو مرد و عورت کے لئے عام سمجھا اور جن احادیث کا میں نے اوپر حوالہ دیا ان کو ضعیف قرار دے کر مسترد کردیا۔ حالانکہ اگر ان حضرات نے غور فرمایا ہوتا تو انہیں یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ چاروں اماموں نے مرد و عورت کی نماز میں بعض مسائل میں جو تفریق فرمائی ہے اس کا منشا ستر ہے، جس کی طرف میں ''اختلافِ امت'' میں اشارہ کرچکا ہوں، اور یہ منشا خود احادیثِ صحیحہ میں مصرح ہے، چنانچہ مردوں کے لئے جمعہ اور جماعت کی حاضری کو لازم قرار دیا گیا ہے، لیکن عورتوں کے لئے اسی تستر کی بنا پر ان کا وجوب ساقط کردیا گیا، اور ان کے حق میں: ''وبیوتھن خیر لھن'' (مشکوٰۃ ص۹۶) فرمایا گیا، اس لئے جن احادیث میں دونوں کی نماز میں تفریق کا مضمون وارد ہوا ہے وہ اگر ضعیف بھی ہوں تب بھی وہ عمومات کے مقابلے میں لائق ترجیح ہوں گی، کیونکہ عورت کا عورت ہونا خود اس کے تستر کو چاہتا ہے، پھر ائمہ مجتہدینؒ کا بالاتفاق فیصلہ بھی اسی کا مؤید ہے، امام بخاریؒ نے تعلیقاً ام الدرداء رضی اللہ عنہا کا اثر نقل کیا ہے کہ وہ مردوں کی طرح بیٹھتی تھیں اور وہ فقیہہ تھیں۔ (ج:۱ ص:۱۱۴)

حافظ ابن حجرؒ کی تحقیق یہ ہے کہ: ''یہ ام الدرداء صغریٰ ہیں جو تابعیہ ہیں، اور تابعی کا مجرد عمل خواہ اس کے مخالف موجود نہ ہو حجت نہیں۔''

اس کے مقابلے میں مسند امام ابی حنیفہؒ کی روایت ہے کہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں کس طرح نماز پڑھا کرتی تھیں؟ فرمایا: پہلے چار زانو بیٹھتی تھیں، پھر انہیں حکم دیا گیا کہ سمٹ کر بیٹھا کریں۔'' (لامع الدراری ج:۱ ص:۳۳۱)

ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی خواتین کا عمل جو حکمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماتحت تھا، ام الدرداء صغریٰ تابعیہ کے عمل سے اَولیٰ اور انسب ہوگا، اور چونکہ اس حکم اور عمل کا منشا وہی تستر تھا، اس لئے اس علت سے مردوں اور عورتوں کی نماز میں تفریق دوسری جزئیات میں بھی ثابت ہوجائے گی، جو مذکورہ بالا احادیث میں مصرح ہیں، اور ائمہ اربعہ کے درمیان متفق علیہا بھی ہیں۔ وباللہ التوفیق، واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم!

انبیائے کرامؑ کے فضلات کی پاکی کا مسئلہ

س…… ہماری مسجد میں گزشتہ جمعہ میں ایک خطیب صاحب نے اپنے وعظ میں یہ فرمایا تھا کہ: ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک برتن میں پیشاب کرکے ایک صحابی کو دیا کہ اس کو باہر پھینک آؤ، ان صحابی نے باہر جاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت کے جذبے میں وہ پیشاب پی لیا، اس کے بعد تمام زندگی ان کے جسم سے خوشبو آتی رہی۔ اس کے بعد خطیب صاحب نے فرمایا: چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بول و براز پاک تھا، اس میں عام انسانوں کی طرح ناپاکی یا بدبو نہ تھی، لہٰذا صحابی کے اس عمل پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔

خطیب صاحب کے اس بیان پر مسجد میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، اکثر لوگوں نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ واقعہ سند سے خالی ہے، ایسے خطیب کی امامت جائز نہیں جو خلافِ سند واقعات بیان کرکے غیرمسلموں کو اسلام پر تنقید کا موقع دے۔ لوگوں کے اعتراضات مندرجہ ذیل تھے:

۱:…… ایسا کوئی واقعہ مستند کتب میں نہیں ملتا۔

۲:…… اگر ایسا ہوا بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں بشریت کی کوئی خصوصیت نہ تھی اور وہ مکمل نوری تھے۔

۳:…… اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی کو پیشاب پھینکنے کا حکم دیا تھا تو صحابی کے لئے حکم زیادہ اہمیت رکھتا تھا یا محبت کے جذبات؟

۴:…… دوسرے مذاہب کے لوگوں پر پیشاب پینے کا اعتراض کیونکر کیا جاسکتا

فہرست

ہے؟ جبکہ وہ بھی عقیدہ رکھتے ہوں کہ ان کے اوتاروں میں بھی ایسے ہی کچھ صفات تھے، وغیرہ وغیرہ۔

مولانا صاحب! آپ اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالنا گوارا کریں گے تاکہ لوگوں کو تسلی ہوسکے، کیونکہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام فطرت کے مطابق ہے، اور پیشاب والا معاملہ انسان کی نظر میں خلافِ فطرت ہے، ہم اپنے مذہب کی اشاعت میں غیرمسلموں کو کیسے قائل کرسکتے ہیں؟

ج...... لوگوں کے چار اعتراض جو آپ نے نقل کئے ہیں، ان میں پہلا اعتراض اصل ہے، یعنی یہ کہ یہ واقعہ مستند ہے یا نہیں؟ دوسرے سوالات سب اس کی فرع ہیں، کیونکہ اگر کوئی واقعہ ہی ایسا نہ ہو تو پھر یہ سوالات متوجہ نہیں ہوتے۔

اس واقعہ کو تسلیم کرنے کے بعد مسلمانوں کے ذہن میں سوالات کا پیدا ہونا ضعفِ ایمان، ضعفِ محبت اور ضعفِ علم کی وجہ سے ہے، کیونکہ محبت میں سوالات پیدا نہیں ہوا کرتے، اور اگر صحیح علم ہوتا تو یہ توجیہ کرسکتے تھے کہ ممکن ہے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہو کہ آپؐ کے فضلات کا نجس نہ ہونا عام انسانوں سے آپؐ کی امتیازی خصوصیت کی دلیل ہے۔ یہ دوسرے سوال کی توجیہ ہوسکتی تھی۔

تیسرے سوال کی توجیہ یہ ہوسکتی تھی کہ کبھی کبھی جذبۂ محبت غالب آجاتا ہے، اور آدمی اس میں معذور سمجھا جاتا ہے، جیسے صلح نامہ حدیبیہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا تھا کہ: ''محمد رسول اللہ'' کے لفظ کو مٹادو! انہوں نے عرض کردیا کہ: میں آپ کے نامِ پاک کو نہیں مٹاسکتا! یہ بات انہوں نے حکمِ صریح کے مقابلے میں غلبۂ محبت کی وجہ سے فرمائی تھی، اس لئے اس پر ان کو کوئی عتاب نہیں فرمایا گیا۔

چوتھے سوال کی یہ توجیہ ہوسکتی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ پیشاب نوشی کا حکم فرمایا، نہ اس کا قانون بنایا، البتہ ایک مغلوب المحبت کو معذور سمجھا، اب عام لوگوں کے پیشاب پینے کا جواز اس سے کیسے نکل آیا؟

الغرض ضرورت اس بات کی تھی کہ پہلے یہ معلوم کیا جاتا کہ یہ واقعہ ہے بھی یا

نہیں؟ پھر یہ معلوم کیا جاتا کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کا بھی وہی حکم ہے جو ہم ایسے ناپاک لوگوں کے بول و براز کا ہے؟ یا اس سلسلے میں آپ کی کچھ خصوصیات بھی ہیں؟ اس بارے میں علمائے ربانی کی تحقیق کیا ہے؟ اور امام ابوحنیفہؒ و شافعیؒ اور ان کے اکابر متبعین کیا فرماتے ہیں؟ پھر یہ معلوم کیا جاتا کہ ایک حکم سب کے لئے یکساں ہوتا ہے؟ یا بعض اوقات موقع و محل کی خصوصیت سے حکم مختلف بھی ہوسکتا ہے؟

جن مولانا صاحب نے ناواقف اور بے سمجھ عوام کے سامنے بغیر تشریح کے یہ واقعہ بیان کردیا، انہوں نے بھی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا، اور جنہوں نے یہ واقعہ سنتے ہی اعتراضات کی بوچھاڑ کردی اور مسئلہ کی نوعیت معلوم کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، انہوں نے بھی کچھ فہم و دانش کا ثبوت نہیں دیا، واللہ اعلم!

سائل کا دُوسرا خط

''جناب مولانا محمد یوسف صاحب لدھیانوی... السلام علیکم۔

محترم! میرے مکتوب کا جواب تو موصول ہوگیا لیکن نامکمل سا ظاہر ہو رہا ہے۔ اصل سوال کا جواب اپنی جگہ قائم ہے۔ یعنی جو واقعہ محترم خطیب صاحب نے بیان کیا تھا اس کا حوالہ کسی مستند راوی یا کتاب کا درکار تھا۔ میں نے چند معترضین کو آپ کا جواب دکھایا تو وہی سوال کیا گیا کہ اس کتاب اور مصنف کا نام بتایا جائے جس میں اس کا ذکر کیا گیا ہے، بلکہ ایک صاحب نے تو یہ بھی فرمایا کہ: ایک مرتبہ کسی جلسے میں مولانا محمد شفیع اوکاڑوی نے بھی اس واقعہ کا ذکر کیا تھا، لیکن جب ان سے اس کی سند مانگی گئی تو وہ بھی نہ دے سکے، بلکہ سند مانگنے والے پر ایمان کی کمزوری کا فتویٰ صادر کرکے لعنت و ملامت کرنے لگے، جیسا کہ آپ نے اپنے جواب میں فرمایا، یعنی: ''اس واقعہ کو تسلیم کرنے کے بعد مسلمانوں کے ذہن میں سوالات کا پیدا ہونا ضعفِ ایمان، ضعفِ محبت اور ضعفِ علم کی وجہ سے ہے۔''

اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جو عالم یا خطیب کوئی بھی واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرکے بغیر کسی حوالے کے بیان کردے اس کو صدقِ دل سے تسلیم کرلیا جائے ورنہ ضعفِ ایمان کا فتویٰ لگ جائے گا۔ اس طرح تو کچھ علماء (جن کو ہم علماءِ سوء ہی کہہ سکتے

ہیں) بہت سے اپنے مطلب کے واقعات بیان کر کے لوگوں کو گمراہ کر سکتے ہیں اور آپ اس کو بھی تسلیم کریں گے کہ علماءِ سوء (جو بظاہر عالم ہی ہوتے ہیں) کو عام آدمی شناخت نہیں کرسکتا، اس کی پکڑ تو اسی وقت ہوسکتی ہے جب وہ واقعات کے ساتھ مستند حوالہ بھی دے۔

ہمیں یہ تسلیم ہے بلکہ ہمارا ایمان ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء اور بشر میں افضل تر ہیں، ان کے ساتھ خصوصیات بھی تسلیم کرنا ایمان کا تقاضا ہے، لیکن اس کا کیا جائے کہ آج کا دور مادّیت اور سائنس کا دور ہے، عوام کی اکثریت خاص طور پر مغربی افکار سے متأثر ہے، ان کو مطمئن کرنے کے لئے جہاں تک ممکن ہوسکے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہئے، لہٰذا اگر مندرجہ ذیل سوالات کے جواب دے سکیں تو لوگوں کی تسلی ہوسکتی ہے:

۱:......اس واقعہ کا ذکر جس کتاب میں ہے اس کا اور اس کے مصنف کا نام۔

۲:......صحابی مذکور کے عمل پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات۔

۳:......دوسرے صحابہ کرامؓ پر واقعہ کے اثرات (جبکہ یہ معلوم ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بول و براز نہ صرف پاک ہیں بلکہ خوشبو کے حامل ہیں) اور یہ بھی معلوم ہے کہ صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز سے اپنی جانوں سے زیادہ محبت کرتے تھے، یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لعابِ دہن اور وضو کے پانی کو بھی اپنے چہروں پر مل لیا کرتے تھے۔''

ج...... میری گزشتہ تحریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اول تو معلوم کیا جائے کہ یہ واقعہ کسی مستند کتاب میں موجود ہے یا نہیں؟ دوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کے بارے میں اہلِ علم و اکابر ائمہ دین کی تحقیق کیا ہے؟ ان دو باتوں کی تحقیق کے بعد جو شبہات پیش آسکتے ہیں ان کی توجیہ ہوسکتی ہے، اب ان دونوں نکتوں کی وضاحت کرتا ہوں۔

امرِ اوّل:...... یہ ہے کہ یہ واقعہ کسی مستند کتاب میں ہے یا نہیں؟ حافظ جلال الدین سیوطیؒ کی کتاب ''خصائص کبریٰ'' میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیازی خصوصیات جمع کی گئی ہیں۔ اس کی دوسری جلد کے صفحہ:۲۵۲ کا فوٹو آپ کو بھیج رہا ہوں، جس کا عنوان ہے: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیات کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا

بول و براز پاک تھا''، اس عنوان کے تحت انہوں نے احادیث نقل کی ہیں، ان میں سے دو احادیث -جن کو میں نے نشان زد کردیا ہے- کو مع ترجمہ نقل کرتا ہوں:

۱:...... ''واخرج ابویعلیٰ والحاکم والدارقطنی والطبرانی وابونعیم عن ام ایمن قالت: قام النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اللیل الیٰ فخارة فبال فیھا، فقمت من اللیل وانا عطشانة فشربت ما فیھا، فلما اصبح اخبرتہ، فضحک وقال: اما انک لا یتجعن بطنک ابدا! ولفظ ابی یعلیٰ: انک لن تشتکی بطنک بعد یومک ھذا ابدا!''

ترجمہ:...... ''ابویعلیٰ، حاکم، دارقطنی، طبرانی اور ابونعیم رحمہم اللہ نے سند کے ساتھ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت مٹی کے پکے ہوئے ایک برتن میں پیشاب کیا، پس میں رات کو اُٹھی، مجھے پیاس تھی، میں نے وہ پیالہ پی لیا۔ صبح ہوئی تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: تجھے پیٹ کی تکلیف کبھی نہ ہوگی! اور ابویعلیٰ کی روایت میں ہے کہ: آج کے بعد تم پیٹ کی تکلیف کی شکایت نہ کروگی!''

۲:...... ''واخرج الطبرانی والبیھقی بسند صحیح عن حکیمة بنت امیمة عن امھا قالت: کان للنبی صلی اللہ علیہ وسلم قدح من عیدان یبول فیہ ویضعہ تحت سریرہ، فقام فطلبہ فلم یجدہ فسأل عنہ فقال: این القدح؟ قالوا: شربتہ برة خادمة ام سلمة التی قدمت معھا من ارض الحبشة. فقال النبی صلی اللہ علیہ

وسلم: لقد احتظرت من النار بحظار!“

ترجمہ:......”طبرانی اور بیہقی نے بہ سند صحیح حکیمہ بنت امیمہ سے اور انہوں نے اپنی والدہ حضرت امیمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں لکڑی کا ایک پیالہ رکھا رہتا تھا، جس میں شب کو گاہ و بے گاہ پیشاب کرلیا کرتے تھے، اور اسے اپنی چارپائی کے نیچے رکھ دیتے تھے، آپ ایک مرتبہ (صبح) اُٹھے، اس کو تلاش کیا تو وہاں نہیں ملا، اس کے بارے میں دریافت فرمایا، تو بتایا گیا کہ اس کو برہ نامی حضرت ام سلمہؓ کی خادمہ نے نوش کرلیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس نے آگ سے بچاؤ کے لئے حصار بنالیا۔“

یہ دونوں روایتیں مستند ہیں، اور محدثین کی ایک بڑی جماعت نے ان کی تخریج کی ہے، اور اکابرِ امت نے ان واقعات کو بلانکیر نقل کیا ہے، اور انہیں خصائصِ نبویؐ میں شمار کیا ہے۔

امر دوم:......آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کے بارے میں اکابرِ امت کی تحقیق:

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ”فتح الباری“ باب الماء الذی یغسل بہ شعر الانسان (ج:۱ ص:۲۷۲ مطبوعہ لاہور) میں لکھتے ہیں:

”وقد تکاثرت الادلة علیٰ طهارة فضلائه وعد الائمة ذالک من خصائصه فلا یلتفت الیٰ ما وقع فی کتب کثیر من الشافعیة مما یخالف ذالک، فقد استقر الامر بین ائمتهم علی القول بالطهارة.“

ترجمہ:......”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کے پاک ہونے کے دلائل حدِ کثرت کو پہنچے ہوئے ہیں، اور ائمہ نے اس

فہرست

کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں شمار کیا ہے، پس بہت سے شافعیہ کی کتابوں میں جو اس کے خلاف پایا جاتا ہے، وہ لائقِ التفات نہیں، کیونکہ ان کے ائمہ کے درمیان طہارت کے قول ہی پر معاملہ آن ٹھہرا ہے۔“

۱:......حافظ بدر الدین عینی رحمہ اللہ نے عمدۃ القاری (ج:۲ ص:۳۵ مطبوعہ دارالفکر بیروت) میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کی طہارت کو دلائل سے ثابت کیا ہے، اور شافعیہ میں سے جو لوگ اس کے خلاف کے قائل ہیں ان پر بلیغ ردّ کیا ہے، اور ج:۱ صفحہ:۷۹ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بول اور باقی فضلات کی طہارت کا قول نقل کیا ہے۔

۲:......امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مہذب (ج:۱ ص:۲۳۳) میں بول اور دیگر فضلات کے بارے میں شافعیہ کے دونوں قول نقل کرکے طہارت کے قول کو مرّوجہ قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

”حدیث شرب المرأة البول صحیح رواہ الدارقطنی وقال ھو حدیث صحیح وھو کان فی الاحتجاج لکل الفضلات قیاسًا.“

ترجمہ:......”عورت کے پیشاب پینے کا واقعہ صحیح ہے، امام دارقطنی نے اس کو روایت کرکے صحیح کہا ہے، اور یہ حدیث تمام فضلات کی طہارت کے استدلال کے لئے کافی ہے۔“

علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے ہیں:

”صحح بعض ائمة الشافعیة طھارة بولہ صلی اللہ علیہ وسلم وسائر فضلاتہ وبہ قال ابو حنیفة کما نقلہ فی المواھب اللدنیة عن شرح البخاری للعینی.“

(رد المحتار ج:۱ ص:۳۱۸ مطبوعہ کراچی)

ترجمہ:...... ”بعض ائمہ شافعیہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بول اور باقی فضلات کی طہارت کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ بھی اسی کے قائل ہیں جیسا کہ مواہب لدنیہ میں علامہ عینیؒ کی شرح بخاری سے نقل کیا ہے۔“

مُلّا علی قاریؒ جمع الوسائل شرح الشمائل (ج:۲ ص:۲ مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ھ) میں اس پر طویل کلام کے بعد لکھتے ہیں:

”قال ابن حجر: وبهذا استدل جمع من ائمتنا المتقدمين وغيرهم علىٰ طهارة فضلاته صلى الله عليه وسلم، وهو المختار، وفاقاً لجمع من المتأخرين فقد تكاثرت الادلة عليه وعده الائمة من خصائصه صلى الله عليه وسلم.“

ترجمہ:...... ”ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ: ہمارے ائمہ متقدمین کی ایک جماعت اور دیگر حضرات نے احادیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضلات کی طہارت پر استدلال کیا ہے، متأخرین کی جماعت کی موافقت میں بھی یہی مختار ہے، کیونکہ اس پر دلائل بہ کثرت ہیں اور ائمہ نے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں شمار کیا ہے۔“

امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں:

”ثم مسألة طهارة فضلات الانبياء توجد فى كتب المذاهب الاربعة.“ (فیض الباری ج:۱ ص:۲۵۰)

ترجمہ:...... ”فضلاتِ انبیاء کی طہارت کا مسئلہ مذاہبِ اربعہ کی کتابوں میں موجود ہے۔“

محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری نور اللہ مرقدہٗ لکھتے ہیں:

”وقد صرح اهل المذاهب الاربعة بطهارة فضلات الانبیاء .... الخ.“ (معارف السنن ج:۱ ص:۹۸)

ترجمہ:......”مذاہبِ اربعہ کے حضرات نے فضلاتِ انبیاء کے پاک ہونے کی تصریح کی ہے۔“

الحمدللہ! ان دونوں نکتوں کی وضاحت تو بقدرِ ضرورت ہوچکی، یہ واقعہ مستند ہے اور مذاہبِ اربعہ کے ائمہ فقہاء نے ان احادیث کو تسلیم کرتے ہوئے فضلاتِ انبیاء علیہم السلام کی طہارت کا قول نقل کیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر اعتراض کیا جائے تو اس کو ضعفِ ایمان ہی کہا جاسکتا ہے!

اب ایک نکتہ محض تبرعاً لکھتا ہوں، جس سے یہ مسئلہ قریب الفہم ہوجائے گا۔ حق تعالیٰ شانہ کے اپنی مخلوق میں عجائبات ہیں، جن کا ادراک بھی ہم لوگوں کے لئے مشکل ہے، اس نے اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ سے بعض اجسام میں ایسی محیر العقول خصوصیات رکھی ہیں جو دوسرے اجسام میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ ایک کیڑے کے لعاب سے ریشم پیدا کرتا ہے، شہد کی مکھی کے فضلات سے شہد جیسی نعمت ایجاد کرتا ہے، اور پہاڑی بکرے کے خون کو نافہ میں جمع کرکے مشک بنادیتا ہے۔ اگر اس نے اپنی قدرت سے حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسامِ مقدسہ میں بھی ایسی خصوصیات رکھی ہوں کہ غذا ان کے ابدانِ طیبہ میں تحلیل ہونے کے بعد بھی نجس نہ ہو، بلکہ اس سے جو فضلات ان کے ابدان میں پیدا ہوں وہ پاک ہوں تو کچھ جائے تعجب نہیں۔ اہل جنت کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ کھانے پینے کے بعد ان کو بول و براز کی ضرورت نہ ہوگی، خوشبودار ڈکار سے سب کا کھایا پیا ہضم ہوجائے گا، اور بدن کے فضلات خوشبودار پسینے میں تحلیل ہوجائیں گے۔ جو خصوصیت کہ اہل جنت کے اجسام کو وہاں حاصل ہوگی، اگر حق تعالیٰ شانہ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات کے پاک اجسام کو وہ خاصیت دنیا ہی میں عطا کردیں تو بجا ہے، پھر جبکہ احادیث میں اس کے دلائل بہ کثرت موجود ہیں، جیسا کہ اوپر حافظ ابن حجرؒ کے کلام میں گزر چکا ہے، تو انبیاء علیہم السلام کے اجسام کو اپنے اوپر قیاس کرکے ان کا انکار کردینا، یا ان کے

تسلیم کرنے میں تأمل کرنا صحیح نہیں، مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

ایں خورد گردد پلیدی زو جدا

واں خورد گردد ہمہ نور خدا

آخر میں حضراتِ علمائے کرام اور خطبائے عظام سے بھی گزارش کرتا ہوں کہ عوام کے سامنے ایسے امور نہ بیان کریں جو ان کے فہم سے بالاتر ہوں، وللہ الحمد أوّلًا و آخرًا!

فیض الباری اور رافضی پروپیگنڈا

س…… از راہ کرم یہ بتائیں کہ حدیث کی مشہور کتاب بخاری شریف کی علمائے دیوبند نے اب تک کتنی شروح لکھی ہیں؟ اور ان میں سب سے مستند اور بہتر شرح کون سی ہے جسے اعتماد کے ساتھ پیش کیا جاسکے۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ محمد انور شاہ کشمیری صاحبؒ نے کوئی شرح لکھی ہے، کیا وہ اپنے صحیح اور مستند متن کے ساتھ مطبوعہ صورت میں مل سکتی ہے؟ اور کیا اس مطبوعہ شرح بخاری کو اعتماد و یقین کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے؟

ج…… صحیح بخاری کی کوئی مستقل شرح تو اس وقت ذہن میں نہیں، جو اکابرِ دیوبند میں سے کسی نے لکھی ہو، البتہ اکابر مشائخ دیوبند کے درسی افادات ان کے تلامذہ نے اپنی عبارت میں قلم بند کرکے شائع کئے، ان میں ''لامع الدراری'' حضرت گنگوہیؒ کی تقریر ہے، جو ان کے تلمیذ حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندہلویؒ نے جمع کی تھی، اور وہ ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد زکریاؒ ابن مولانا محمد یحییٰ کے حواشی کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اسی طرح امام العصر حضرت العلامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ کے درسی افادات ان کے تلمیذ حضرت مولانا سیّد بدرعالم میرٹھی مہاجر مدنیؒ نے ''فیض الباری'' کے نام سے شائع کئے، حضرت شاہ صاحبؒ اردو میں تقریر فرماتے تھے، مولانا سیّد بدرعالمؒ نے ان کو عربی میں منتقل کرکے قلم بند کیا، (اسی طرح حضرت گنگوہیؒ کی مندرجہ بالا تقریر کو بھی حضرت مولانا محمد یحییٰؒ نے عربی میں قلم بند کیا تھا)۔

اس کے بعد ہر سال دورۂ حدیث کے طلبہ اپنے اکابر کی تقریریں قلم بند کرتے ہیں، ان میں سے بعض شائع بھی ہوچکی ہیں۔ جن میں شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی،

مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا فخر الدین (نور اللہ مراقدہم) کی تقریریں زیادہ معروف ہیں اور یہ سب اردو میں ہیں۔

س...... ایک شخص جو خود کو عالمِ دین کہلاتا ہو، اور خود کو اہلِ سنت و جماعت ثابت کرتا ہو، وہ قرآن شریف میں تحریفِ لفظی کا قائل ہو، اس کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ جبکہ یہی سنا گیا ہے کہ قرآن شریف میں کسی طرح کوئی تحریف ممکن نہیں کیونکہ اس کی حفاظت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے، امید ہے کہ تحقیقی اور قطعی جواب سے نوازیں گے۔

ج...... اہلِ سنت میں کوئی شخص قرآن کریم میں تحریفِ لفظی کا قائل نہیں، بلکہ اہلِ سنت کے نزدیک ایسا شخص اسلام سے خارج ہے۔ اس مسئلہ کو میری کتاب ''شیعہ سنی اختلافات اور صراطِ مستقیم'' میں دیکھ لیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو ان صاحب کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔

س...... آپ کی خدمت میں ایک سوال قرآن مجید میں تحریفِ لفظی کے قائل کے بارے میں شرعی حکم کے جاننے کے لئے پیش کیا تھا۔ آپ نے جواب کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ: ''میرا خیال ہے کہ آپ کو ان صاحب کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہوگی'' اس جملے کے بعد میں نے ضروری سمجھا کہ آپ سے مزید اطمینان کروں تاکہ تحریفِ لفظی کے قائل کے بارے میں مجھے یقین رہے کہ شریعت کا حکم کیا ہے؟ اس لئے آپ کی خدمت میں اس عالمِ دین کے اصل الفاظ پیش کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:

''میرے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ قرآن میں محققانہ طور پر (معنوی ہی نہیں) تحریفِ لفظی بھی ہے، یا تو لوگوں نے جان بوجھ کر کی ہے یا کسی مغالطے کی وجہ سے کی ہے۔''

ان الفاظ میں وہ یہی فرما رہے ہیں کہ قرآن کریم میں تحریفِ لفظی ہے، جبکہ ہم نے یہی سنا ہے کہ قرآن کریم اپنے نزول سے آج تک ہر طرح کی تحریف سے محفوظ ہے۔ قرآن میں سامنے سے یا پیچھے سے باطل راہ نہیں پاسکتا اور قرآن کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے، اور یہی سنا ہے کہ قرآن میں کسی طرح تحریف کا قائل کوئی مسلمان نہیں، اگر

کوئی مسلمان کہلانے والا ایسا کہے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے۔ اب تک شیعہ فرقہ کے بارے میں سنا تھا کہ وہ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں، لیکن ایک اہل سنت و جماعت کہلانے والے عالم نے تحقیقی طور پر ایسا کیا ہے، اس لئے مجھے بہت تشویش ہوئی کہ قرآن کی ہر طرح حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے، اس کے باوجود قرآن میں تحریف مانی جارہی ہے، اس لئے میں نے حقیقت جاننے کے لئے آپ سے رہنمائی چاہی ہے۔ یہ بھی بتایئے کہ ماضی میں بھی کبھی کوئی سنی عالم قرآن میں تحریفِ معنوی یا تحریفِ لفظی کا قائل رہا ہے؟ امید ہے کہ آپ قطعی شرعی احکام سے آگاہ فرمائیں گے، شکریہ!

ج...... میں پہلے خط میں عرض کرچکا ہوں کہ اہل سنت میں کوئی شخص تحریف فی القرآن کا قائل نہیں، میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ: ''آپ کو ان صاحب کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہوگی'' میرا یہ خیال صحیح نکلا، چنانچہ آپ نے جو عبارت ان صاحب سے منسوب کی ہے وہ ان کی عبارت نہیں، بلکہ غلط فہمی سے آپ نے منسوب کردی ہے۔

اس کی شرح یہ ہے کہ فیض الباری (ج:۳ ص:۳۹۵) میں حضرت ابن عباسؓ کے قول کی (جو صحیح بخاری ج:۱ ص:۳۶۹ میں منقول ہے) کہ: ''اللہ تعالیٰ نے تمہیں (مسلمانوں کو) بتادیا ہے کہ اہل کتاب نے اللہ تعالیٰ کے نوشتہ کو بدل ڈالا، اور کتاب میں اپنے ہاتھوں سے تبدیلی پیدا کردی ہے۔'' اس کی شرح میں حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

> ''جاننا چاہئے کہ تحریف (فی الکتب السابقہ) میں تین مذہب ہیں۔ ۱: ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ کتبِ سماویہ میں تحریف ہر طرح کی ہوئی ہے، لفظی بھی اور معنوی بھی۔ ابن حزمؒ اسی کی طرف مائل ہیں۔ ۲: ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ تحریف قلیل ہے، شاید حافظ ابن تیمیہؒ کا رجحان اسی طرف ہے۔ ۳: اور ایک جماعت تحریفِ لفظی کی سرے سے منکر ہے، پس تحریف ان کے نزدیک سب کی سب معنوی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس (مؤخر

فہرست

الذکر) مذہب پر لازم آئے گا کہ (نعوذ باللہ) قرآن بھی محرف ہو، کیونکہ تحریفِ معنوی اس میں بھی کچھ کم نہیں کی گئی (والـلازم بـاطل فالملزوم مثله)۔ اور جو چیز میرے نزدیک محقق ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ان میں (یعنی کتبِ سماویہ میں) تحریفِ لفظی بھی ہوئی ہے یا تو انہوں نے جان بوجھ کر کی یا غلطی کی وجہ سے؟ پس اللہ تعالیٰ ہی اس کو بہتر جانتے ہیں۔''

یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی پوری عبارت کا ترجمہ ہے، اب دو باتوں پر غور فرمائیے:

اوّل:...... یہ کہ حضرت ابن عباسؓ کے ارشاد میں اہل کتاب کا اپنی کتاب میں تحریف کردینا مذکور تھا، حضرت شاہ صاحبؒ نے اس سلسلے میں تین مذہب نقل کئے۔ ایک یہ کہ اہل کتاب کی کتاب میں تحریف بکثرت ہے۔ دوم یہ کہ تحریف ہے تو سہی مگر کم ہے۔ سوم یہ کہ تحریفِ لفظی سرے سے نہیں صرف تحریفِ معنوی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ ان تین اقوال کو نقل کرکے اپنا محققانہ فیصلہ صادر فرماتے ہیں کہ: اہل کتاب کی کتاب میں تحریفِ لفظی موجود ہے، اب رہا یہ کہ یہ تحریف انہوں نے جان بوجھ کر کی ہے یا غلطی کی وجہ سے صادر ہوئی ہے؟ اس کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔ الغرض گفتگو تمام تر اس میں ہے کہ اہل کتاب کی کتاب میں تحریفِ لفظی ہوئی ہے یا نہیں؟ اگر ہوئی ہے تو قلیل ہے یا کثیر؟ اسی کے بارے میں تین مذاہب ذکر فرمائے ہیں اور اسی تحریف فی الکتاب کے بارے میں اپنا محققانہ فیصلہ صادر فرمایا ہے، قرآن کریم کی تحریفِ لفظی کا دور و نزدیک کہیں تذکرہ ہی نہیں کہ اس کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ یہ فرمائیں کہ: ''جو چیز کہ میرے نزدیک محقق ہوئی ہے وہ یہ کہ اس میں تحریفِ لفظی موجود ہے۔''

دوم:...... شاہ صاحبؒ نے تیسرا قول یہ نقل کیا تھا کہ کتبِ سابقہ میں صرف تحریفِ معنوی ہوئی ہے، تحریفِ لفظی نہیں ہوئی، حضرت شاہ صاحبؒ اس کو غلط قرار دیتے ہوئے ان قائلینِ تحریف کو الزام دیتے ہیں کہ اگر صرف تحریفِ معنوی کی وجہ سے ان کتب کو محرف قرار دیا جائے تو اس سے لازم آئے گا کہ قرآن کریم کو بھی محرف کہا جائے۔ نعوذ

باللہ- کیونکہ اس میں بھی لوگوں نے تحریفِ معنوی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اس سے دو باتیں صاف طور پر واضح ہوتی ہیں، ایک یہ کہ قرآن کریم کی تحریفِ معنوی کے ساتھ اس مذہب والوں کو الزام دینا، اس امر کی دلیل ہے کہ قرآن میں تحریفِ لفظی کا کوئی بھی قائل نہیں۔ دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ اگر حضرت شاہ صاحبؒ -نعوذ باللہ- قرآن کریم کی تحریفِ لفظی کے قائل ہوتے تو صرف تیسرے مذہب والوں کو الزام نہ دیتے، بلکہ پہلے اور دوسرے قول والوں پر بھی یہی الزام عائد کرتے۔

یہ میں نے صرف اس عبارت کی تشریح کی ہے جس سے آپ کو حضرت شاہ صاحبؒ کی بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے، ورنہ قرآن کریم کا تحریفِ لفظی سے پاک ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی بھی منکر نہیں ہوسکتا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی کتاب مشکلات القرآن کا مقدمہ ملاحظہ فرمالیا جائے۔

حسنِ اتفاق کہ اسی طرح کا ایک سوال امام اہل سنت حضرت مولانا ابو زاہد محمد سرفراز خان صفدر زید مجدہم سے بھی کیا گیا، انہوں نے فیض الباری کی اس عبارت کی وضاحت فرمائی ہے جس سے شیعہ تحریفِ قرآن پر استدلال کرتے ہوئے اسے مناظروں میں پیش کرتے ہیں۔ شیعہ یہ تأثر دینا چاہتے ہیں کہ -نعوذ باللہ- فیض الباری میں ہے کہ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری اور مولانا بدر عالم میرٹھی قدس اللہ اسرارہما بھی تحریف کے قائل تھے۔

حضرت مولانا محمد سرفراز خان دامت برکاتہم العالیہ نے اس پروپیگنڈا کا جواب اور غلط فہمی کی وضاحت اپنے ایک مسترشد جناب مولانا عبدالحفیظ صاحب کے نام ایک مکتوب میں فرمائی اور ہدایت فرمائی کہ اسے عام کیا جائے۔ جس پر موصوف نے اس کی فوٹو اسٹیٹ بھیج کر ہم پر احسان فرمایا ہے۔ چونکہ حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر مدظلہٗ کے مکتوبِ سامی میں درج فیض الباری کی عربی عبارتوں کا اردو ترجمہ نہ تھا، اس لئے افادۂ عام کی غرض سے اس کا اردو ترجمہ کردیا گیا۔

ذیل میں حضرت مولانا ابوزاہد سرفراز خاں صفدر کی وضاحت انہیں کے الفاظ میں

فہرست

قارئین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔

''امامِ اہلِ سنت کا مکتوب''

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

''عزیز القدر جناب حضرت مولانا عبدالحفیظ صاحب دام مجدہم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،　　مزاجِ گرامی!

عزیز القدر! فیض الباری ج:۳ ص:۳۹۵ میں ہے:

''واعلم ان فی التحریف ثلاثة مذاهب. ذهب جماعة الیٰ ان التحریف فی الکتب السماویة قد وقع بکل نحو فی اللفظ والمعنی جمیعا، وهو الذی مال الیه ابن حزم. وذهب جماعة الیٰ ان التحریف قلیل، ولعل الحافظ ابن تیمیة جنح الیه. وذهب جماعة الیٰ انکار التحریف اللفظی راسًا فالتحریف عندهم کله معنوی، قلت یلزم علیٰ هذا المذهب ان یکون القرآن ایضاً، والذی تحقق عندی ان التحریف فیه لفظی ایضا اما انه عن عمد منهم او لمغلطة، فالله تعالیٰ اعلم به!''

ترجمہ:...... ''معلوم ہونا چاہئے کہ تحریف کے بارے میں تین مذہب ہیں۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ کتبِ سماویہ میں تحریفِ لفظی اور معنوی دونوں ہوئی ہیں، ابن حزمؒ اسی کے قائل ہیں۔ دوسری جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ کتبِ سماویہ میں تھوڑی سی تحریف ہوئی ہے، غالباً ابن تیمیہؒ کا جھکاؤ اسی طرف ہے۔ تیسری جمات کی رائے یہ ہے کہ تحریفِ لفظی تو نہیں ہوئی البتہ تحریفِ معنوی ہوئی ہے۔ اس جماعت کے نظریہ کے مطابق لازم آئے گا کہ قرآن مجید بھی تحریف سے خالی نہیں، کیونکہ اس میں بھی تحریفِ معنوی ہوئی ہے۔

لیکن میرے نزدیک محقق بات یہ ہے کہ اس میں تحریفِ لفظی بھی ہوئی ہے، یا تو انہوں نے عمداً ایسا کیا ہے، یا پھر مغالطہ کی بنا پر ایسا ہوا ہے، واللہ اعلم!“

عزیز القدر! اس عبارت میں ”فیھا“ کی جگہ ”فیہ“ لکھا گیا ہے، اصل عبارت یوں ہے:

”ان التحریف فیھا (ای الکتب السماویة کالتوراة والانجیل وغیرھما) لفظی ایضًا.“

ترجمہ:..... ”فیھا کی ضمیر کا مرجع کتبِ سماویہ ہیں، یعنی کتبِ سماویہ تورات، زبور و انجیل وغیرہ میں تحریف ہوئی ہے نہ کہ قرآن میں۔ مگر فیہ کی ضمیر مفرد مذکر کی وجہ سے یہ مغالطہ ہوا کہ شاید قرآن میں تحریف ہوئی ہے۔“

اس کی دلیل فیض الباری ج:۴ ص:۵۳۷ کی یہ عبارت ہے:

”واعلم ان اقوال العلماء فی وقوع التحریف ودلائلھم کلھا قد قضیٰ عنه الوطر المحشی فراجعه.“

بخاری شریف کے پچیس پاروں کا حاشیہ حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ نے لکھا ہے، فالج کے حملے کے بعد بقیہ پانچ پاروں کا حاشیہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے کیا ہے۔ سوانح قاسمی از مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اور اس مقام پر حاشیہ میں محشی یعنی حاشیہ لکھنے والے حضرت نانوتویؒ نے حاجت پوری کردی ہے اور مقام کا حق ادا کردیا ہے۔ (ملاحظہ ہو: بخاری ج:۲ ص:۱۱۲۷ کا حاشیہ نمبر:۱)۔

فیض الباری ہی میں اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے

حضرتؒ نے لکھا ہے:

”والذی ینبغی فیه النظر ھٰھنا انه کیف ساغ لابن عباس انکار التحریف اللفظی، مع ان شاھد الوجود یخالفه، کیف وقد نعی علیھم القرآن انھم کانوا یکتبون بایدیھم ثم یقولون ھو من عند الله وما ھو من عند الله وھل ھذا الا تحریف لفظی ولعل مراده انھم ما کانوا یحرفونھا قصدا ولکن سلفھم کانوا یکتبون مرادھا کما فھموه ثم کان خلفھم یدخلونه فی نفس التوراة فکان التفسیر یختلط بالتوراة من ھذا الطریق. انتھی.“ (ج:۴ ص:۳۷)

ترجمہ:...... ”یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے تحریفِ لفظی کے نہ ہونے کا قول کس بنا پر کیا ہے؟ حالانکہ شواہد اس کے خلاف ہیں۔ پھر تحریفِ لفظی نہ ہونے کا قول کیونکر ممکن ہے، جبکہ قرآن مجید نے ان کے اس فعلِ قبیح کو ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے لکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ: ”یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے!“ اور یہی تو تحریف ہے۔ غالباً تحریفِ لفظی نہ ہونے سے ان کی مراد یہ ہے کہ وہ قصداً ایسا نہیں کرتے بلکہ ان کے اسلاف اپنی کتابوں میں اپنی سمجھ کے مطابق ایک مفہوم لکھ دیتے، لیکن ان کے بعد آنے والوں نے اس (تشریحی نوٹ) کو تورات کے متن میں شامل کرلیا، جس کی وجہ سے اصل اور شرح میں التباس ہوگیا اور یوں تحریفِ لفظی ہوگئی۔“

اس ساری عبارت سے واضح ہوا کہ تحریفِ لفظی توراۃ وغیرہ کتابوں میں ہوئی ہے نہ کہ قرآن کریم میں اور حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی تشریح بھی حضرت نے کردی کہ سلف اپنی یاد کے لئے کتابوں میں تفسیری الفاظ لکھتے تھے، خلف نے ان کو بھی متن میں شامل کردیا۔

اس تحریر کو غور سے پڑھیں اور اس کی کاپیاں بنا کر اپنی طرف سے علماء میں تقسیم کریں، بڑی دین کی خدمت ہوگی۔ اہل خانہ کو درجہ بدرجہ سلام اور دعائیں عرض کریں اور مقبول دعاؤں میں نہ بھولیں، یہ خاطی بھی داعی ہے۔ والسلام

ابوالزاہد محمد سرفراز۔از گکھڑ۔''

مسئلہ تقدیر کی مزید وضاحت

س...... آپ نے اپنے جنگ کے کالم میں ایک خاتون کے سوال ''تقدیر الٰہی کیا ہے؟'' کا جواب تحریر فرمایا۔ آپ کے جواب نے ذہن میں پڑی ہوئی گرہ کو پھر سے اُجاگر کردیا ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ ہر چیز تقدیر الٰہی کے تابع ہے، انسان کی زندگی سے متعلق تمام باتیں پہلے سے لکھ دی جاتی ہیں۔

کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کے تابع ہے، یہ بات بالکل عیاں ہے، ذہن میں مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آپ نے یہ تحریر فرمایا کہ انسان کی زندگی کے تمام معاملات پہلے سے معین اور مقرر کردیئے گئے ہیں، مثلاً: رزق، شادی وغیرہ کے معاملات۔

پھر انسان کی زندگی میں کرنے کے لئے رہ ہی کیا جاتا ہے! یہ ضرور ہے کہ انسان کے ہزاروں سال کے مشاہدے میں یہ ضرور آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کچھ معاملات پہلے سے طے فرمادیتے ہیں، مثلاً: زندگی و موت، شادی جیسے معاملات (حقیقت تو یہ ہے کہ کچھ تعجب نہیں جو پروردگار عالم جوشِ رحمت میں ان معاملات میں بھی ردّ و بدل فرمادیتے ہوں) لیکن اگر تمام معاملات میں یہی صورتِ حال ہے تو انسان خفیف ترین کوشش بھی آخر کس لئے کرے؟

آپ نے زندگی کے تمام معاملات کے لئے جو جواب تحریر فرمایا ہے بلکہ آپ نے

فیصلہ کن انداز میں تحریر فرمایا ہے، اس سے یہ تأثر ملتا ہے کہ انسان کی ساری کوششیں لاحاصل ہیں، اس کی تمام کوششوں کا نتیجہ وہی نکلنا ہے جو اس کی کوشش شروع کرنے سے پہلے لکھا جاچکا ہے، پھر وہ کسی بھی کام کے لئے سعی و کوشش کیوں کرے؟ جبکہ اسے معلوم ہے کہ اس کی ہر ہر سعی کا نتیجہ محض صفر کی شکل میں آنا ہے، نہیں! مولانا صاحب نہیں...! پروردگار اتنے کھٹور نہیں ہوسکتے، یہ محض شاعری نہیں:

نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

میں آپ کی توجہ ارشادِ باری تعالیٰ کے ان الفاظ کی طرف بھی مبذول کرانا چاہوں گی، جس کا ترجمہ ہے کہ:

''ہر شخص کو اتنا ہی ملے گا جتنی اس نے کوشش کی۔''

اب محترم یوسف صاحب! یہ دلیل نہ دیجئے گا کہ انسان کی کوشش کا فیصلہ بھی پہلے کیا جاچکا ہے، یعنی یہ کہ وہ کوشش کتنی کرے گا، یہ دلیل بحث برائے بحث ہوگی، کیونکہ اس کا مطلب وہی ہوجائے گا کہ ہر بات کا فیصلہ پہلے سے کیا جاچکا ہے، جبکہ مندرجہ بالا آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں نکالا جاسکتا۔

خدشہ ہے کہ لاکھوں افراد جو یہ کالم پڑھتے ہیں، آپ کے جواب سے زندگی کی ساری دلچسپیاں کھوچکے ہوں گے یا فکر میں مبتلا ہوچکے ہوں گے۔

دُعا کا فلسفہ:

آپ کے جواب سے مذہبِ اسلام میں دعا کا جو فلسفہ اور تصور ہے اور جو اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے کی نفی ہوتی ہے، جب آپ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کی زندگی کے سارے معاملات پہلے فیصل اور طے کردیتے ہیں، انسان کچھ بھی کرے، ہونا وہی ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا ہے، اب اللہ کا کوئی بندہ اپنی کسی مشکل یا مصیبت سے نجات کے لئے پروردگارِ عالم سے التجا اور دعا کرتا ہے تو آپ کے جواب کے موجب وہ گویا دیوار سے سر پھوڑتا ہے، کیونکہ اس کی زندگی میں ہونا تو وہی ہے جو پہلے سے اس کی تقدیر میں لکھا جاچکا ہے، پھر بھلا دعا کے لئے کیا جگہ باقی رہ جاتی ہے، پھر اس کا مطلب کیا ہے؟:

”اللہ تعالیٰ دُعا سننے والے ہیں!“

اور خالق کائنات کے یہ پُرشفقت الفاظ کہ: ”اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو“ کیا معنی رکھتے ہیں؟

یہ بھی یاد رکھئے Rigidity اور رحمت یکجا نہیں ہوسکتے، آپ نے اپنے جواب میں جو کچھ فرمایا ہے اس کے مطابق تو انسان کو ہمدردی سے پُر ان الفاظ کے برخلاف بالکل مایوس ہوجانا چاہئے، کیونکہ بقول آپ کے اللہ تعالیٰ کے نزدیک انسان کی دعائیں، اس کی التجائیں اور اس کی ساری زندگی کی کوششیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

تیسری بات جو آپ کے جواب کی تردید کرتی ہے وہ اقوامِ عالم کی تاریخ ہے، آج امریکہ اور پورا یورپ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے، کم از کم مادّی ترقی کے لحاظ سے (ویسے اخلاقی لحاظ سے بھی وہ مسلمانوں سے کہیں بہتر ہیں)، ان کی یہ ترقی صرف اور صرف ان کی اَنتھک محنتوں اور مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اب اگر آپ یہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تقدیر میں پہلے سے ایسا لکھ دیا ہے تو آپ کو وہ تمام باتیں تسلیم کرنا ہوں گی۔ اول یہ کہ: اللہ تعالیٰ نے ان اقوام کی تقدیر میں جن کو ہم کافر اور گمراہ قوم کہتے ہیں کامیابیاں اور آسائشیں لکھی ہیں اور یہ کہ ان کی کوششوں کا ان کو اجر دیتے ہیں۔ دوئم یہ کہ: انہوں نے اپنے پیروؤں اور نام لیوا قوموں کی تقدیر میں ناکامیاں اور ذلت لکھی ہے، اور ان کی کوششوں کو محض ضائع کرنا لکھا ہے، اور یہ کہ آج دنیا بھر میں جو مسلمان ذلت اور رسوائی اُٹھا رہے ہیں اور کیڑوں مکوڑوں کی طرح مر رہے ہیں، تو ان سب تباہ کاریوں میں وہ بالکل بے قصور اور بری الذمہ ہیں، کیونکہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض تقدیر کا لکھا ہے۔ محترم یوسف صاحب! یہ قوم پہلے ہی اپنی نااہلی اور Corruption میں انتہا کو پہنچ چکی ہے، اب اسے اور بے عملی کا Tranqulizer نہ دیجئے، یہ پہلے ہی خوابِ خرگوش میں بے خود ہے، اسے یہ بتایئے کہ:

ستارہ کیا تری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خاک زبوں
عطا ہو، رومی ہو، رازی کہ غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے بے آہ سحر گاہی!

ج……آپ کے تینوں سوالوں کا جواب میری تحریر میں موجود تھا، مگر جناب نے غور نہیں فرمایا، بہرحال آپ کی رعایت کے لئے چند اُمور دوبارہ لکھتا ہوں۔

اول:……تقدیر کا عقیدہ قرآن مجید اور احادیثِ شریفہ میں مذکور ہے، اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تمام اہلِ حق کا متفق علیہ عقیدہ ہے، اس لئے اس عقیدہ سے انکار کرنا یا اس کا مذاق اُڑانا اپنے دین و ایمان کا مذاق اُڑانا ہے۔

دوم:……آسمان و زمین کی تخلیق سے پہلے اللہ تعالیٰ کو آئندہ ہونے والے تمام واقعات کا علم تھا، اس علم کو اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ پر لکھ دیا، دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کے اسی علم اور اسی نوشتہ کے مطابق ہو رہا ہے، اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ بتایئے کہ اس عقیدہ کے کس حصہ سے آپ کو اختلاف ہے؟ کیا آپ کا ایمان نہیں کہ ہر چیز جو وجود میں آنے والی ہے، اللہ تعالیٰ کو ازل ہی سے اس کا علم تھا؟ اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خدا کو بے علم یا بے علم کو خدا مانتی ہیں؟ اور یہ کفر ہے! اور اگر آپ کہتی ہیں کہ خدا کو علم تو تھا مگر ضروری نہیں جس طرح اس کو علم تھا اسی طرح چیزیں وقوع میں بھی آئیں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا کا علم غلط نکلا، مثال کے طور پر میرے پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک کے حالات، افعال، اقوال، حرکات، سکنات وغیرہ وغیرہ سب اللہ تعالیٰ کو معلوم تھیں یا نہیں؟ اگر نہیں تو اللہ تعالیٰ کا -نعوذ باللہ- بے علم ہونا لازم آتا ہے، اور اگر معلوم تھیں تو کیا علمِ الٰہی کے خلاف ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اگر آپ کہیں کہ اس کے خلاف ہوسکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے علم کا غلط ہونا لازم آیا -نعوذ باللہ- اور اگر اس کے خلاف نہیں ہوسکتا تو یہی عقیدۂ تقدیر ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہو اس کا عقیدۂ تقدیر پر ایمان لانا لازم ہے، ورنہ اس کا دعویٔ ایمان صرف باطل ہے۔

سوم:……آپ نے یہ دیکھ لیا کہ: ”ہر شخص کو وہی ملتا ہے جو اس نے کوشش کی“ لیکن آپ نے یہ کیوں نہیں دیکھا کہ جس قرآن کا حوالہ آپ دے رہی ہیں، اسی قرآن میں یہ بھی تو لکھا ہے:

"اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ ..... وَکُلُّ صَغِیْرٍ وَّکَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ." (القمر:۴۹اور۵۳)

ترجمہ:......"ہم نے ہر چیز کو ایک خاص انداز سے پیدا کیا ہے......اور ہر چھوٹی اور بڑی چیز لکھی ہوئی ہے۔"

یہی قدر جس کو قرآن ذکر کر رہا ہے "تقدیر" کہلاتی ہے، اور ہر چیز کے پہلے سے لکھے ہوئے ہونے کا قرآن اعلان کر رہا ہے، اب بتائیے کہ یہ تقدیر کا عقیدہ میرا اپنا تراشا ہوا ہے یا قرآن کریم ہی نے اس کو بیان فرمایا ہے؟

چہارم:......رہا انسان کے مجبور ہونے کا سوال! اس کا جواب میں پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ تقدیر میں یہ لکھا ہے کہ آدمی فلاں کام کو اختیار و ارادہ سے کرکے جزا و سزا کا مستحق ہوگا، پس تقدیر سے انسان کے اختیار و ارادہ کی نفی نہیں ہوتی، اور انسان کا اختیار تقدیر کے مقابل نہیں، بلکہ تقدیر کے ماتحت ہے۔ لیکن اگر یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تو میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ تقدیر کے ماننے پر تو انسان کا بقول آپ کے مجبور ہونا لازم آتا ہے، اور تقدیر کی نفی کی صورت میں اس کا قادرِ مطلق اور خالق ہونا لازم آتا ہے، آپ کے خیال میں انسان کو قادرِ مطلق اور اپنی تقدیر کا خود خالق ماننا کیا اس کو خدائی کے منصب پر بٹھانا نہیں؟

پنجم:......آپ کا یہ سمجھنا کہ اگر تقدیر برحق ہے تو انسان کی کوشش لاحاصل ہے، یہ اس لئے غلط ہے کہ انسان کو ارادہ و اختیار کی دولت دے کر محنت و سعی کا حکم دیا گیا ہے، اور تقدیر (علمِ الٰہی) میں یہ کہلایا گیا کہ فلاں شخص اتنی محنت کرے گا اور اس پر یہ نتیجہ مرتب ہوگا۔ جب محنت و کوشش بھی تقدیر پر لکھی ہوتی ہے اور اس پر مرتب ہونے والا نتیجہ بھی نوشتۂ تقدیر ہے تو محنت لاحاصل کیسے ہوئی؟ اور "نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں" تو میرے عقیدے کی تفسیر ہے، تقدیر میں لکھا ہوا ہے کہ فلاں مردِ مؤمن کی نگاہ سے فلاں کام ہوجائے گا، یہ بدلی ہوئی تقدیر بھی اصل تقدیر کے ماتحت ہے، اس سے باہر نہیں!

ششم:......آپ نے تقدیر کا مسئلہ سمجھا ہی نہیں، اس لئے دُعا کو تقدیر کے خلاف سمجھ لیا، حالانکہ دعا بھی اسباب میں سے ایک سبب ہے، اور تقدیر میں تمام اسباب بھی تحریر

شدہ ہیں، پس تقدیر میں یہ بھی لکھا ہے کہ فلاں بندہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے گا تو اس کا فلاں کام ہوجائے گا۔

ہفتم:......یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ تقدیر کا عقیدہ نہ تو اسباب کے اختیار کرنے سے روکتا ہے نہ مایوسی پیدا کرتا ہے، بلکہ اس کے برعکس زیادہ سے زیادہ محنت کی دعوت دیتا ہے، اور مایوسیوں کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ عقیدۂ تقدیر سے جاہل ہیں وہ بسا اوقات حالات سے تنگ آکر خودکشی جیسی حماقت کرلیتے ہیں، لیکن آپ نے ایک پکے سچے مؤمن کو، جو اللہ تعالیٰ پر پورا ایمان اور بھروسہ رکھتا ہو، کبھی خودکشی کرتے نہیں دیکھا ہوگا۔ عقیدۂ تقدیر پر ایمان رکھنے والے جتنی دعائیں اور التجائیں اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں، دوسرے لوگ نہیں کرتے اور عقیدۂ تقدیر پر ایمان رکھنے والے جتنی محنت کرتے ہیں وہ دوسروں کو نصیب نہیں۔ خود میری مثال آپ کے سامنے ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اپنے ضعف و کمزوری کے باوجود تین آدمیوں کے برابر کام کرتا ہوں، اس لئے آپ کا نظریہ معروضی طور پر غلط ہے۔

ہشتم:......آپ اقوامِ مغرب کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی احساسِ کمتری کا شکار ہیں، ان کی مادّی ترقی سے مرعوب ہوکر آپ نے ان کو مسلمانوں کے مقابلے میں اخلاقی برتری کی بھی سند عطا کردی۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ انہیں کون سی اخلاقی برتری حاصل ہے؟ کیا ان ممالک میں زنا اور شراب نوشی کی شرح اسلامی ممالک کی نسبت کم ہے؟ آپ کو یاد ہوگا کہ نیویارک میں چند گھنٹوں کے لئے بجلی کی رو چلی گئی تھی تو وہاں چوری، ڈاکہ زنی اور بدمعاشی کا کیسا بازار گرم ہوا تھا؟ کیا ان کی یہی اخلاقی برتری ہے جس کے قصیدے آپ پڑھ رہی ہیں...؟ اور پھر آپ ان کا مقابلہ آج کے مسلمانوں سے کر رہی ہیں ''جن کو دیکھ کے شرمائیں یہود!'' کیا ان مسلمانوں کی بدعملی عقیدۂ تقدیر کی وجہ سے ہے؟ بلکہ عقیدۂ تقدیر اور دیگر صحیح عقائد کے دل میں نہ رہنے کی وجہ سے ہے! اور اقوامِ مغرب کی مادّی ترقی اول تو میری نظر میں اس لائق ہی نہیں کہ اس کی طرف التفات کیا جائے، ان قوموں کو جو مادّی ترقی حاصل ہے، کیا ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ سے پہلے کے

فہرست

انبیائے کرام علیہم السلام کو بھی حاصل تھی؟ فرعون اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ پر غور کیجئے! یہ مادّیت فرعون کے پاس تھی یا موسیٰ علیہ السلام کے پاس؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مقابلے میں نمرود کو دیکھئے! جو مادّی ساز و سامان اور کر و فر نمرود کو حاصل تھا کیا ابراہیم علیہ السلام کو بھی حاصل تھا؟ ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر قیصر و کسریٰ کو لیجئے! کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وہ مادّی ساز و سامان حاصل تھا جو قیصر و کسریٰ کو میسر تھا؟ اگر بقول آپ کے اہل مغرب مسلمانوں سے محض مادّی ترقی کی بنا پر فائق ہیں تو ذرا ''اقوامِ عالم کی تاریخ'' پر نظر ڈال کر دیکھئے! کیا دنیا کی آسائشیں انبیاء کرام علیہم السلام کے مقابلے میں گمراہ اور بے خدا قوموں کو حاصل نہیں رہیں؟

جہاں تک محنت و سعی کا تعلق ہے، میں اوپر بتاچکا ہوں کہ یہ تقدیر کے منافی نہیں، اگر بقول آپ کے کافروں کو کامیابیاں اور آسائشیں حاصل ہیں، تو یہ ان کی محنت کے صلے میں نوشتۂ تقدیر ہے، اور اگر بقول آپ کے مسلمان ذلت و رسوائی اُٹھا رہے ہیں تو یہ ان کی بدعملی کے نتیجے میں نوشتۂ تقدیر ہے۔

نہم:...... آپ کا یہ خیال سراسر غلط ہے کہ عقیدۂ تقدیر نااہلی، مایوسی اور بے عملی سکھاتا ہے، کوئی مؤمن جو تقدیرِ الٰہی پر صحیح عقیدہ رکھتا ہو وہ کبھی نااہل، مایوس اور بے عمل نہیں ہوسکتا، اس نااہلی و بے عملی کا سبب اپنے دین سے انحراف ہے نہ کہ عقیدۂ تقدیر!

دہم:...... آخر میں گزارش کروں گا کہ عقیدۂ تقدیر کا انکار کرکے قرآن کریم اور حدیث شریف کے فرمودات کی نفی نہ کی جائے، عقیدۂ تقدیر برحق ہے! اگر ہم اسے مانیں تب بھی برحق ہے، اور اگر انکار کردیں تب بھی برحق ہے، اس کا صحیح اور برحق ہونا ہمارے ماننے یا نہ ماننے پر موقوف نہیں، اور جب تک اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کی نفی نہ کی جائے، عقیدۂ تقدیر کی نفی ممکن نہیں، آپ کو اختیار ہے کہ عقیدۂ تقدیر پر ایمان لاکر اللہ تعالیٰ کے علمِ محیط اور قدرتِ کاملہ کو مان لیں یا عقیدۂ تقدیر کا انکار کرکے اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت سے بھی دستبردار ہوجائیں۔ مشکل یہ ہے کہ آپ نے دین کے بنیادی عقائد کو باقاعدہ سیکھا

نہیں، اس لئے ذہن اُلجھا ہوا ہے، اگر آپ دین کو سمجھنا چاہتی ہیں تو اپنی ادھوری معلومات پر اکتفا نہ کریں بلکہ دین کی کتابوں کو صحیح طور پر پڑھیں، میرا خیال ہے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ''بہشتی زیور'' بھی آپ کی نظر سے نہیں گزری، آپ اس کا مطالعہ کریں اور پھر کوئی اشکال ہو تو اس کو رفع کرنے کے لئے حاضر ہوں!

فقہِ حنفی کی چند نصوص کی صحیح تعبیر

س......۱: اگر کسی عورت کو اجرت دے کر اس کے ساتھ زنا کرے تو اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں؟ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ فقہِ حنفی میں اس زنا پر حد نہیں ہے اور اپنی تائید میں یہ حوالہ پیش کرتے ہیں:

''لو استأجر المرأة لیزنی بها فزنی لا یحد فی قول ابی حنیفة.''

اس قول کی کیا تعبیر کی جائے گی؟

س......۲: یہ کہ کیا فی الواقع فقہِ حنفی کے بعض یا اکثر مسائل قرآن اور صحیح حدیثوں کے خلاف ہیں؟

س......۳: کیا امام اعظم رحمہ اللہ کے مقلدین کی تقلید ایسی ہے کہ اگر بالفرض امام صاحبؒ کا کوئی مسئلہ قرآن پاک کی آیت یا کسی صحیح حدیث کے خلاف ہو تو حنفی حضرات، قرآن پاک اور حدیثِ رسولؐ کو یہ کہہ کر چھوڑ دیں گے کہ: ''چونکہ یہ آیت یا حدیث ہمارے امام کے قول کے مخالف ہے اس لئے ہم اس کو نہیں مانتے، ہمارے لئے امام کی تقلید اور ان کا مسئلہ لائق تقلید ہے۔'' ایسا کہنا والے کا کیا حکم ہوگا؟

س......۴: جس شخص پر شہوت کا غلبہ ہو اور اس کی زوجہ یا لونڈی نہ ہو تو وہ شہوت میں تسکین حاصل کرنے کے لئے استمنا بالید کر سکتا ہے۔ اُمید ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا، اور زنا کا خوف ہو تو پھر استمنا بالید واجب ہے۔ (بحوالہ شامی ص:۱۵۶)

اُمید ہے کہ آں محترم اپنی ضروری مصروفیات میں سے وقت نکال کر مذکورہ سوالات کے جوابات سے مطلع فرمائیں گے، والسلام علیکم!

ج……۱: جس عورت کو اجرت دے کر زنا کیا ہو صاحبینؒ کے نزدیک اس پر حد ہے، اور درمختار میں فتح القدیر سے نقل کیا ہے کہ:

"والحق وجوب الحد کالمستأجرة الخدمة."

(شامی ج:۴ ص:۲۹)

ترجمہ:……"اور حق یہ ہے کہ حد واجب ہے، جیسے خدمت کے لئے نوکر رکھی ہوئی عورت سے زنا کرنے پر حد واجب ہے۔"

حضرت امام ابوحنیفہؒ شبہ کی بنا پر حد کو ساقط فرماتے ہیں (اور تعزیر کا حکم دیتے ہیں) ان کا استدلال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اثر سے ہے جس کو امام عبدالرزاقؒ نے مصنف میں بایں الفاظ نقل کیا ہے:

الف:……"اخبرنا ابن جریج قال ثنی محمد بن الحارث بن سفیان عن ابی سلمة بن سفیان: ان المرأة جاءت عمر بن خطاب (رضی الله عنه) فقالت: یا امیر المؤمنین! اقبلت اسوق غنمًا، فلقینی رجل، فحفن لی حفنةً من تمر، ثم حفن لی حفنةً من تمر، ثم حفن لی حفنةً من تمر، ثم اصابنی. فقال عمر (رضی الله عنه): قلت: ماذا؟ فاعادت، فقال عمر بن الخطاب (رضی الله عنه) ویشیر بیده: مهر! مهر! مهر! ..... الخ."

ترجمہ:……"ہم سے بیان کی جریج نے، وہ فرماتے ہیں کہ: مجھ سے بیان کیا محمد بن حارث بن سفیان نے، وہ روایت کرتے ہیں ابوسلمہ بن سفیان سے کہ: ایک عورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور بیان کیا کہ: اے امیر المؤمنین! میں اپنی بکریاں

لا رہی تھی، پس مجھے ایک شخص ملا، اس نے مجھے مٹھی بھر کھجوریں دیں، پھر ایک اور مٹھی بھر کھجوریں دیں، پھر ایک اور مٹھی بھر کھجوریں دیں، پھر مجھ سے صحبت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو نے کیا کہا؟ اس نے اپنا بیان دہرایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور اپنے ہاتھ سے اشارہ فرمارہے تھے: مہر ہے! مہر ہے! مہر ہے!"

ب:...... "**وعن سفيان بن عيينة عن الوليد بن عبدالله عن ابى الطفيل ان امرأة اصابها الجوع، فاتت راعيًا، فسألته الطعام، فابىٰ عليها حتىٰ تعطيه نفسها، قالت: فحثىٰ لى ثلاث حثيات من تمر، وذكرت انها كانت جهدت من الجوع، فاخبرت عمر، فكبر وقال: مهر! مهر! مهر! كل حفنةً مهر، ودرا عنها الحد.**"

(مصنف عبدالرزاق ج:۷ ص:۴۰۶)

ترجمہ:...... "نیز عبدالرزاق روایت کرتے ہیں سفیان بن عیینہ سے، وہ ولید بن عبداللہ بن جمیع سے، وہ ابوالطفیل (واثلہ بن اسقع صحابی رضی اللہ عنہ) سے کہ: ایک عورت کو بھوک نے ستایا، وہ ایک چرواہے کے پاس گئی، اس سے کھانا مانگا، اس نے کہا جب تک اپنا نفس اس کے حوالے نہیں کرے گی وہ نہیں دے گا، عورت کا بیان ہے کہ اس نے مجھے کھجور کی تین مٹھیاں دیں، اور اس نے ذکر کیا کہ وہ بھوک سے بے تاب تھی، اس نے یہ قصہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتایا، آپؓ نے تکبیر کہی اور فرمایا: مہر ہے! مہر ہے! مہر ہے! اور اس سے حد کو ساقط کردیا۔"

ان دونوں روایتوں کے راوی ثقہ ہیں، حافظ ابن حزم اندلسیؒ نے یہ دونوں روایتیں المحلّٰی میں ذکر کرکے ان پر جرح نہیں کی بلکہ مالکیوں اور شافعیوں کے

فہرست

خلاف ان کو بطورِ حجت پیش کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”واما المالکیون والشافعیون فعهدنا بهم یشنعون خلاف الصاحب الذی لا یعرف له مخالف اذا وفق تقلیدهم وهم قد خالفوا عمر، ولا یعرف لهم مخالف من الصحابة ..... بل هم یعدون مثل هٰذا اجماعًا، ویستدلون علی ذالک بسکوت من بالحضرة من الصحابة عن النکیر لذالک.“

(محلی ابن حزم ج:۱۱ص:۲۵۰)

ترجمہ:...... ”رہے مالکی اور شافعی، تو ہم نے ان کو دیکھا ہے کہ وہ ایسے صحابی کی مخالفت پر تشنیع کیا کرتے ہیں جس کے مخالف صحابہ میں سے کوئی معروف نہ ہو...... بلکہ اس کو ”اجماع“ شمار کرتے ہیں اور وہ اس اجماع پر استدلال کیا کرتے ہیں، ان صحابہؓ کے سکوت سے، جو اس موقع پر موجود تھے مگر انہوں نے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔“

جب ان حضرات کا یہ اصول ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مندرجہ بالا واقعہ کو کیوں حجت نہیں سمجھتے باوجودیکہ حضراتِ صحابہ میں سے کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نکیر نہیں فرمائی؟ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھوک کی مجبوری کی وجہ سے اس کو معذور و مضطر سمجھ کر اس سے حد کو ساقط کردیا ہوگا۔

حافظ ابن حزمؒ اس احتمال کو غلط قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”فان قالوا: ان ابا الطفیل ذکر فی خبره انها قد کان جهدها الجوع، قلنا لهم: ..... ان خبر ابی الطفیل لیس فیه ان عمر عذرها بالضرورة، بل فیه انه درا الحد من اجل التمر الذی اعطاها، وجعله عمر مهرا.“

(محلی ج:۱۱ ص:۲۵۰)

ترجمہ:......''اگر مالکی اور شافعی حضرات یہ کہیں کہ ابوالطفیلؒ نے اپنی روایت میں ذکر کیا ہے کہ بھوک نے اس خاتون کو بے تاب کردیا تھا (شاید اس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے حد ساقط کردی ہوگی)، ہم ان سے کہیں گے کہ: ...... ابوالطفیلؒ کی روایت میں یہ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو اضطرار کی وجہ سے معذور قرار دیا تھا، بلکہ اس روایت میں تو یہ ہے کہ آپؓ نے کھجوروں کی وجہ سے حد ساقط کردی جو اس شخص نے دی تھیں، اور آپؓ نے ان کھجوروں کو مہر قرار دیا۔''

اس تفصیل سے دو باتیں واضح ہوگئیں، ایک یہ کہ سوال میں جو کہا گیا ہے کہ: ''فقہ حنفی میں اس پر حد نہیں!'' یہ تعبیر غلط ہے، آپ سن چکے ہیں کہ اس مسئلے میں فقہ حنفی کا فتویٰ صاحبینؒ کے قول پر ہے کہ اس پر حد لازم ہے۔

دوم یہ کہ جو لوگ اس مسئلے میں حضرت امامؒ پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں وہ مسئلہ کو صحیح نہ سمجھنے کی وجہ سے کرتے ہیں، اور ان کا یہ طعن حضرت امامؒ پر نہیں بلکہ درحقیقت ان کے پیش رو حضرت امیرالموٴمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ پر ہے، کسی مسئلہ سے اتفاق نہ کرنا اور بات ہے، لیکن ایسے مسائل کی آڑ لے کر ائمہ ہدیٰ پر زبانِ طعن دراز کرنا دوسری بات ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ زیر بحث صورت حضرت امامؒ (اور ان کے پیش رو حضرت عمر رضی اللہ عنہ) کے نزدیک بھی زنا ہے، حلال نہیں، لیکن شبہ مہر کی وجہ سے حد ساقط ہوگئی، اس لئے یہ سمجھنا بدفہمی ہوگی کہ یہ دونوں بزرگ زنا بالاستیجار کو حلال سمجھتے ہیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، وللبسط محل آخر!

ج......۲: یہ کہنا کہ: ''فی الواقع فقہ حنفی کے بعض یا اکثر مسائل قرآن اور صحیح حدیثوں کے خلاف ہیں'' قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے، فقہِ حنفی میں مسائل کا استناد قرآنِ کریم، احادیثِ نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات)، اجماعِ اُمت اور قیاسِ صحیح سے ہے، البتہ ائمہ مجتہدین کے مدارکِ اجتہاد مختلف ہیں، حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اجتہاد کی جس بلندی پر فائز تھے

اس کا اعتراف اکابر ائمہ نے کیا ہے۔

ج……۳: سوال میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی خالص تہمت ہے، ابھی اوپر مسئلہ مستأجرہ میں آپ نے دیکھا کہ احناف نے حضرت امام رحمہ اللہ کے قول کو چھوڑ کر صاحبینؒ کے قول کو اختیار کیا اور یہ کہا: ”والحق وجوب الحد!“ اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کرسکتا ہوں، جہاں لوگوں کو بظاہر نظر آتا ہے کہ حنفیہ حدیثِ صحیح کے خلاف کرتے ہیں وہاں صرف امامؒ کے قول کی بنا پر نہیں، قرآن و سنت اور اجماعِ اُمت کے قوی دلائل کے پیشِ نظر ایسا کرتے ہیں، اس کی بھی بہت سی مثالیں پیش کرسکتا ہوں، مگر نہ فرصت اس کی متحمل ہے، اور نہ ضرورت اس کی داعی ہے۔

ج……۴: درمختار میں ہے:

”فی الجوھرۃ: الاستمناء حرام وفیہ التعزیر۔“

ترجمہ:……”جوہرہ میں ہے کہ: استمنا بالید حرام ہے اور اس پر تعزیر لازم ہے۔“

علامہ شامیؒ نے اس کے حاشیہ میں لکھا ہے:

”قولہ: الاستمناء حرام ای بالکف اذا کان لاستجلاب الشھوۃ، اما اذا غلبتہ الشھوۃ ولیس لہ زوجۃ ولا اَمَۃ ففعل ذالک لتسکینھا فالرجا انہ لا وبال علیہ، کما قالہ ابو اللیث، ویجب لو خاف الزنا۔“

(ردالمختار ج:۴ ص:۲۷ کتاب الحدود)

ترجمہ:……”اپنے ہاتھ سے منی خارج کرنا حرام ہے، جبکہ یہ فعل شہوت کو برانگیختہ کرنے کے لئے ہو، لیکن جس صورت میں کہ اس پر شہوت کا غلبہ ہو اور اس کی بیوی اور لونڈی نہ ہو، اگر وہ تسکینِ شہوت کے لئے ایسا کرلے تو امید کی جاتی ہے کہ اس پر وبال نہیں ہوگا، جیسا کہ فقیہ ابو اللیثؒ نے فرمایا، اور اگر زنا میں مبتلا ہونے کا

اندیشہ ہو تو ایسا کرنا واجب ہے۔“

اس عبارت سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

اوّل:......عام حالات میں یہ فعل حرام ہے، موجبِ وبال ہے اور اس پر تعزیر لازم ہے۔

دوم:......اگر کسی نوجوان پر شہوت کا غلبہ ہو کہ شدتِ شہوت کی وجہ سے اس کا ذہن اس قدر متوحش ہو کہ کسی طرح اس کو سکون و قرار حاصل نہ ہو، اور اس کے پاس تسکینِ شہوت کا کوئی حلال ذریعہ بھی موجود نہ ہو، ایسی اضطراری حالت میں اگر وہ بطورِ علاج اس عمل کے ذریعہ شہوت کی تسکین کرلے تو اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے توقع کی جاتی ہے کہ اس پر وبال نہ ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ رشوت کا لینا اور دینا دونوں حرام ہیں، لیکن اگر کوئی مظلوم دفعِ ظلم کی خاطر رشوت دینے پر مجبور ہوجائے تو توقع کی جاتی ہے کہ اس مظلوم پر مؤاخذہ نہ ہوگا، یہ فقیہ ابواللیثؒ کا قول ہے۔

سوم:......اگر شدتِ شہوت کی بنا پر زنا میں مبتلا ہونے کا قوی اندیشہ ہوجائے تو زنا سے بچنے کے لئے اس فعلِ بد کا ارتکاب ضروری ہوگا، یہ ایسی صورت ہے کہ کسی شخص کا دو حراموں میں سے ایک میں مبتلا ہوجانا ناگزیر ہے تو ان میں سے جو اَخف ہو اس کا اختیار کرنا لازم ہے۔

فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ اس اصول کو ان الفاظ سے تعبیر فرماتے ہیں:

”من ابتلی ببلیتین فلیختر اھونھما۔“

ترجمہ:......”جو شخص دو مصیبتوں میں گرفتار ہو اس کو چاہئے کہ وہ ان میں سے اَہون ہو اس کو اختیار کرلے۔“

شیخ ابن نجیمؒ نے ”الاشباہ والنظائر“ کے فن اول کے قاعدہ خامسہ کے تحت اس اصول کا ذکر کیا ہے اور اس کی متعدد مثالیں ذکر کی ہیں، اس کی تمہید میں فرماتے ہیں:

”چوتھا قاعدہ یہ ہے کہ جب دو مفسدے جمع ہوجائیں تو بڑے مفسدے سے بچنے کے لئے چھوٹے کا ارتکاب کرلیا جائے گا۔

امام زیلعیؒ ''باب شروط الصلوٰۃ'' میں فرماتے ہیں کہ اس نوعیت کے مسائل میں اصول یہ ہے کہ جو شخص دو بلاؤں میں گرفتار ہوجائے اور وہ دونوں ضرر میں مساوی ہوں تو دونوں میں سے جس کو چاہے اختیار کرلے، اور اگر دونوں مختلف ہوں تو جو برائی ان میں سے اَہون ہو اس کو اختیار کرے، کیونکہ حرام کا ارتکاب صرف اضطرار کی حالت میں جائز ہے اور جس چیز کا ضرر زیادہ ہو اس کے اختیار کرنے میں کوئی اضطرار نہیں۔''

(الاشباہ والنظائر مع شرح حموی ج:۱ ص:۱۲۳، مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی)

استمنا کی جس صورت کو شامی نے واجب لکھا ہے اس میں یہی اصول کارفرما ہے، یعنی بڑے حرام (زنا) سے بچنے کے لئے چھوٹے حرام (استمنا) کو اختیار کرنا، اس کو یوں سمجھنا کہ استمنا کی اجازت دے دی گئی ہے، یا یہ کہ اس کو واجب قرار دیا گیا ہے، قطعاً غلط ہوگا، ہاں! اس کو یوں تعبیر کرنا صحیح ہوگا کہ بڑے حرام سے بچنے کو واجب قرار دیا گیا ہے، خواہ یہ چھوٹے حرام کے ارتکاب کے ذریعہ ہو۔

رہا یہ کہ آدمی کو ضبطِ نفس سے کام لینا چاہئے، نہ زنا کے قریب پھٹکے، اور نہ استمنا کرے، یہ بات بالکل صحیح ہے، ضرور یہی کرنا چاہئے، لیکن سوال یہ ہے کہ جو شخص نفس و شیطان کے چنگل میں ایسا پھنس چکا ہو کہ زمامِ اختیار اس کے ہاتھ سے چھوٹ رہی ہو اور اس کو اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو کہ یا تو فاحشہ کبیرہ کا ارتکاب کرکے روسیاہ ہو، یا اپنے ہاتھ سے غارتگر ایمان شہوت کو ختم کردے، ایسی حالت میں اس شخص کو کیا کرنا چاہئے؟ ذرا عقل و شرع سے اس کا فتویٰ پوچھئے...! واللہ اعلم!

انسانی اعضاء کی پیوندکاری اور خون کا مسئلہ

س...... مولانا صاحب! آج کل انسانی اعضاء کی پیوندکاری کا سلسلہ چلا ہوا ہے، کیا یہ جائز ہے؟ نئی تحقیقات اور سائنسی ایجادات نے ہمارے لئے ایک چیلنج کی شکل اختیار کرلی ہے،

بعض لوگ ان تحقیقات سے نفع اُٹھانے کو عقل مندی اور اس سلسلے کی غیرشرعی تحقیقات سے بچنے والے حضرات کو تنگ نظر کہتے ہیں، اس طرح خون چڑھانے کا مسئلہ بھی ہے۔ آپ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی فرمائیں۔

ج……اس سلسلے میں حال ہی میں حضرت مفتی صاحب مدفیضہم کی تازہ تألیف ''انسانی اعضاء کی پیوندکاری'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، جس میں ان دونوں مسائل کے بارے میں متعدّد علمائے کرام (جن کے اسمائے گرامی حضرت مفتی صاحب نے تمہید میں ذکر کردیئے ہیں) کی متفقہ تحقیق کتاب وسنت اور فقہِ اسلامی کے دلائل کی روشنی میں درج کی گئی ہے، اس کا مختصر سا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے، تفصیلی دلائل کے لئے اصل کتاب کا مطالعہ فرمایئے۔

تمہید

زیرِ نظر مسئلہ انسانی خون اور انسانی اعضاء کے تبادلے کا معاملہ اس زمانے میں ایک ابتلائے عام کا معاملہ ہے، اور مسئلہ کتبِ فقہ میں منصوص نہیں، جب اس کے متعلق پاکستان اور بیرونِ پاکستان سے متعدّد سوالات آئے تو احقر (مفتی صاحب) نے سنتِ اکابر کے مطابق مناسب سمجھا کہ انفرادی رائے کے بجائے ماہر علماء کی ایک جماعت اس میں غور و فکر اور بحث وتمحیص کرکے کوئی رائے متعین کرے، چنانچہ اس کے لئے ایک سوال نامہ مرتب کرکے فقہ وفتویٰ کے مراکز پاکستان میں کراچی، ملتان، پشاور وغیرہ اور انڈیا میں دیوبند، سہارنپور، دہلی وغیرہ میں بھیجے، اکثر حضرات کے جوابات موصول ہوئے، تو ان پر بھی اجتماعی غور وفکر مناسب تھا، مگر ملک گیر وسائل بھی آسان نہ تھے، اس کے لئے جتنے وقت اور طویل فرصت کی ضرورت تھی اس کا میسر ہونا بھی دُشوار تھا، اس لئے بحکم ''ما لا یدرک کله لا یترک کله'' یہ صورت اختیار کی کہ صرف کراچی کے اہلِ فتویٰ علماء کا اجتماع کرکے ان پر غور کیا جائے اور یہ اجتماع جس نتیجے پر پہنچے اس کو منضبط کرکے ملک اور بیرونِ ملک کے اربابِ فتویٰ کے پاس بھیج کر ان کی آراء اور فتاویٰ حاصل کئے جائیں تاکہ یہ ماہرین اہلِ فتویٰ کا اجتماعی فتویٰ ہوسکے۔ اس اجتماع میں حسبِ ذیل حضرات نے شرکت کی، اور مختلف تاریخوں کی پانچ چھ نشستوں میں باہر سے آئے ہوئے جوابات اور اس مسئلے کے ہر پہلو پر

غور کیا گیا اور اس معاملے کے متعلق مذاہبِ اربعہ کی کتابوں کو سامنے رکھا گیا، یہ مجلس اتفاقِ رائے سے جس نتیجے پر پہنچی وہ آئندہ صفحات میں مع دلائل کے لکھا جارہا ہے، اسمائے شرکائے مجلس یہ ہیں:

دارالعلوم کراچی سے:

۱:......محمد شفیع خادم دارالعلوم کراچی۔

۲:......مولانا محمد صابر صاحب نائب مفتی۔

۳:......مولانا سلیم اللہ صاحب مدرّس دارالعلوم۔

۴:......مولانا سحبان محمود صاحب دارالعلوم کراچی۔

۵:......مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب دارالعلوم کراچی۔

۶:......مولانا محمد رفیع صاحب دارالعلوم کراچی۔

۷:......مولانا محمد تقی صاحب دارالعلوم کراچی۔

مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی سے:

۸:......حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری شیخ الحدیث و مہتمم مدرسہ۔

۹:......مولانا محمد ولی حسن صاحب مفتی مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی۔

۱۰:......مولانا محمد ادریس صاحب مدرّس مدرسہ عربیہ اسلامیہ۔

اشرف المدارس سے:

۱۱:......مولانا مفتی رشید احمد صاحب مفتی و مہتمم مدرسہ۔

باہر سے جن حضرات کے تحقیقی فتاویٰ موصول ہوئے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱:......حضرت مولانا مفتی مہدی حسن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند۔

۲:......حضرت مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب مفتی خیر المدارس ملتان۔

۳:......مولانا عبدالستار صاحب مفتی خیر المدارس ملتان۔

۴:......مولانا محمد اسحاق صاحب نائب مفتی خیرالمدارس ملتان۔

۵:......مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی مفتی جامعہ اشرفیہ لاہور۔

۶:......مولانا مفتی محمود صاحب مفتی مدرسہ قاسم العلوم ملتان۔

۷:......مولانا عبداللطیف صاحب معین مفتی مدرسہ قاسم العلوم ملتان۔

۸:......مولانا وجیہ صاحب مفتی دارالعلوم ٹنڈو الہ یار۔

اس مجلس نے خون اور اعضاء کے مسائل کے علاوہ اسی طرح کے دُوسرے اہم اور ابتلائے عام کے مسائل میں بحث و تمحیص کا بھی فیصلہ کیا ہے اور بحمداللہ اس وقت تک بہت سے اہم مسائل زیرِ بحث آکر مجلس کی رائے کی حد تک طے کرکے منضبط کرلئے گئے ہیں، جس میں مسائلِ ذیل شامل ہیں:

۱:......بیمۂ زندگی کا مسئلہ۔

۲:......پراویڈنٹ فنڈ کے سود اور اس فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ کا مسئلہ۔

۳:......بلاسود بینکاری کا مفصل نظام۔

۴:......یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ اور ان سے گوشت خریدنے کا مسئلہ۔

۵:......مشینی ذبیحہ کا مسئلہ۔

اس وقت خون اور اعضاء کے زیرِ بحث مسئلے کے متعلق جس قدر جوابات بیرونی حضرات سے وصول ہوئے یا ارکانِ مجلس نے اپنی تحقیق سے لکھے، ان سب پر غور و فکر کے بعد مجلس جس نتیجے پر پہنچی اس کو ان اوراق میں پیش کیا جاتا ہے۔ ہر ایک کو الگ الگ لکھنے میں تکرار بھی ہوتا اور بے ضرورت ضخامت بھی بڑھتی، اس لئے بحث و تمحیص کے بعد جو کچھ منقح ہوا، اس کو ایک ترتیب سے لکھ لیا گیا اور دلائل کے حوالوں کو عوام کی سہولت کے لئے الگ لکھ دیا گیا ہے، واللہ المستعان!

مقدمہ

چند اُصولی مسائل

مسائل کی تفصیل سے پہلے چند اُصولی باتیں سمجھ لینا ضروری ہے، تاکہ آنے

والے مسائل کے سمجھنے میں سہولت ہو۔

اوّل:...... ہر حرام چیز انسانیت کے لئے مضر ہے:

خدائے حکیم و برتر نے جن چیزوں کو بندوں کے لئے حرام اور ممنوع قرار دیا ہے خواہ بظاہر ان میں کتنا ہی فائدہ نظر آئے لیکن درحقیقت وہ انسان اور انسانیت کے لئے مضر ہیں اور نفع کے بجائے نقصان کا پہلو ان میں غالب ہے۔ یہ نقصان کبھی جسمانی ہوتا ہے، کبھی رُوحانی۔ پھر کبھی تو اس قدر واضح ہوتا ہے کہ ہر عام و خاص اسے جانتا ہے، اور کبھی ذرا خفی ہوتا ہے جسے حاذق طبیب اور ماہر ڈاکٹر ہی جان سکتے ہیں، اور کبھی اتنا لطیف ہوتا ہے کہ نہ افلاطون و ارسطو کی عقل کی وہاں تک رسائی ہوسکتی ہے، نہ کسی جدید سے جدید آلے کی مدد سے اسے دریافت کیا جاسکتا ہے، بلکہ صرف حاسۂ وحی اور فراستِ نبوّت ہی سے اسے دیکھا اور پہچانا جاسکتا ہے، اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

دوم:......تکریمِ انسان اور اس کے دو پہلو

حق تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے انسان کو ظاہری و معنوی شرف و امتیاز بخشا ہے، وہ شکل و صورت میں سب سے حسین اور علم و ادراک میں سب سے فائق پیدا کیا گیا اور اسے کائنات کا مخدوم و مکرم بنایا گیا ہے، اس تکریم و شرف کا ایک پہلو یہ ہے کہ تمام کائنات اسی کی خدمت پر مأمور ہے، بہت سی چیزوں کو اس کی غذا یا دوا کے لئے حلال کردیا گیا ہے، اور اضطراری حالت میں حرام چیزوں کے استعمال کی بھی اسے اجازت دی گئی ہے، اور دُوسرا پہلو یہ کہ انسان کے اعضاء کو غذا اور دوا کے لئے ممنوع اور ان کی خرید و فروخت کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔

سوم:......علاج میں شرعی سہولتیں:

اسلام کی نظر میں انسانی جان درحقیقت امانتِ الٰہیہ ہے، جسے تلف کرنا سنگین جرم ہے، اس کی حفاظت کے لئے بڑے سامان تیار کئے گئے ہیں، جن کے استعمال کا حکم ہے اور ایسی تدابیر اور علاج معالجے کو ضروری قرار دیا ہے جس سے مریض کی جان بچ سکے، مریض کی سہولت کے لئے نماز، روزہ، غسل، طہارت وغیرہ کے اَحکام الگ وضع فرمائے ہیں، اس

فہرست

سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ اِضطرار کی حالت میں جان بچانے کے لئے کلمۂ کفر بکنے کی، جو اسلام کی نظر میں بدترین جرم ہے، اجازت دے دی گئی، اسی طرح جو شخص بھوک سے مر رہا ہو اس کے لئے سدِ رمق تک خنزیر اور مردار کھانے کو مباح بلکہ ضروری کردیا گیا۔

چہارم:...... اِضطرار کا صحیح درجہ کیا ہے؟

ناواقف حضرات ہر معمولی حاجت کو ''اِضطراری حالت'' کا نام دے لیتے ہیں، اس لئے ضروری ہوا کہ اس کی تنقیح کردی جائے۔

علامہ حمویؒ ''شرح اشباہ'' میں لکھتے ہیں کہ: یہاں پانچ درجے ہیں: ضرورت (اِضطرار)، حاجت، منفعت، زینت اور فضول۔

اِضطرار:...... یہ ہے کہ ممنوع چیز کو استعمال کئے بغیر جان بچانے کی کوئی صورت ہی نہ ہو، یہی وہ اِضطراری صورت ہے جس میں خاص شرائط کے ساتھ حرام کا استعمال مباح ہوجاتا ہے۔

حاجت:...... یہ ہے کہ ممنوع چیز کو استعمال نہ کرنے سے ہلاکت کا اندیشہ تو نہیں لیکن مشقت اور تکلیف شدید ہوگی، اس حالت میں نماز، روزہ، طہارت وغیرہ کے اَحکام کی سہولتیں تو ہوں گی مگر حرام چیزیں مباح نہ ہوں گی۔

منفعت:...... یہ ہے کہ کسی چیز کے استعمال کرنے سے بدن کی تقویت کا فائدہ ہوگا، اور نہ کرنے سے نہ ہلاکت کا اندیشہ ہے، نہ شدید تکلیف کا، اس حالت میں نہ کسی حرام کا استعمال جائز ہے، نہ روزہ کے اِفطار کی اجازت ہے، کسی حلال چیز سے یہ نفع حاصل ہوسکتا ہو تو کرے، ورنہ صبر کرے۔

زینت:...... یہ ہے کہ اس میں بدن کی تقویت بھی نہ ہو، محض تفریحِ طبع ہو، ظاہر ہے کہ اس کے لئے کسی ناجائز چیز کے جواز کی گنجائش کہاں ہوسکتی ہے؟

فضول:...... یہ کہ تفریح سے بھی آگے محض ہوس رانی مقصود ہو۔

ہماری بحث چونکہ اِضطرار کی حالت سے ہے، اس لئے یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اِضطرار کی حالت میں کسی حرام چیز کے استعمال کی تین شرطیں ہیں:

الف:......مریض کی حالت واقعتاً ایسی ہو کہ حرام چیز کے استعمال نہ کرنے سے جان کا خطرہ ہو۔

ب:...... یہ خطرہ محض وہمی نہ ہو بلکہ کسی معتمد حکیم یا ڈاکٹر کے کہنے کی بنا پر یقینی ہو، اور کسی حلال چیز سے علاج ممکن نہ ہو۔

ج:......اس حرام چیز سے جان کا بچ جانا بھی کسی معتمد حکیم یا مستند ڈاکٹر کی رائے میں عادۃً یقینی ہو۔

ان شرائط کے ساتھ حرام چیز کا استعمال مباح ہوجاتا ہے، مگر پھر بھی بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ رہیں گی، مثلاً ایک شخص کی جان بچانے کے لئے دُوسرے کی جان لینا جائز نہیں، کہ دونوں کی جان یکساں محترم ہے۔

پنجم:......غیر اِضطراری حالت میں علاج کی شرعی سہولت:

اگر اِضطرار کی حالت تو نہ ہو (جس میں جان کا خطرہ ہوتا ہے) مگر بیماری اور تکلیف کی شدّت سے مریض بے چین ہے (اسی حالت کو اُوپر حاجت سے تعبیر کیا گیا) تو اس صورت میں حرام اور نجس دوا کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ چونکہ اس کا حکم قرآن وسنت میں صراحتاً مذکور نہیں اس لئے فقہائے اُمت کا اس میں اختلاف ہے، بعض حضرات کے نزدیک جائز نہیں، اور جمہور فقہاء مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ اس کی اجازت دیتے ہیں، یعنی کسی معتمد ڈاکٹر یا حکیم کی رائے میں اس کے علاوہ کوئی علاج نہ ہو، اور اس حرام چیز سے شفا حاصل ہونے کا پورا وثوق ہو۔

ان مقدمات کی روشنی میں اب زیرِ بحث دونوں مسئلوں کا حکم لکھا جاتا ہے۔

خون کا مسئلہ

سوال:......ایک انسان کا خون دُوسرے کے بدن میں داخل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:......خون، انسان کا جزو ہے، اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو نجس بھی ہے، انسان کا جزو ہونے کی حیثیت سے اس کی مثال عورت کے دُودھ کی ہوگی جس کا استعمال علاج کے لئے فقہاء نے جائز لکھا ہے (عالمگیری ج:۴ ص:۱۱۲، طبع مصر)، خون

کو بھی اگر اسی پر قیاس کرلیا جائے تو یہ قیاس بعید نہیں ہوگا، البتہ اس کی نجاست کے پیشِ نظر اس کا حکم وہی ہوگا جو حرام اور نجس چیزوں کے استعمال کا اُوپر مقدمہ میں ذکر کیا گیا، یعنی:

۱:...... جب مریض اِضطراری حالت میں ہو، اور ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دیئے بغیر اس کی جان بچانے کا کوئی راستہ نہ ہو تو خون دینا جائز ہے۔

۲:...... جب ماہر ڈاکٹر کی نظر میں خون دینے کی ''حاجت'' ہو، یعنی مریض کی ہلاکت کا خطرہ تو نہ ہو لیکن اس کی رائے میں خون دیئے بغیر صحت کا امکان نہ ہو تب بھی خون دینا جائز ہے۔

۳:...... جب خون نہ دینے کی صورت میں ماہر ڈاکٹر کے نزدیک مرض کی طوالت کا اندیشہ ہو، اس صورت میں خون دینے کی گنجائش ہے، مگر اجتناب بہتر ہے، کما فی الهندية: ''وان قال الطبيب يتعجل شفائك فيه وجهان.'' (ج:۵ ص:۳۳۵)

۴:...... جب خون دینے سے محض منفعت یا زینت مقصود ہو، یعنی ہلاکت یا مرض کی طوالت کا اندیشہ نہ ہو، بلکہ محض قوّت بڑھانا یا حسن میں اضافہ کرنا مقصود ہو، تو ایسی صورت میں خون دینا ہرگز جائز نہیں۔

سوال دوم:...... کیا کسی مریض کو خون دینے کے لئے اس کی خرید و فروخت اور قیمت لینا بھی جائز ہے؟

جواب:...... خون کی بیع تو جائز نہیں، لیکن جن حالات میں، جن شرائط کے ساتھ نمبر اوّل میں مریض کو خون دینا جائز قرار دیا ہے، ان حالات میں اگر کسی کو خون بلا قیمت نہ ملے تو قیمت دے کر خون حاصل کرنا صاحبِ ضرورت کے لئے جائز ہے، مگر خون دینے والے کے لئے اس کی قیمت لینا دُرست نہیں۔

سوال سوم:...... کسی غیر مسلم کا خون مسلم کے بدن میں داخل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب:...... نفسِ جواز میں کوئی فرق نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ کافر یا فاسق فاجر انسان کے خون میں جو اثراتِ خبیثہ ہیں ان کے منتقل ہونے اور اخلاق پر اثر انداز ہونے کا قوی خطرہ ہے، اسی لئے صلحائے اُمت نے فاسقہ عورت کا دُودھ پلوانا بھی پسند نہیں کیا،

اس لئے کافر اور فاسق فاجر انسان کے خون سے حتی الوسع اجتناب بہتر ہے۔

سوال چہارم:......شوہر اور بیوی کے باہم تبادلۂ خون کا کیا حکم ہے؟

جواب:......میاں بیوی کا خون اگر ایک دُوسرے کو دیا جائے تو شرعاً نکاح پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نکاح بدستور قائم رہتا ہے، واللہ اعلم!

اعضائے انسانی کا مسئلہ

سوال:...... کسی بیمار یا معذور انسان کا علاج دُوسرے زندہ یا مردہ انسان کے اعضاء کا جوڑ لگاکر کرنا کیسا ہے؟

جواب:......اس وقت تک ڈاکٹروں نے بھی زندہ انسان کے اعضاء کا استعمال کہیں تجویز نہیں کیا، اس لئے اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ بحث طلب مسئلہ وہ ہے جو آج کل ہسپتالوں میں پیش آرہا ہے، اور جس کے لئے اپیلیں کی جارہی ہیں، وہ یہ کہ جو انسان دُنیا سے جارہا ہو، خواہ کسی عارضے کے سبب یا کسی جرم میں قتل کئے جانے کی وجہ سے، اس کی اجازت اس پر لی جائے کہ مرنے کے بعد اس کا فلاں عضو لے کر کسی دُوسرے انسان میں لگادیا جائے۔

بظاہر یہ صورت مفید ہی مفید ہے کہ مرنے والے کے تو سارے ہی اعضاء فنا ہونے والے ہیں، ان میں سے کوئی عضو اگر کسی زندہ انسان کے کام آجائے اور اس کی مصیبت کا علاج بن جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ یہ ایسا معاملہ ہے کہ عام لوگوں کی نظر صرف اس کے مفید پہلو پر جم جاتی ہے اور اس کے وہ مہلک نتائج نظروں سے اوجھل ہوجاتے ہیں جن کا کچھ ذکر شروع بحث میں آچکا ہے (اصل کتاب میں اس کے مضر پہلوؤں پر مفصل بحث کی گئی ہے، تلخیص میں وہ حصہ حذف کردیا گیا)۔

مگر شریعتِ اسلام کے لئے، جو انسان اور انسانیت کی ظاہری اور معنوی صلاح و فلاح کی ضامن ہے، اس کے مضر اور مہلک نتائج سے صرفِ نظر کرلینا اور محض ظاہری فائدے کی بنا پر اس کی اجازت دے دینا ممکن نہیں۔ شریعتِ اسلام نے صرف زندہ انسان کے کارآمد اعضاء ہی کا نہیں بلکہ قطع شدہ بیکار اعضاء و اجزاء کا استعمال بھی حرام قرار دیا ہے،

اور مردہ انسان کے کسی عضو کی قطع و برید کو بھی ناجائز کہا ہے، اور اس معاملے میں کسی کی رضامندی اور اجازت سے بھی اس کے اعضاء واجزاء کے استعمال کی اجازت نہیں دی، اور اس میں مسلم و کافر سب کا حکم یکساں ہے، کیونکہ یہ انسانیت کا حق ہے جو سب میں برابر ہے، تکریمِ انسان کو شریعتِ اسلام نے وہ مقام عطا کیا ہے کہ کسی وقت، کسی حال میں، کسی کو انسان کے اعضاء واجزاء حاصل کرنے کی طمع دامن گیر نہ ہو، اور اس طرح یہ مخدومِ کائنات اور اس کے اعضاء عام استعمال کی چیزوں سے بالاتر رہیں، جن کو کاٹ چھانٹ کر یا کوٹ پیس کر غذاؤں اور دواؤں اور دُوسرے مفادات میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس پر ائمۂ اربعہؒ اور پوری اُمت کے فقہاء متفق ہیں، اور نہ صرف شریعتِ اسلام بلکہ شرائعِ سابقہ اور تقریباً ہر مذہب و ملت میں یہی قانون ہے، واللہ اعلم!

انسانی اعضاء کی حرمت

س...... میں ایم بی بی ایس کے سال آخر کی طالبہ ہوں، میں آپ کے مشورے اخبار ''جنگ'' کے کالم میں پڑھتی رہتی ہوں، اس وقت میں بھی اپنا ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ اس وقت میری سِول اسپتال کے وارڈ S.I.U.T (سندھ انسٹیٹیوٹ آف یورولوجی اینڈ ٹرانسپلائیزیشن) میں پوسٹنگ لگی ہوئی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے پاکستان میں پہلی دفعہ Cadaver Kidney Transplantation (مردہ جسم سے گردہ نکال کر زندہ آدمی کے لگانا) ہوا ہے۔ یہ S.I.U.T میں ہی پرفارم کیا گیا ہے اور آج کل میں دُوسرا اس نوعیت کا آپریشن ہونے والا ہے۔ یہ دونوں گردے جو مردہ اشخاص کے جسم سے نکالے گئے، باہر کے ملک سے بھیجے گئے ہیں۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ اس وارڈ کی جو ایڈمنسٹریشن ہیں وہ ہم سب اسٹوڈنٹس کے ساتھ مل کر یہ ڈسکشن کرنا چاہتی ہیں کہ آیا اگر کوئی ہم سے کہے کہ ہم مرنے کے بعد اپنے جسم کا کوئی عضو کسی مرتے ہوئے انسان کی جان بچانے کے لئے دے دیں تو ہمارا کیا رَدِّ عمل ہوگا؟ ان کا کہنا ہے کہ کچھ لوگ اسلامی نقطۂ نظر سے اس بات کو غلط سمجھتے ہیں، تو سعودی عرب

بھی ایک اسلامی ملک ہے اور وہاں شاید ۷ یا ۸ سال سے کیڈاویر ٹرانسپلانٹ ہو رہا ہے۔ میری کچھ اور دوستوں کا کہنا یہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک انسان کی جان بچانا ساری انسانیت کی جان بچانا ہے۔ تو اس لئے اگر ہم Donorcard بھر دیں کہ ہمارے مرنے کے بعد ہمارے جسم سے ہمارا کوئی بھی عضو نکال کر کسی کے لگا دیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

میرا اپنا اس بارے میں یہ خیال ہے کہ اس طرح کرنا مُردے کی بے حرمتی ہے اور یہ اسلام میں جائز نہیں۔ اب میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ قرآن و سنت کی روشنی میں یہ فرمائیے کہ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ پلیز آپ اپنے دلائل ثبوت کے ساتھ دیجئے گا تاکہ مجھے آپ کا موقف دُوسروں تک پہنچانے اور سمجھانے میں آسانی رہے۔

ج...... اس مسئلے میں آپ کا موقف صحیح ہے، اور آپ کی رفیقاؤں کا موقف غلط ہے، اس سلسلے میں چند باتیں ذہن میں رکھی جائیں:

۱:...... آپ کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص مرنے سے پہلے ایسی وصیت کر جائے کہ اس کے جسم کے اجزاء نکال کر کسی ضرورت مند کے بدن میں لگا دیئے جائیں، تب تو اس کے بدن کے اجزاء نکالے جاتے ہیں، ورنہ نہیں۔ گویا یہ اُصول تسلیم کرلیا گیا ہے کہ مرنے والے کی اجازت کے بغیر اس کے بدن کے اجزاء استعمال نہیں کئے جاسکتے۔

۲:...... اب جو لوگ کہ کسی دین و مذہب کے قائل ہی نہیں، یا دین و مذہب کے قائل تو ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ مذہب ہماری زندگی کے جائز و ناجائز سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، ایسے لوگوں کو تو مذکورہ بالا اجازت نامے کے لئے مذہب سے اجازت لینے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا ہمارا دین و مذہب اس کی اجازت دیتا ہے یا نہیں؟ اگر مذہب کی طرف سے اجازت ہو تو مذکورہ بالا وصیت جائز ہوگی، ورنہ ایسی وصیت غلط اور لغو و باطل ہوگی۔

۳:...... یہ اُصول طے ہوا، تو اَب یہ دیکھنا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے اعضاء کا اور اس کے وجود کا مالک بنایا ہے؟ آدمی ذرا بھی غور کرے تو معلوم ہوجائے گا

کہ انسان کا وجود اور اس کے اعضاء اس کی ملکیت نہیں۔

بلکہ یہ ایک سرکاری مشین ہے جو اس کے استعمال کے لئے اس کو دی گئی ہے، اور سرکاری چیز سمجھ کر اس کی حفاظت و نگرانی بھی اس کے ذمہ لگائی ہے، لہٰذا اس کو ان اعضاء کے تلف کرنے کی اجازت نہیں، نہ فروخت کرنے ہی کی اجازت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو خودکشی کی اجازت نہیں بلکہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص خودکشی کرے وہ تا قیامت اسی عذاب میں مبتلا رہے گا۔ پس جب انسان اپنے وجود کا مالک نہیں تو اعضاء کو فروخت بھی نہیں کرسکتا، نہ ہبہ کرسکتا ہے، نہ اس کی وصیت کرسکتا ہے، اور اگر ایسی وصیت کر جائے تو یہ وصیت غیر ملک میں ہونے کی وجہ سے باطل ہوگی۔

۴:...... علاوہ ازیں احترامِ آدمیت کا بھی تقاضا ہے کہ اس کے اعضاء کو "بکاؤ مال" اور استعمال کی چیز نہ بنایا جائے، پس اعضاء ہبہ کی وصیت کرنا احترامِ آدمیت کے خلاف ہے۔

۵:...... عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد آدمی بے حس ہوتا ہے، یہ خیال بھی صحیح نہیں، وہ صرف ہمارے جہان اور ہمارے مشاہدے کے اعتبار سے بے حس نظر آتا ہے، ورنہ دُوسری زندگی کے اعتبار سے اس میں احساس موجود ہے۔ اس بنا پر مردہ کے جسم کی چیر پھاڑ جائز نہیں کہ اس سے مردہ کو بھی ایسی ہی تکلیف ہوتی ہے جیسی زندہ آدمی کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے یعنی: "میّت کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسے زندہ کی ہڈی توڑنا۔" (مشکوٰۃ، باب دفن المیّت، فصل دوم کی آخری حدیث نمبر:۱۷۱۴)

۶:...... لوگ اپنی زندگی میں نہ آنکھوں کا عطیہ دیتے ہیں، نہ گردوں کا، کیونکہ جانتے ہیں کہ اس زندگی میں اس کو خود ان اعضاء کی ضرورت ہے، لیکن مرنے کے بعد کے لئے بڑی فیاضی سے وصیت کر جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس زندگی کو تو زندگی سمجھتے ہیں لیکن مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے، یوں سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد اعضاء گل سڑ جائیں گے، خاک میں مل جائیں گے اور ان اعضاء کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ یہی عقیدہ کفارِ مکہ کا تھا اور یہی عقیدہ عام کافروں کا ہے۔ جو مسلمان ایسی وصیت کرتے ہیں وہ بھی انہی کافروں کے عقیدے کے مطابق مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے۔

الغرض! اعضائے انسانی کی پیوندکاری جائز نہیں، اور ان اعضاء کے ہبہ کی وصیت باطل ہے۔

کیا نوسال کی عمر میں کوئی لڑکی بالغ ہوسکتی ہے؟

س...... عورت کے بالغ ہونے کی کم از کم کتنی مدّت ہے؟ بعض لوگ حضرت عائشہؓ کی نوسال کی رُخصتی پر اعتراض کرتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟ مدلل و مفصل جواب دیں۔

ج...... یہ صرف ملحدین اور منکرینِ حدیث کی اُڑائی ہوئی بات ہے، ورنہ لڑکی نوسال کی بالغ ہوسکتی ہے، اس سلسلے میں روزنامہ ''جنگ'' کی خبر ملاحظہ ہو:

> ''برازیل میں ایک ۹ سالہ لڑکی گزشتہ ماہ ایک بچی کو جنم دے کر دُنیا کی کمسن ترین ماں بن گئی۔ اخبار ڈیلی مرر نے بدھ کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ ماریا ایلاینی جیمز نے ۲۵/مارچ کو شمالی برازیل کے قصبہ ژاکوئی میں آپریشن کے ذریعے بچی کو جنم دیا، نوزائیدہ بچی کے باپ کی عمر ۱۶ برس بتائی جاتی ہے۔ ماریا ایلاینی کی خود کی ماں اسے جنم دینے کے بعد مرگئی تھی جس کے بعد سے ایک ۶۲ سالہ بے زمین کاشتکار نے اس کی کفالت کی۔ مرر نے کمسن ماں اور اس کی نوزائیدہ بچی کی تصویر بھی شائع کی ہے۔''

(روزنامہ ''جنگ'' کراچی ۱۰/اپریل ۱۹۸۶ء ص:۱۰)

۱۶/اپریل کے اخبارات میں اس ''کمسن ماں'' اور اس کی نومولود بچی کی تصویریں بھی شائع ہوئی ہیں۔ خیال ہے کہ برازیل کے اخبار ''ڈیلی مرر'' کے حوالے سے یہ عجیب و غریب خبر دُنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہوئی ہوگی۔ ماریا ایلاینی کا دُنیا کی سب سے ''کمسن ماں'' بن جانا بلاشبہ ایک اعجوبہ ہے، لیکن یہ واقعہ خود کتنا ہی عجیب و غریب ہو چونکہ وجود اور مشاہدے میں آچکا ہے اس لئے کوئی عاقل یہ کہہ کر اس کا انکار نہیں کرسکتا کہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے؟

صحیح بخاری شریف اور حدیث و سیر اور تاریخ کی تمام کتابوں میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شادی اور رُخصتی کا واقعہ خود اُمّ المؤمنینؓ ہی کی زبانی یوں منقول ہے:

"ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم تزوجها وهی بنت ست سنین، وادخلت علیه وهی بنت تسع، ومکثت عنده تسعًا." (صحیح بخاری ج:۲ ص:۷۷۱)

ترجمہ:...... "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے عقد کیا جب وہ چھ سال کی تھیں، اور ان کی رُخصتی ہوئی جبکہ وہ نو سال کی تھیں، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نو سال رہیں۔"

فقہائے اُمت نے اس حدیث سے متعدّد مسائل اخذ کئے ہیں، مثلاً ایک یہ کہ والد اپنی نابالغ اولاد لڑکی، لڑکے کا نکاح کرسکتا ہے، چنانچہ امام بخاریؒ نے اس پر باب باندھا ہے: "باب النکاح الرجل ولده الصغار" یعنی آدمی کا اپنی کمسن اولاد کا نکاح کردینا۔

اس کے ذیل میں حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں:

"قال المهلب: اجمعوا انه یجوز للأب تزویج ابنته الصغیرة البکر ولو کانت لا یطا مثلها، الا ان الطحاوی حکی عن ابن شبرمة منعه فیمن لا توطا، وحکی ابن حزم عن ابن شبرمة مطلقًا ان الأب لا یزوج بنته البکر الصغیرة حتی تبلغ، وتاذن، وزعم ان تزویج النبی صلی اللہ علیه وسلم وهی بنت ست سنین کان من خصائصه." (حاشیہ بخاری ص:۷۷۱، فتح الباری ج:۹ ص:۱۹۰)

ترجمہ:...... "مہلبؒ فرماتے ہیں کہ: اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کہ باپ کے لئے جائز ہے کہ اپنی چھوٹی کنواری بیٹی کا عقد کردے، اگرچہ وہ وظیفۂ زوجیت کے لائق نہ ہو۔ البتہ امام طحاویؒ

نے ابنِ شبرمہؒ سے نقل کیا ہے کہ جو لڑکی وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کے قابل نہیں، باپ اس کا نکاح نہیں کرسکتا، اور ابنِ حزمؒ نے ابنِ شبرمہؒ سے نقل کیا ہے کہ باپ چھوٹی بچی کا نکاح نہیں کرسکتا، یہاں تک کہ وہ بالغ ہوجائے، اور اجازت دیدے، ابنِ شبرمہؒ کا خیال ہے کہ حضرت عائشہؓ کا چھ سال کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عقد کیا جانا آپؐ کی خصوصیت ہے۔''

گویا اُمت کے تمام فقہاء و محدثین، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ کو تسلیم کرتے ہیں، اور اس پر اَحکام کی تفریع کرتے ہیں، چودہ صدیوں کے کسی عالم نے اس واقعہ کا انکار نہیں کیا، لیکن منکرینِ حدیث اور ملاحدہ اس واقعہ کا (جو حدیث، سیرت، تاریخ اور فقہ کی بے شمار کتابوں میں درج اور چودہ صدیوں کی پوری اُمت کا مُسلَّمہ واقعہ ہے) انکار کرتے ہیں، اور انکار کی دلیل صرف یہ کہ نو سال کی بچی کی رُخصتی کیسے ہوسکتی ہے؟ حالانکہ نو سال کی لڑکی بالغ ہوسکتی ہے، چنانچہ ''ہدایہ'' میں ہے:

وأدنی المدة لذالک فی حق الغلام اثنا عشرة سنة وفی حق الجارية تسع سنين.'' (ج:۳ ص:۳۵۶)

ترجمہ:...... ''بلوغ کی ادنیٰ مدّت لڑکے کے حق میں بارہ سال اور لڑکی کے حق میں نو سال ہے۔''

بہرحال یہاں اس مسئلے پر گفتگو مقصود نہیں، بلکہ کہنا یہ ہے کہ اگر کوئی عجیب واقعہ اخبارات میں چھپتا ہے تو ہمارے پڑھے لکھے، روشن خیال حضرات کو نہ کوئی اِشکال ہوتا ہے، اور نہ اس کے تسلیم کرنے میں کوئی جھجک محسوس ہوتی ہے، اور نہ کسی کو انکار کی جرأت ہوتی ہے، اور اگر کوئی ایسے واقعہ کا انکار کردے تو ہمارا روشن خیال طبقہ اس کو احمق کہتا ہے۔ لیکن اسی نوعیت کا بلکہ اس سے بھی ہلکی نوعیت کا کوئی واقعہ حدیث کی کتابوں میں نظر آجاتا ہے تو اس کا فوراً انکار کردیا جاتا ہے، اس کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، احادیث اور محدثین پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کردی جاتی ہے، اور غریب مُلَّا کو پیٹ بھر کر گالیاں دی جاتی ہیں، اور کبھی کبھی

اَزراہِ ہمدردی کتبِ حدیث کی ''اصلاح'' کا اعلان کردیا جاتا ہے، اور ایک دہائی بڑھا کر ''چھ'' کو ''سولہ'' اور ''نو'' کو ''اُنیس'' بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور اتنی تمیز سے بھی کام نہیں لیا جاتا کہ جس طرح اُردو میں ''چھ'' کا اِملا ''سولہ'' کے ساتھ اور ''نو'' کا ''اُنیس'' کے ساتھ نہیں ہوسکتا، اسی طرح عربی میں یہ ناممکن ہے۔

سوال یہ ہے کہ اخبارات میں درج شدہ واقعات کو بلاچوں وچرا مان لینا، اور اسی نوعیت کے حدیث میں درج شدہ واقعات پر سو سو طرح کے شبہات ظاہر کرنا، اس کا اصل منشا کیا ہے؟ اس کا منشا یہ ہے کہ ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتِ رسالت ونبوّت پر ایمان نہیں اور ان کے دِل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احوال اور افعال کی عظمت نہیں، اس لئے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے خارقِ عادت واقعات کا بڑی جرأت و دلیری سے انکار کردیتے ہیں۔

پہلی بیوی کو خودکشی سے بچانے کے لئے تین طلاق کا حکم

س…… کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے کے بارے میں کہ: زید کی دو بیویاں ہیں، پہلی کا نام زینب اور دُوسری کا نام نرگس ہے۔ زید کو زینب نے دھمکی دی کہ اگر وہ اپنی بیوی نرگس کو فوراً طلاق نہیں دے گا تو وہ خودکشی کرلے گی۔ زید اپنی دُوسری بیوی نرگس کو ہرگز طلاق نہیں دینا چاہتا تھا، لیکن زینب کی زبردستی کرنے اور اس کی جان جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے اس نے نرگس کی غیرموجودگی میں زینب کے سامنے دو مرتبہ طلاق کہی۔ پھر اس کی مزید زبردستی کی وجہ سے تین مرتبہ، طلاق، طلاق، طلاق کہا، جبکہ نرگس حاملہ بھی ہے، زینب نے تین چار روز بعد نرگس کو یہ بات بتائی، (واضح رہے کہ زید سمجھتا تھا کہ اس طرح طلاق نہیں ہوتی)۔ قرآن وسنت کی روشنی میں یہ بات بتائیں کہ طلاق ہوگئی یا نہیں؟ اس سلسلے میں بہت سے علمائے کرام سے فتویٰ بھی حاصل کئے گئے ہیں جن میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں، براہِ کرم وضاحت فرمائیں کہ کون سا موقف دُرست ہے؟

ج…… اس استفتاء کے ساتھ پندرہ فتاویٰ اس ناکارہ کے پاس بھیجے گئے ہیں، جن کا استفتاء

میں حوالہ دیا گیا ہے، ان فتاویٰ کی فہرست درج ذیل ہے:

۱:...... جناب مفتی عبدالمنان۔ تصدیق مفتی عبدالرؤف صاحب، دارالعلوم کورنگی، کراچی۔

۲:...... جناب مفتی کمال الدین۔ تصدیق جناب مفتی اصغر علی، دارالعلوم کورنگی، کراچی۔

۳:...... جناب مفتی انعام الحق۔ تصدیق جناب مفتی عبدالسلام، جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن کراچی۔

۴:...... جناب مفتی فضل غنی، دارالعلوم جامعہ بنوریہ، سائٹ، کراچی۔

۵:...... جناب مفتی غلام رسول۔ تصدیق مفتی شریف احمد طاہر، جامعہ رشیدیہ ساہیوال (پنجاب)۔

۶:...... جناب مفتی محمد عبداللہ، دارالعلوم قمر الاسلام سلیمانیہ، پنجاب کالونی، کراچی۔

۷:...... جناب مفتی محمد اسلم نعیمی، مجلس علمائے اہل سنت کراچی۔

۸:...... جناب مفتی محمد فاروق۔ تصدیق مفتی محمد اکمل، دارالافتاء مدرسہ اشرفیہ، جیکب لائن کراچی۔

۹:...... جناب مفتی محمد جان نعیمی، دارالعلوم مجددیہ نعیمیہ، ملیر، کراچی۔

۱۰:...... جناب مفتی غلام دستگیر افغانی، جامعہ ضیاء العلوم، آگرہ تاج کالونی، کراچی۔

۱۱:...... مفتی لطافت الرحمٰن، جامعہ حنفیہ، سعود آباد، کراچی۔

۱۲:...... مفتی محمد عبدالعلیم قادری، دارالعلوم قادریہ سبحانیہ، فیصل کالونی کراچی۔

۱۳:...... جناب مفتی محمد رفیق، دارالعلوم، جامعہ اسلامیہ، گلزار حبیب، سولجر بازار، کراچی۔

۱۴:...... جناب مفتی شعیب بن یوسف، مدرسہ بحر العلوم سعودیہ، عامل اسٹریٹ کراچی۔

۱۵:...... جناب مفتی محمد ادریس سلفی، جماعت غربائے اہلِ حدیث، محمدی مسجد، برنس روڈ کراچی۔

ان میں سے اوّل الذکر تیرہ فتوے اس پر متفق ہیں کہ نرگس پر تین طلاقیں واقع

ہوچکی ہیں اور وہ حرمتِ مغلظہ کے ساتھ اپنے شوہر پر حرام ہوچکی ہے، نہ رُجوع کی گنجائش ہے اور نہ شرعی حلالہ کے بغیر دوبارہ نکاح کی گنجائش ہے۔

اس ناکارہ کے نزدیک یہ تیرہ فتوے صحیح ہیں کہ نرگس اپنے شوہر پر حرمتِ مغلظہ کے ساتھ حرام ہوگئی، اب ان دونوں کے میاں بیوی کی حیثیت سے رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اس مسئلے کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱:......حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

”اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ... الٰی قولہ ... فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ....“ (البقرۃ:۲۲۹،۲۳۰)

ترجمہ:......”وہ طلاق دو مرتبہ (کی) ہے، پھر خواہ رکھ لینا قاعدے کے موافق، خواہ چھوڑ دینا خوش عنوانی کے ساتھ، اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ (چھوڑنے کے وقت) کچھ بھی لو (گو) اس میں سے (سہی) جو تم نے ان کو (مہر میں) دیا تھا، مگر یہ کہ میاں بیوی دونوں کو احتمال ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہ کرسکیں گے، سو اگر تم لوگوں کو یہ احتمال ہو کہ وہ دونوں ضوابطِ خداوندی کو قائم نہ کرسکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑالے، یہ خدائی ضابطے ہیں، سو تم ان سے باہر مت نکلنا، اور جو شخص خدائی ضابطوں سے بالکل باہر نکل جائے، سو ایسے ہی لوگ اپنا نقصان کرنے والے ہیں۔ پھر اگر کوئی (تیسری) طلاق دیدے عورت کو تو پھر وہ اس کے لئے حلال نہ رہے گی اس کے بعد، یہاں تک کہ وہ اس کے سوا ایک اور خاوند کے ساتھ (عدّت کے بعد) نکاح کرلے،

پھر اگر یہ اس کو طلاق دیدے تو ان دونوں پر اس میں کچھ گناہ نہیں کہ بدستور پھر مل جاویں، بشرطیکہ دونوں غالب گمان رکھتے ہوں کہ (آئندہ) خداوندی ضابطوں کو قائم رکھیں گے، اور یہ خداوندی ضابطے ہیں، حق تعالیٰ ان کو بیان فرماتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے جو دانش مند ہیں۔"

اس آیتِ شریفہ میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے دو مرتبہ کی طلاق کے بعد تیسری طلاق دے دی تو بیوی حرمتِ مغلظہ کے ساتھ حرام ہوجائے گی، اور تمام مفسرین اس پر متفق ہیں کہ یہ تیسری طلاق خواہ اسی مجلس میں دی گئی ہو یا الگ طہر میں، دونوں کا ایک ہی حکم ہے، چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "باب من اجاز الطلاق الثلاث" میں اس آیت کا حوالہ دے کر بتایا ہے کہ تین طلاقیں خواہ بیک وقت دی گئی ہوں، تین ہی نافذ ہوجاتی ہیں۔ (صحیح بخاری ج:۲ ص:۷۹۱)

۲:...... امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مندرجہ بالا باب کے ذیل میں عویمر عجلانی رضی اللہ عنہ اور ان کی بیوی کے لعان کا واقعہ ذکر کیا ہے، جس کے آخر میں ہے کہ حضرت عویمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

"کذبت علیھا یا رسول اللہ ان امسکتھا، فطلقھا ثلاث قبل أن یأمرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم." (صحیح بخاری ج:۲ ص:۷۹۱)

ترجمہ:...... "یا رسول اللہ! اگر اس کے بعد میں اس کو رکھوں تو میں نے اس پر جھوٹ باندھا، پس انہوں نے قبل اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں حکم دیتے، اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔"

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے یہ ثابت کیا ہے کہ تین طلاقیں خواہ بیک وقت دی جائیں، واقع ہوجاتی ہیں۔ اور حافظ ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے عویمر رضی اللہ عنہ نے تین طلاقیں دیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر گرفت نہیں فرمائی، اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تین طلاقیں بیک وقت دینا صحیح ہے۔ (المحلی ج:۱۰ ص:۱۷۰)

۳:......امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی باب میں یہ حدیث ذکر کی ہے کہ: رفاعہ قرظی رضی اللہ عنہ کی بیوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور کہا: یا رسول اللہ! رفاعہؓ نے مجھے طلاق دے دی، پس پکی طلاق دے دی۔ (صحیح بخاری ج:۲ ص:۷۹۱)

اس حدیث میں ''پکی طلاق دے دی'' (بت طلاقی) سے مراد تین طلاقیں ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تفصیل دریافت نہیں فرمائی کہ یہ تین طلاقیں ایک ہی مجلس میں دی تھیں یا الگ الگ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ دونوں کا ایک ہی حکم ہے، یعنی حرمتِ مغلظہ۔

۴:......اسی باب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عائشہؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ: ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، اس نے دُوسرے شوہر سے (عدّت کے بعد) نکاح کرلیا، اور دُوسرے شوہر نے بھی اس کو طلاق دے دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ: کیا وہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہوگئی؟ فرمایا: نہیں! یہاں تک کہ دُوسرے شوہر سے صحبت بھی کرے، جیسا کہ پہلے سے کی تھی۔ (صحیح بخاری ج:۲ ص:۷۹۱)

۵:......صحیح مسلم میں فاطمہ بنت قیسؓ کا واقعہ مذکور ہے کہ: ان کے شوہر نے ان کو تین طلاقیں دی تھیں، ان کے نفقہ وسکنیٰ کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے لئے نفقہ وسکنیٰ نہیں ہے۔ (صحیح مسلم ج:۱ ص:۴۸۳)

حافظ ابنِ حزم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: یہ خبر متواتر ہے کہ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ اس کے شوہر نے اس کو تین طلاقیں دے دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاقوں پر اعتراض نہیں فرمایا اور نہ یہ فرمایا کہ یہ خلافِ سنت ہے۔ (المحلی ج:۱۰ ص:۱۷۱)

۶:......امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت محمود بن لبید رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین

طلاقیں دے دی ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غضبناک ہوکر کھڑے ہوئے، پھر فرمایا کہ: کیا میرے موجود ہوتے ہوئے اللہ کی کتاب سے کھیلا جارہا ہے؟ (نسائی ج:۲ ص:۹۹)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر تین طلاقیں بیک وقت دی جائیں تو تین ہوتی ہیں، ورنہ اگر ایک ہی ہوتیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر غیظ و غضب کا اظہار نہ فرماتے۔

۷:...... امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے متعدّد طرق سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ رکانہ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیوی سہیمہ کو ''البتۃ'' طاق دے دی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر کہا کہ: میں نے ایک طلاق کا ارادہ کیا تھا، فرمایا: حلفاً کہتے ہو کہ ایک کا ارادہ کیا تھا؟ عرض کیا: اللہ کی قسم! میں نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بیوی اس کو واپس لوٹا دی۔ (ابوداؤد ج:۱ ص:۳۰۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رکانہ رضی اللہ عنہ سے فرمانا کہ: ''حلفاً کہتے ہو کہ تم نے ایک ہی کا ارادہ کیا تھا؟'' اس امر کی دلیل ہے کہ ''البتۃ'' کے لفظ سے بھی اگر تین طلاق کا ارادہ کیا جائے تو تین ہی واقع ہوتی ہیں، چہ جائیکہ صریح الفاظ میں تین طلاقیں دی ہوں۔

قرآن و حدیث کے ان دلائل کی روشنی میں ائمۂ اربعہ، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور تمام محدثین اس پر متفق ہیں کہ تین طلاقیں خواہ ایک لفظ سے ہوں، یا ایک مجلس میں، تین ہی شمار کی جائیں گی۔

فتویٰ نمبر:۱۴ ایک اہلِ حدیث کے قلم سے ہے، جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ تین طلاقیں جب ایک مجلس میں دی جائیں تو وہ ایک ہی طلاق شمار ہوتی ہے، لہٰذا نرگس پر ایک طلاق واقع ہوئی، عدّت کے اندر شوہر اس سے رُجوع کرسکتا ہے۔

اہلِ حدیث عالم کا یہ فتویٰ صریحاً غلط اور مذکورہ بالا آیت و احادیث کے علاوہ اجماعِ اُمت کے بھی خلاف ہے، کیونکہ تمام اکابر صحابہؓ اس پر متفق ہیں کہ ایک لفظ یا ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں تین ہی شمار ہوتی ہیں، اور بیوی حرمتِ مغلظہ کے ساتھ حرام

فہرست

ہوجاتی ہے، خلفائے راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے چند فتاویٰ بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

۱:......حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں کوئی ایسا شخص لایا جاتا جس نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاقیں دی ہوں، آپؓ اس کو سزا دیتے اور دونوں کے درمیان تفریق کرادیتے۔

(مصنف ابنِ ابی شیبہ ج:۶ ص:۱۱، مصنف عبدالرزاق ج:۶ ص:۳۹۶)

۲:......زید بن وہب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: ایک شخص نے اپنی بیوی کو ہزار طلاق دے دی، معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش ہوا تو اس شخص نے کہا کہ: میں تو یونہی کھیل رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے سر پر درہ اُٹھایا اور دونوں کے درمیان علیحدگی کرادی۔ (ابنِ ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۳، عبدالرزاق ج:۶ ص:۳۹۳)

۳:......ایک شخص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور کہا: میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دیں۔ فرمایا: تین طلاقیں اس کو تجھ پر حرام کردیتی ہیں، اور ستانوے عدوان (ظلم وزیادتی اور حدودِ الٰہی سے تجاوز) ہے۔ (ابنِ ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۳)

۴:......ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ اس نے اپنی بیوی کو ہزار طلاقیں دے دی ہیں۔ فرمایا: تین طلاقیں اس کو تجھ پر حرام کردیتی ہیں، باقیوں کو اپنی دُوسری عورتوں پر تقسیم کردو۔ (ابنِ ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۳)

۵:......حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص آیا اور کہا کہ: میں نے اپنی بیوی کو ۹۹ طلاقیں دی ہیں۔ فرمایا: پھر لوگوں نے تجھ سے کیا کہا؟ کہنے لگا کہ: لوگوں نے یہ کہا کہ تیری بیوی تجھ پر حرام ہوگئی۔ فرمایا: لوگوں نے تیرے ساتھ شفقت و نرمی کرنا چاہی ہے (کہ صرف بیوی کو حرام کہا)، وہ تین طلاقوں کے ساتھ تجھ پر حرام ہوگئی، باقی طلاقیں ظلم وتعدی ہے۔ (ابنِ ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۲، عبدالرزاق ج:۶ ص:۳۹۵)

۶:......ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ: میں نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دی ہیں۔ فرمایا: تین طلاقوں نے اس کو حرام کردیا، باقی ۹۷ گناہ ہیں۔ (ابنِ ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۲)

۷:……حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیں، اس نے اپنے رَبّ کی نافرمانی کی اور اس کی بیوی اس پر حرام ہوگئی۔

(ابنِ ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۱)

۸:……ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ اس نے اپنی بیوی کو سومرتبہ طلاق دی ہے۔ فرمایا: تین کے ساتھ وہ تجھ پر حرام ہوگئی، اور ۹۷ کا اللہ تعالیٰ تجھ سے قیامت کے دن حساب لیں گے۔ (ابنِ ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۴)

۹:……ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ فرمایا: تیرے چچا نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، پس اللہ تعالیٰ نے اس کو ندامت میں ڈال دیا، اور اس کے نکلنے کی کوئی صورت نہیں رکھی۔

(ابنِ ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۱)

۱۰:…… ہارون بن عنترہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ: میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا، ایک شخص آیا اور کہا کہ: حضور! میں نے ایک ہی مرتبہ اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے ڈالیں، اب وہ تین طلاق کے ساتھ مجھ پر بائنہ ہوجائے گی یا ایک ہی طلاق ہوگی؟ فرمایا: تین کے ساتھ وہ تجھ پر بائنہ ہوگئی، اور ۹۷ کا گناہ تیری گردن پر رہا۔

(ابنِ ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۳)

۱۱:……ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: میں نے اپنی بیوی کو ایک ہزار ایک سو طلاقیں دی ہیں۔ فرمایا: تین کے ساتھ تجھ پر بائنہ ہوگئی، باقی ماندہ کا گناہ تجھ پر بوجھ ہے کہ تو نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو ہنسی مذاق بنایا۔ (ابنِ ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۳)

۱۲:……حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے عرض کیا گیا کہ: ایک شخص نے ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں۔ فرمایا: اس نے اپنے رَبّ کا گناہ کیا، اور اس کی بیوی اس پر حرام ہوگئی۔ (ابنِ ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۰)

۱۳:……حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ: ایک شخص نے اپنی بیوی کو سو طلاقیں دے دیں۔ فرمایا: تین نے بیوی کو اس پر حرام کردیا، باقی

ماندہ زائد رہیں۔ (ابنِ ابی شیبہ ج:۵ ص:۱۳)

۱۴:...... محمد بن ایاس بن بکیر کہتے ہیں کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو رُخصتی سے قبل تین طلاقیں دے دیں، پھر اس نے اس سے دوبارہ نکاح کرنا چاہا، وہ مسئلہ پوچھنے کے لئے آیا، میں بھی اس کے لئے مسئلہ پوچھنے کی خاطر اس کے ساتھ گیا، اس نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مسئلہ پوچھا، دونوں نے جواب دیا کہ ہمارے نزدیک وہ اس سے نکاح نہیں کرسکتا، یہاں تک کہ وہ دُوسری شادی نہ کرے۔ اس نے کہا کہ: میرا اسے طلاق دینا تو ایک ہی بار تھا، تو حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ: تیرے لئے جو کچھ بچ رہا تھا وہ تو نے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ (مؤطا امام مالکؒ ص:۵۲۱)

دُوسری روایت میں ہے کہ معاویہ بن ابی عیاش انصاری کہتے ہیں کہ: وہ عبداللہ بن زبیر اور عاصم بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھے تھے، اتنے میں محمد بن ایاس بن بکیر آئے اور کہا کہ: ایک بدوی نے اپنی بیوی کو رُخصتی سے پہلے تین طلاقیں دے دیں، اس مسئلے میں آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟ ابنِ زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے، حضرت ابنِ عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے پاس جاؤ، میں ان دونوں کو حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھے چھوڑ کر آیا ہوں، ان سے پوچھو اور واپس آکر ہمیں بھی بتاؤ۔ چنانچہ وہ ان دونوں کی خدمت میں گئے اور ان سے مسئلہ پوچھا، ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے کہا: ابوہریرہ! ان کو فتویٰ دیجئے، کیونکہ آپ کے سامنے پیچیدہ مسئلہ آیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک طلاق اس کو بائنہ کردیتی ہے، اور تین طلاقیں اس کو حرام کردیتی ہیں، یہاں تک کہ دُوسرے شوہر سے نکاح کرے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی فتویٰ دیا۔

(مؤطا امام مالک ص:۵۲۱، سننِ کبریٰ بیہقی ج:۷ ص:۳۳۵، شرح معانی طحاوی ج:۲ ص:۳۷)

۱۵:...... عطاء بن یسارؒ کہتے ہیں کہ: ایک شخص عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی خدمت میں فتویٰ لینے آیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو رُخصتی سے قبل تین طلاقیں دے دیں۔ عطاءؒ کہتے ہیں کہ: میں نے کہا کہ: جس عورت کی رُخصتی نہ ہوئی ہو اس کی طلاق تو ایک

فہرست

ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کہ: تو تو محض قصہ گو ہے (مفتی نہیں)، ایک طلاق اس کو بائنہ کردیتی ہے اور تین طلاقیں اس کو حرام کردیتی ہیں، یہاں تک کہ وہ دُوسرے شوہر سے نکاح کرے۔ (حوالہ بالا)

۱۶:...... حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مطلقہ ثلاثہ شوہر کے لئے حلال نہیں رہی، یہاں تک کہ دُوسرے شوہر سے نکاح کرے۔ (طحاوی شریف ج:۲ ص:۳۸)

۱۷:...... سوید بن غفلہ کہتے ہیں کہ: عائشہ خثیعمہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے نکاح میں تھیں، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے (اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ ان کی جگہ خلیفہ ہوئے) تو اس خاتون نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلافت کی مبارک باد دی۔ حضرت حسنؓ نے فرمایا: تو حضرت علیؓ کے قتل پر خوشی کا اظہار کرتی ہے؟ جا تجھے تین طلاق! انہوں نے فوراً اپنے کپڑوں سے اپنے بدن کو لپیٹ لیا اور عدّت میں بیٹھ گئیں، عدّت پوری ہوئی تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس کا بقیہ مہر اس کو بھیج دیا اور دس ہزار درہم بطور عطیہ کے دیئے، یہ عطیہ جب اس خاتون کو موصول ہوا تو کہا: ”متاع قلیل من حبیب مفارق“ (جدائی اختیار کرنے والے محبوب کی جانب سے تھوڑا سا سامان آیا ہے)۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو یہ خبر پہنچی تو رو پڑے، پھر فرمایا کہ: اگر میں نے اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث نہ سنی ہوتی (یا یہ فرمایا کہ اگر میرے والد ماجد نے مجھ سے یہ حدیث نہ بیان فرمائی ہوتی جو انہوں نے میرے نانا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی) کہ: ”جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں تین طہروں میں دے دیں، یا تین مبہم دے دیں تو وہ اس کے لئے حلال نہیں یہاں تک کہ دُوسرے شوہر سے نکاح کرے“ تو میں اس خاتون سے رُجوع کرلیتا۔ (سننِ کبریٰ ج:۷ ص:۳۳۶)

یہ صحابہ کرامؓ کے چند فتاویٰ ہیں، آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں تین خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں، اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہؓ بھی شامل ہیں، جو اپنے دور میں مرجعِ فتویٰ تھے، اور اس کے خلاف کسی صحابی سے

فہرست

ایک حرف بھی منقول نہیں، اس لئے یہ مسئلہ صحابہ کرامؓ کا اجماعی مسئلہ ہے کہ تین طلاقیں بہ لفظِ واحد تین ہی شمار ہوتی ہیں۔ چنانچہ چاروں مذاہب کے ائمہ، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ بھی صحابہ کرامؓ کے اس اجماعی فتویٰ پر متفق ہیں۔ یہی فتویٰ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری (ج:۲ ص:۷۹۱) میں ذکر فرمایا ہے، اور یہی فتویٰ حافظ ابنِ حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جیسا کہ انہوں نے المحلی (ج:۱۰ ص:۱۷۰) میں ذکر کیا ہے۔

الغرض ''تین طلاق کا تین ہونا'' ایک ایسی قطعی و یقینی حقیقت ہے جس پر تمام صحابہ کرامؓ بغیر کسی اختلاف کے متفق ہیں، اکابر تابعینؒ متفق ہیں، چاروں فقہی مذاہب متفق ہیں، لہٰذا جو شخص اس مسئلے میں صحابہ کرامؓ کے راستے سے منحرف ہے وہ روافض کے نقشِ قدم پر ہے اور حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

''وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ، وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔'' (النساء:۱۱۵)

ترجمہ:...... اور جو کوئی مخالفت کرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، جبکہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ، اور چلے سب مسلمانوں کے رَستے کے خلاف تو ہم حوالے کردیں گے اس کو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے ہم اس کو دوزخ میں اور وہ بہت بُری جگہ پہنچا۔''

اہلِ حدیث مفتی نے اپنے فتوے میں (جو اجماعِ صحابہؓ اور ائمۂ اربعہؒ کے اجماع کے خلاف ہے) جن دو احادیث سے استدلال کیا ہے ان پر کامل و مکمل بحث میری کتاب ''آپ کے مسائل اور اُن کا حل'' کی پانچویں جلد میں آچکی ہے، جس کا جی چاہے وہاں دیکھ لے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی حدیث جو رکانہؓ کی طلاق کے بارے میں مسندِ احمد سے نقل کی ہے، یہ اہلِ علم کے نزدیک مضطرب، ضعیف اور منکر ہے، اس کے راوی محمد بن

اسحاق کے بارے میں شدید جرحیں کتب الرجال میں منقول ہیں، اور محدثین کا اس کی روایت کے قبول کرنے نہ کرنے میں اختلاف ہے، بعض اکابر اس کو دجال و کذاب کہتے ہیں، بعض اس کی مطلقاً توثیق کرتے ہیں، اور بعض نے یہ معتدل رائے قائم کی ہے کہ کسی حلال وحرام کے مسئلے میں ابنِ اسحاق متفرد ہو تو حجت نہیں، اسی طرح اس کا اُستاذ داوٴد بن حصین بھی خارجی تھا اور عکرمہ سے منکر روایت نقل کرنے میں بدنام ہے، اور عکرمہ بھی مجروح ہے، اور اس پر بہت سے اکابر نے جھوٹ بولنے کی تہمت لگائی ہے۔

ایک ایسی روایت جو مسلسل مجروح در مجروح در مجروح راویوں سے منقول ہو اس کو اجماعِ صحابہؓ اور اجماعِ اُمت کے مقابلے میں پیش کرنا انصاف کے منافی ہے۔ اور اگر اس روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ رکانہؓ نے اپنی بیوی کو ''البتۃ'' طلاق دی تھی، جیسا کہ ابوداوٴد کے حوالے سے اُوپر گزر چکا ہے، چونکہ ''البتۃ'' کا لفظ تین طلاق کے لئے بہ کثرت استعمال ہوتا ہے اس لئے راوی نے ''البتۃ'' کے معنی تین سمجھ کر مفہوم نقل کردیا، بہرحال صحیح روایت وہ ہے جو امام ابوداوٴدؒ نے متعدّد طرق سے نقل کی ہے۔

اسی طرح دُوسری حدیث جو صحیح مسلم سے نقل کی ہے، اس پر بھی اہلِ علم نے طویل کلام کیا ہے اور اس کے بہت سے جوابات ذکر کئے ہیں، سب سے بہتر جواب یہ ہے کہ ایک شخص تین طلاق الگ الگ لفظوں میں دیتا، یعنی أنت طالق، أنت طالق، أنت طالق، اور پھر کہتا کہ میں نے صرف ایک طلاق دینے کا ارادہ کیا تھا، اور دُوسری اور تیسری مرتبہ کا لفظ محض تاکید کے لئے تھا تو ابتدائے اسلام میں اس کے قول کو معتبر سمجھا جاتا تھا، اور ایک طلاق کا حکم کہا جاتا تھا، لیکن بعد میں اس کو منسوخ کردیا گیا، اور یہ قرار دیا گیا کہ تین طلاق کے بعد اس کی نیت کا اعتبار نہیں ہوگا، چنانچہ امام ابوداوٴدؒ نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما ہی کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ انہوں نے آیتِ شریفہ: ''وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ'' کی تلاوت کرکے فرمایا:

''وذالک ان الرجل کان اذا طلق امرأته فهو أحق برجعتها وان طلقها ثلاثا فنسخ ذالک، فقال:

فہرست

الطلاق مرتان.“ (ابوداؤد ج:۱ ص:۲۹۷)

ترجمہ:......”اور یہ یوں تھا کہ آدمی جب اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا تو وہ اس سے رُجوع کرسکتا تھا، خواہ تین طلاقیں دی ہوں، پس اس کو منسوخ کردیا گیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: وہ طلاق (جس کے بعد رُجوع ہوسکتا ہے، صرف) دو مرتبہ کی ہے۔“

واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت اگر صحیح ہے تو منسوخ ہے، جیسا کہ امام طحاویؒ نے ”باب الرجل یطلق امرأته ثلاثا معا“ میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ (طحاوی ج:۲ ص:۳۶)

نیز امام ابوداؤدؒ نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی زیرِ بحث حدیث کو ”باب بقية نسخ المراجعة بعد التطليقات الثلاث“ کے ذیل میں نقل کرکے بتایا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ (ابوداؤد ج:۱ ص:۲۹۹)

ان اُمور سے قطع نظر اہلِ حدیث کے مفتی صاحب کی توجہ چند اُمور کی طرف دِلانا چاہتا ہوں:

اوّل:......ان دونوں روایتوں کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف کی گئی ہے، جبکہ متواتر روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ تین طلاق کے تین ہونے کا فتویٰ دیتے تھے۔ اگر ان کی ذکر کردہ یہ دونوں روایتیں، جن کا حوالہ مفتی صاحب نے دیا ہے، صحیح بھی ہوں اور اپنے ظاہر پر محمول ہوں اور منسوخ بھی نہ ہوں، اور حضرت ابنِ عباسؓ انہی کے مطابق عقیدہ رکھتے ہوں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے باوجود وہ اپنی روایت کردہ احادیث کے خلاف فتویٰ صادر کریں؟ ظاہر ہے کہ کسی صحابی کے بارے میں یہ تصوّر نہیں کیا جاسکتا، لامحالہ ان روایات کو منسوخ کہا جائے گا۔

دوم:......فاضل مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ:

”نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دو سالہ دورِ خلافت میں ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک ہی شمار کی جاتی

تھیں، عمر رضی اللہ عنہ نے مصلحتاً ایک مجلس کی تین طلاقوں کو تین ہی شمار کرنے کا حکم دے دیا تاکہ لوگ اس فعل سے رُک جائیں۔“

حضراتِ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بارے میں اہلِ سنت اور روافض کے نقطۂ نظر کا اختلاف سب کو معلوم ہے، اہلِ سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ حضراتؓ قرآن وسنت کے فیصلوں سے سرِمو انحراف نہیں کرتے تھے، اور کوئی بڑی سے بڑی مصلحت بھی ان کو خلافِ شرع فیصلے پر آمادہ نہیں کرسکتی تھی، اس لئے کہ ”خلیفۂ راشد“ وہی کہلاتا ہے جو ٹھیک ٹھیک منہاجِ نبوّت پر قائم ہو، اس سے سرِمو تجاوز نہ کرے۔ ان حضرات کے جو واقعات یا فیصلے ایسے نظر آتے ہیں جن میں اس کے خلاف شبہ ہوتا ہے ان میں اہلِ سنت ان حضرات کے فیصلوں کو حق مانتے ہیں۔ اس کے برعکس روافض ان کے فیصلوں کو غلط، قرآن وسنت کے خلاف اور وقتی مصلحتوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں، اس لئے وہ ان اکابرؓ کو خلیفۂ راشد نہیں بلکہ نعوذ باللہ خلیفۂ جائر سمجھتے ہیں، چنانچہ طلاقِ ثلاثہ اور متعہ کے مسئلوں میں حضرت عمرؓ کے موقف کو غلط سمجھتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اہلِ حدیث بھی طلاق کے مسئلے میں اُصولی طور پر اہلِ تشیع کے ہم نوا ہیں، حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں لکھتے ہیں:

”وفی الجملة فالذی وقع فی هٰذه المسألة نظیر ما وقع فی مسألة المتعة سواء اعنی قول جابر: انها کانت تفعل فی عهد النبی صلی الله علیه وسلم وأبی بکر وصدرا من خلافة عمر، قال: ثم نهانا عمر عنها فانتهینا. فالراجع فی الموضعین تحریم المتعة ایقاع الثلاث للاجماع الذی انعقد فی عهد عمر علٰی ذٰلک، ولا یحفظ ان أحدا فی عهد عمر خالفه فی واحدة منهما، وقد دل اجماعهم علٰی وجود ناسخ، وان کان خفی عن بعضهم قبل ذٰلک حتی ظهر لجمیعهم فی عهد عمر، فالمخالف بعد هٰذا الاجماع منابذ له

والجمهور علٰی عدم اعتبار من احدث الاختلاف بعد الاتفاق." (فتح الباری ج:۹ ص:۳۶۵)

ترجمہ:...... "خلاصہ یہ ہے کہ اس تین طلاق کے مسئلے میں جو واقعہ پیش آیا وہ ٹھیک اس واقعہ کی نظیر ہے جو متعہ کے مسئلے میں پیش آیا، میری مراد حضرت جابرؓ کا قول ہے کہ: "متعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں، حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں کیا جاتا تھا، پھر حضرت عمرؓ نے ہمیں منع کردیا تو ہم باز آگئے۔"

پس دونوں جگہوں میں راجح یہ ہے کہ متعہ حرام ہے، اور تین طلاقیں تین ہی واقع ہوتی ہیں، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس پر اجماع ہوگیا، اور کسی ایک صحابی سے بھی منقول نہیں کہ ان دونوں مسئلوں میں کسی ایک میں بھی اس نے حضرت عمرؓ کی مخالفت کی ہو، اور حضراتِ صحابہ کرامؓ کا اجماع اس اَمر کی دلیل ہے کہ ان دونوں مسئلوں میں ناسخ موجود تھا، مگر بعض حضرات کو اس سے قبل ناسخ کا علم نہیں ہوسکا، یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سب کے لئے ظاہر ہوگیا۔

پس جو شخص اس اجماع کا مخالف ہو وہ اجماعِ صحابہؓ کو پسِ پشت ڈالتا ہے، اور جمہور اس پر ہیں کہ کسی مسئلے پر اتفاق ہوجانے کے بعد جو شخص اختلاف پیدا کرے وہ لائقِ اعتبار نہیں۔"

الغرض! اس مسئلے میں اہلِ حدیث حضرات کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجماعی فیصلے سے اختلاف کرنا شیعہ عقیدے کی ترجمانی ہے اور عقیدۂ اہلِ سنت کے خلاف ہے، اور حضرت عمرؓ کا فیصلہ متعہ کے بارے میں صحیح ہے تو یقیناً تین طلاق بہ لفظِ واحد کے بارے میں بھی برحق ہے، اور پوری اُمت پر اس فاروقی فیصلے کی، جس کی تمام صحابہ کرامؓ نے موافقت

فرمائی، پابندی لازم ہوجاتی ہے۔ اور ابنِ عباسؓ کی روایت میں جو کہا گیا ہے کہ: ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تین کو ایک ہی شمار کیا جاتا تھا'' اس کے معنی یہ لئے جائیں گے کہ نسخ کے باوجود بعض لوگوں کو علم نہیں ہوا ہوگا، اور وہ یہ سمجھتے ہوں گے کہ تین طلاق بہ لفظِ واحد کو ایک ہی شمار کیا جاتا ہے جبکہ طلاق دینے والے کی نیت تین کی نہ ہو، بلکہ ایک طلاق کی ہو۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی اس غلط فہمی کو دُور کردیا اور وضاحت کردی کہ یہ حکم منسوخ ہے، لہٰذا آج کے بعد کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے، اور تمام صحابہ کرامؓ نے اس سے موافقت فرمائی۔

اور اگر نعوذ باللہ طلاقِ ثلاثہ کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی مصلحت کی بنا پر غلط فیصلہ کیا تھا اور صحابہؓ نے بھی بالاجماع اس سے موافقت کرلی تھی، اور آج اہلِ حدیث حضرات، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی غلطی کی اصلاح کرنے جارہے ہیں تو یوں کہو کہ شیعہ سچ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ''متعہ شریف'' پر پابندی لگا کر ایک حلال اور پاکیزہ چیز کو حرام قرار دے دیا، اور صحابہؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلط فیصلے کی ہم نوائی کرلی، نعوذ باللہ، استغفر اللہ!

واضح رہے کہ ان مسئلوں کا حرام و حلال سے تعلق ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ہے کہ متعہ حرام ہے، اور جس عورت سے متعہ کیا جائے اس سے جنسی تعلق حرام ہے، اسی طرح جس عورت کو تین طلاق دی گئی ہوں وہ حرمتِ مغلظہ کے ساتھ حرام ہوگئی، اب اس سے بیوی کا سا تعلق قائم کرنا حرام ہے۔ اہلِ تشیع حضرات، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس عورت سے متعہ کیا گیا ہو اس سے جنسی تعلق حرام نہیں بلکہ اتباعِ سنت کی وجہ سے موجبِ ثواب ہے۔ اِدھر اہلِ حدیث، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مطلقہ ثلاثہ حرام نہیں، بلکہ اتباعِ سنت کے لئے اسے بیوی بنا کر رکھنا موجبِ ثواب ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون!

سوم:...... اہلِ حدیث عموماً یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے فیصلے سے رُجوع کرلیا تھا، اس فتویٰ میں بھی جناب مفتی صاحب نے یہی بات دُہرائی

ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس فیصلے سے رُجوع کرلیا۔''

اہلِ حدیث حضرات نے حضرت عمرؓ پر پہلے تو یہ الزام لگایا کہ انہوں نے کسی وقتی مصلحت کے لئے اس سنت کو تبدیل کردیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ان کے دورِ خلافت تک مسلسل چلی آرہی تھی، اور پھر اس الزام کو مزید پختہ کرنے کے لئے ان پر یہ تہمت جڑ دی کہ انہوں نے اپنی غلطی کو خود بھی تسلیم کرلیا تھا، چنانچہ اس غلطی سے رُجوع کرلیا تھا۔ مفتی صاحب نے یہاں دو کتابوں کا حوالہ دیا ہے، ایک صحیح مسلم ص:۴۷۷ (جلد کا نمبر نہیں دیا)، حالانکہ صحیح مسلم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رُجوع کا کوئی ذکر نہیں۔ دُوسرا حوالہ حافظ ابنِ قیمؒ کی کتاب ''اغاثة اللھفان'' کا ہے، جس کا نہ صفحہ ذکر کیا ہے اور نہ جلد نمبر۔ حالانکہ ''اغاثة اللھفان'' میں بھی یہ کہیں ذکر نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس فیصلے سے رُجوع کرلیا تھا۔ مناسب ہوگا کہ یہاں حافظ ابنِ قیمؒ کی کتاب ''اغاثة اللھفان'' کا صحیح حوالہ نقل کرکے اہلِ حدیث کی اس تہمت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی براءت کی جائے۔

واضح رہے کہ ۱۳۹۱ھ میں سعودی حکومت نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ ''طلاقِ ثلاثہ بہ لفظِ واحد'' کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے سعودیہ کے چوٹی کے علماء کی ایک ۱۷ رُکنی مجلس تحقیقات تشکیل دی، جس نے طرفین کے دلائل کا جائزہ لے کر اپنا فیصلہ ''حكم الطلاق الثلاث بلفظ واحد'' کے نام سے مرتب کیا اور اسے ''ادارة البحوث العلمية والافتاء والدعوة والارشاد'' کے ترجمان ''مجلة البحوث العلمية رياض'' نے المجلد الأوّل العدد الثالث ۱۳۹۷ھ میں شائع کیا۔ میں ''اغاثة اللھفان'' کا حوالہ اسی مجلّہ سے نقل کررہا ہوں۔

حافظ ابنِ قیمؒ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فلما راى أمير المؤمنين ان الله سبحانه عاقب المطلق ثلاثا بان حال بينه وبين زوجته وحرمها عليه

فہرست

حتی تنکح زوجا غیره علم ان ذالک لکراهة الطلاق المحرم وبغضه له فوافقه أمیر المؤمنین فی عقوبته لمن طلق ثلاثا جمیعا بان الزمه بها وامضاها علیه۔‘‘

(حکم الطّلاق الثلاث ص:۱۷)

ترجمہ:......’’پس جب امیر المؤمنین (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) نے دیکھا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تین طلاق دینے والے کو یہ سزا دی ہے کہ تین طلاق کے بعد اس نے طلاق دینے والے کے درمیان اور اس کی مطلقہ بیوی کے درمیان آڑ واقع کردی اور بیوی کو اس پر حرام کردیا یہاں تک کہ دُوسرے شوہر سے نکاح کرے، تو امیر المؤمنینؓ نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ اس وجہ سے ہے کہ وہ حرام طلاق کو ناپسند فرماتا ہے اور اس سے بغض رکھتا ہے، لہٰذا امیر المؤمنینؓ نے اللہ تعالیٰ کی مقرّر کردہ اس سزا میں اللہ تعالیٰ کی موافقت فرمائی اس شخص کے حق میں جو تین طلاقیں بیک وقت دے ڈالے، اس موافقت کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسے شخص پر تین طلاقیں لازم کردیں اور ان کو اس پر نافذ کردیا۔‘‘

آگے بڑھنے سے پہلے حافظ ابنِ قیمؒ کی مندرجہ بالا عبارت پر اچھی طرح غور کرلیا جائے کہ حافظ ابنِ قیمؒ کے بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تین طلاق بہ لفظِ واحد کو نافذ اور لازم قرار دینے کے فیصلے میں منشائے خداوندی کی موافقت فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے تین طلاق دینے والے کے لئے جو سزا اپنی کتابِ محکم میں تجویز فرمائی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیک وقت تین طلاق دینے والے پر یہ قرآنی سزا نافذ کرکے منشائے الٰہی کی تکمیل فرمادی۔ خلاصہ یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ کہ تین طلاق بہ لفظِ واحد تین ہیں، منشائے الٰہی کی تعمیل تھی۔

سبحان اللہ! کیسی عمدہ بات فرمائی ہے، ائمۂ اربعہؒ اور پوری اُمت حضرت عمر رضی

اللہ عنہ کے فیصلے کو برحق سمجھتے ہوئے ان کی موافقت و رفاقت میں منشائے الٰہی کی تکمیل کو اپنا دین و ایمان سمجھتی ہے، جبکہ اہلِ حدیث حضرات، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کی مخالفت کرتے ہوئے منشائے الٰہی کی مخالفت اور اہلِ تشیع کے منشا کی موافقت کر رہے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد برحق ہے:

”ان اللہ جعل الحق علٰی لسان عمر وقلبہ۔“

(مشکوٰۃ ص:۵۵۷)

ترجمہ:......”اللہ تعالیٰ نے حق عمرؓ کی زبان اور قلب پر رکھ دیا ہے۔“

جس شخصیت کو رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے ناطق بالحق قرار دیا، اس کا فیصلہ خلافِ حق ہو ہی نہیں سکتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کے عین مطابق ہوگا، اور اس کی مخالفت، حق کی مخالفت اور خدا اور رسول کے منشا کے خلاف ہوگی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نقطۂ نظر کی مندرجہ بالا وضاحت کرنے کے بعد حافظ ابنِ قیمؒ یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ:

”فان قیل: فکان أسھل من ذٰلک أن یمنع الناس من ایقاع الثلاث ویحرمہ علیھم ویعاقب بالضرب والتأدیب من فعلہ لئلا یقع المحذور الذی یترتب علیہ؟ قیل لعمر اللہ! قد کان یمکنہ من ذٰلک ولذٰلک ندم علیہ فی اٰخر أیامہ وود أنہ کان فعلہ۔ قال الحافظ الاسماعیلی فی مسند عمر: أخبرنا أبویعلٰی حدثنا صالح بن مالک حدثنا خالد بن یزید بن أبی مالک عن أبیہ قال: قال عمر رضی اللہ عنہ: ما ندمت علٰی شیء ندامتی علٰی ثلاثۃ أن لا أکون حرمت الطلاق، علٰی أن لا أکون أنکحت الموالی وعلٰی أن لا

أكون قتلت النوائح.‘‘ (حوالہ بالا)

ترجمہ:...... ’’اگر کہا جائے کہ اس سے آسان تو یہ تھا کہ آپؓ لوگوں کو تین طلاق دینے کی ممانعت کردیتے اور اس کو حرام اور ممنوع قرار دے دیتے اور اس پر ضرب وتعزیر جاری کرتے تاکہ وہ محذور جو اس تین طلاق پر مرتب ہوتا ہے، وہ واقع ہی نہیں ہوتا۔

یہ سوال اُٹھانے کے بعد حافظ ابنِ قیمؒ خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں:

جواب یہ ہے کہ جی ہاں! بخدا ان کے لئے یہ ممکن تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ آخری زمانے میں اس پر نادم ہوئے اور انہوں نے یہ چاہا کہ انہوں نے یہ کام کرلیا ہوتا۔

حافظ ابوبکر الاسماعیلی ’’مسندِ عمر‘‘ میں فرماتے ہیں کہ: ہمیں خبر دی ابویعلیٰ نے، کہا ہم سے بیان کیا صالح بن مالک نے، کہا ہم سے بیان کیا خالد بن یزید بن ابی مالک نے اپنے والد سے، کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: مجھے جتنی ندامت تین چیزوں پر ہوئی، اتنی کسی چیز پر نہیں ہوئی۔ ایک یہ کہ میں نے طلاق کو حرام کیوں نہ کردیا؟ دوم یہ کہ میں نے غلاموں کا نکاح کیوں نہ کرادیا؟ سوم یہ کہ میں نے نوحہ کرنے والی عورتوں کو قتل کیوں نہ کردیا؟‘‘

لیجئے! یہ ہے وہ روایت جس کے سہارے اہلِ حدیث حضرات، ابنِ قیمؒ کی تقلید میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ: ’’حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس فیصلے سے رُجوع کرلیا تھا کہ تین طلاق تین ہی واقع ہوتی ہے، خواہ ایک ہی مجلس میں دی جائیں یا ایک لفظ سے۔‘‘

اہلِ حدیث کی بے انصافی وسینہ زوری دیکھنے کے لئے اس روایت کی سند اور متن پر غور کرلینا ضروری ہے۔

اس کی سند میں خالد بن یزید بن ابی مالک اپنے والد سے اس قصے کو نقل کرتا ہے،

اس خالد کے بارے میں امام الجرح والتعدیل یحییٰ بن معینؒ فرماتے ہیں:

"لم یرض ان یکذب علٰی أبیه حتّٰی کذب علٰی أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم."

(تهذیب التهذیب ج:۳ ص:۱۲۷)

ترجمہ:......"یہ صاحب صرف اپنے باپ پر جھوٹ باندھنے پر راضی نہیں ہوئے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ پر بھی جھوٹ باندھا۔"

یہ جھوٹا اپنے والد کی طرف اس جھوٹ کو منسوب کرکے کہتا ہے کہ میرے والد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اظہارِ ندامت کو بیان کیا جبکہ اس کے والد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ ہی نہیں پایا اور وہ تدلیس میں بھی معروف تھا۔ (حکم الطّلاق الثلاث ص:۱۰۷)

حافظ ابنِ قیمؒ پر تعجب ہے کہ وہ ایک کذّاب کی مجہول اور جھوٹی روایت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ندامت ثابت فرما رہے ہیں، اور اہلِ حدیث حضرات پر حیرت ہے کہ وہ اس کو حضرت عمرؓ کے رُجوع کا نام دے رہے ہیں۔

سند سے قطع نظر اب روایت کے متن پر توجہ فرمائیے، روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب کرکے یہ کہا گیا کہ مجھے زندگی میں ایسی ندامت کسی چیز پر نہیں ہوئی جتنی کہ اس بات پر کہ میں نے طلاق کو حرام قرار کیوں نہ دیا...الخ۔

دین کا ایک مبتدی طالبِ علم بھی جانتا ہے کہ "طلاق" حق تعالیٰ شانہ کی نظر میں خواہ کیسی ہی ناپسندیدہ چیز ہو، بہرحال اللہ تعالیٰ نے اس کو حلال قرار دیا ہے اور قرآنِ کریم میں اس کے اَحکام بیان فرمائے ہیں۔ اُدھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی زبان زدخاص وعام ہے کہ:

"أبغض الحلال الی الله الطّلاق."

(مشکوٰۃ ص:۲۸۳ بروایت ابوداؤد)

ترجمہ:......"حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سب

فہرست

سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔‘‘

پس جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال قرار دیا ہو اور صدرِ اوّل سے آج تک جس پر مسلمانوں کا تعامل چلا آرہا ہو، کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس کو حرام قرار دے کر اس پر پابندی لگانے کا سوچ بھی سکتے ہیں؟ چہ جائیکہ اس قطعاً غلط اور باطل چیز کے نہ کرنے پر شدید ندامت کا اظہار فرمائیں، یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر خالص بہتان اور افتراء ہے۔

اگر کہا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراد مطلق طلاق سے نہیں بلکہ تین طلاق سے ہے، تو اوّلاً یہ گزارش ہے کہ اس روایت میں کون سا قرینہ ہے جو تین طلاق پر دلالت کرتا ہے؟ ثانیاً: فرض کرلیجئے کہ یہی مراد ہے تو سوال یہ ہے کہ تین طلاق کو حرام قرار دینے سے یہ کیسے لازم آیا کہ کوئی اس حرام کا ارتکاب کرے گا تو طلاق واقع نہیں ہوگی؟ آپ دیکھتے ہیں کہ بیوی کو ’’تو میری ماں کی مانند‘‘ کہنا حرام ہے، قرآنِ کریم نے اس کو ’’منکر من القول‘‘ اور جھوٹ قرار دیا ہے، اس کے باوجود اگر کوئی شخص اس حرام کا ارتکاب کرکے بیوی سے ظہار کرلے تو کیا ظہار واقع نہیں ہوتا؟ اسی طرح بالفرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ تین طلاق کو حرام قرار دے کر اس پر پابندی لگانا چاہتے تھے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ آپؓ نے اپنے اس فیصلے سے رُجوع فرمالیا تھا کہ تین طلاق تین ہی شمار ہوتی ہیں، بلکہ اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کرلیا جائے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس پر افسوس تھا کہ آپؓ نے تین طلاق پر پابندی کیوں نہ لگادی تو اس سے جمہور کے قول کی مزید تائید ہوتی ہے، کیونکہ اس صورت میں روایت کا صاف اور سیدھا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے صرف تین طلاق کے نفاذ پر اکتفا کیوں کیا، اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی چاہئے تھا کہ میں تین طلاق کے واقع کرنے پر بھی پابندی لگادیتا اور ایسا کرنے والوں کو بیوی کی حرمتِ مغلظہ کا حکم دینے کے علاوہ ان کی گوشمالی بھی کرتا۔

الغرض! اوّل تو یہ روایت ہی سنداً و متناً غلط اور مہمل ہے، اور اگر بفرضِ محال اس کو صحیح بھی تسلیم کرلیا جائے تو اس کے کسی لفظ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امیر المؤمنین فاروقِ

اعظم الناطق بالصدق والصواب رضی اللہ عنہ نے اپنے سابقہ فیصلے سے رُجوع کرلیا تھا۔ حضرت امیرالمؤمنین رضی اللہ عنہ کی طرف اپنے فیصلے سے رُجوع کو منسوب کرنا آپؓ کی ذاتِ عالی پر سراسر ظلم اور بہتان وافتراء ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اہلِ حدیث حضرات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ذات سے کیا ضد ہے کہ ان کی طرف پے در پے جھوٹ منسوب کر رہے ہیں اور ان حضرات کو یہ سوچنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ محض وقتی ہوتا یا کسی مصلحت پر مبنی ہوتا یا آپؓ نے اس فیصلے سے آخری عمر میں رُجوع فرمالیا ہوتا تو تمام صحابہ کرامؓ سے ائمۂ اربعہؒ تک جماہیر سلف وخلف اس فیصلے پر مصر کیونکر رہ سکتے تھے؟

خلاصہ یہ کہ تین طلاق سے تین کا واقع ہونا قطعی برحق ہے، یہی خلیفۂ راشد امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ناطق فیصلہ ہے، اسی پر حضراتِ خلفائے راشدینؓ اور اکابر صحابہؓ کا اجماعی فتویٰ ہے، اور اسی پر چاروں فقہائے اُمت واماماںِ ملت متفق ہیں، اس کے خلاف اگر کوئی فتویٰ دیتا ہے، خواہ وہ اہلِ حدیث ہو یا منکرِ حدیث، وہ قطعاً مردُود اور باطل ہے، **وماذا بعد الحق الا الضلال!** (حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا رہ جاتا ہے؟) کسی شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو، یہ حلال نہیں کہ صحابہ کرامؓ اور ائمۂ اربعہؒ کے اجماعی فتوے کے خلاف تین طلاق کو ایک قرار دے اور مطلقہ ثلاثہ کو حلال قرار دے، حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ۔

فتویٰ نمبر:۱۵ میں (جو غربائے اہلِ حدیث کے مفتی صاحب کا تحریر کردہ ہے) یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ چونکہ نرگس کے شوہر نے پہلی بیوی (زینب) کے جبر واکراہ کی وجہ سے طلاق دی ہے، لہٰذا یہ طلاق واقع نہیں ہوئی، نہ تین نہ ایک۔

مفتی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

> ''جمہور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، ائمہ مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور داوٗدؒ وغیرہم کا بھی یہی مسلک ہے کہ مکرہ کی طلاق واقع نہیں ہوتی، جبکہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک اس

کے خلاف ہے۔ یہ بلا دلیل اور جمہور صحابہؓ کے خلاف ہونے کی وجہ سے غیر معتبر ہے۔''

اس سے قطع نظر کہ جبر واکراہ کی حالت میں دی گئی طلاق واقع ہوجاتی ہے یا نہیں؟ یہاں چند اُمور لائقِ توجہ ہیں:

اوّل:...... یہ کہ سوال میں جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ زید کی پہلی بیوی زینب نے دھمکی دی تھی کہ اگر نئی بیوی نرگس کو طلاق نہیں دوگے تو میں خودکشی کرلوں گی، تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ واقعہ کی نوعیت اس سے یکسر مختلف تھی۔

ہوا یہ کہ زینب کے شوہر نے اس (نرگس) سے خفیہ شادی کرلی تھی، جبکہ وہ زینب کو حلفاً یقین دلاتا رہا کہ وہ ہرگز شادی نہیں کرے گا، پانچ سال کے بعد شوہر نے یکایک زینب کو اس شادی کی خوشخبری دی اور یہ بھی بتایا کہ نرگس دُوسرے بچے کے ساتھ ماشاءاللہ اُمید سے ہے۔

یہ غیر متوقع خبر زینب کے ذہن پر بجلی بن کر گری اور اس نے رو رو کر اپنا بُرا حال کرلیا، شوہر سے ہرگز نہیں کہا کہ وہ خودکشی کرلے گی، لیکن شوہر سے اس کی پریشانی نہ دیکھی گئی تو اس نے زینب سے کہا کہ: تم پریشان نہ ہو، میں نرگس کو طلاق دے دُوں گا، اس پر زینب نے کہا کہ: اگر طلاق دینی ہے تو ابھی کیوں نہیں دے دیتے؟ اس پر شوہر نے دُوسری بیوی کا نام لے کر دوبارہ کہا کہ: میں نے اسے طلاق دی، میں نے اسے طلاق دی، اس پر زینب نے کہا کہ: تین طلاقیں دیں۔ شوہر نے اس کے کہنے پر مزید تین بار طلاق دے دی۔

اس واقعہ کو اس کی اصل شکل میں دیکھا جائے تو واقعہ کی نوعیت بدل جاتی ہے اور مفتی صاحب کا فتویٰ نمبر:۱۵ یکسر غیر متعلق ہوجاتا ہے، اور واضح ہوجاتا ہے کہ خودکشی کی دھمکی کا افسانہ محض مفتیوں کو متأثر کرنے کے لئے تراشا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ آج کل دیانت وامانت کا معیار یہاں تک گرگیا ہے کہ لوگ اعلانیہ طلاق دے کر مکر جاتے ہیں، اور حلال وحرام کا مسئلہ پوچھنے کے لئے بھی واقعہ کی اصل نوعیت بیان نہیں کرتے، بلکہ واقعات کو بدل کر اور خودساختہ کہانیاں بناکر مسائل دریافت کرتے ہیں، فالی المشتکی!

دوم:......اگر اسی واقعہ کو صحیح فرض کرلیا جائے جو سوال میں ذکر کیا گیا ہے، تب بھی اس پر غور کرنا ہوگا کہ بیوی کی اس قسم کی دھمکی کو شرعاً ''جبر و اکراہ'' کہنا صحیح ہے؟ جبکہ یہ بیوی کی خالی خولی دھمکی تھی، نہ اس کے ہاتھ میں خودکشی کا کوئی آلہ تھا، اور نہ اقدامِ خودکشی کی کوئی اور علامت پائی گئی، اور کیا ایسی خالی دھمکی پر جبر و اکراہ کے شرعی اَحکام جاری ہوں گے؟ مثلاً:

۱:......کیا ایسی خالی دھمکیوں پر اس خاتون کے خلاف اقدامِ خودکشی کا مقدمہ شرعی عدالت میں دائر کیا جاسکتا ہے؟ اور عدالت اس پر اقدامِ خودکشی کی تعزیر جاری کرے گی؟

۲:...... اگر کوئی نیک بخت اپنے شوہر کو دھمکی دے کہ اگر تم داڑھی نہیں منڈواؤ گے تو میں خودکشی کرلوں گی، کیا عورت کی دھمکی سے مرعوب ہوکر شوہر کے لئے داڑھی منڈانا حلال ہوگا؟

۳:......اگر عورت ایسی ہی دھمکی سے شوہر کو شراب نوشی پر، کلمۂ کفر بکنے پر یا کسی اور فعلِ شنیع پر مجبور کرتی ہے تو کیا شوہر کے لئے ان افعالِ شنیعہ کے ارتکاب کی اجازت ہوگی؟ (واضح رہے کہ خود مفتی صاحب نے اپنے فتویٰ میں لکھا ہے کہ جبر و اِکراہ کی حالت میں کلمۂ کفر بکنے کی بھی اجازت ہے)۔

۴:......کیا عورت کی ایسی دھمکی پر شوہر کے لئے کسی مسلمان کا مال چرانا یا اس کا تلف کرنا جائز ہوگا؟

۵:......عورت دھمکی دیتی ہے کہ: ''غیراللہ کے آگے سجدہ کرو، یا فلاں مزار پر جاکر اس بزرگ سے بیٹا مانگو، اور اس بزرگ کے نام کی منّت مانو، یا اس قسم کے شرکیہ افعال کرو، ورنہ میں خودکشی کرلوں گی''، کیا عورت کی اس دھمکی پر شوہر کے لئے شرکیہ افعال کا ارتکاب جائز ہوگا؟ یقیناً جناب مفتی صاحب میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ شوہر کے لئے بیگم صاحبہ کی دھمکی سے متأثر ہوکر ان کاموں کا کرنا حلال نہیں اور اگر کرے گا تو یہ شخص مجرم ہوگا۔

اس تنقیح سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خود مفتی صاحب بھی ایسی خالی دھمکی کو جبر و اکراہ کی حالت تسلیم نہیں فرماتے، اور اس کی وجہ سے شوہر کو مسلوب الاختیار قرار نہیں دیتے، معلوم ہوا کہ ایسی دھمکی کو شرعاً ''جبر و اکراہ'' قرار دینا صحیح نہیں، اور جس طرح کہ آدمی

ایسی دھمکی کی وجہ سے کلمۂ کفر بکنے پر مجبور نہیں، اسی طرح بیوی کو طلاق دینے پر بھی مجبور نہیں۔

سوم:...... جناب مفتی صاحب نے خود بھی تحریر فرمایا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے نزدیک جبر واکراہ سے دِلائی گئی طلاق واقع ہوجاتی ہے، پس جبکہ میاں بیوی دونوں حنفی ہیں تو یہ تین طلاق حنفی عقیدے کے مطابق تو حرمتِ مغلظہ کے ساتھ واقع ہوگئیں اور بیوی حرام ہوگئی۔ طلاق کے بعد اگر وہ بالفرض لامذہب غیرمقلد بھی بن جائیں تو نکاح تو دوبارہ بحال نہیں ہوسکتا، کیونکہ ''**الساقط لا یعود**'' عقلاً وشرعاً مُسَلَّم ہے، یعنی جو چیز ساقط اور باطل ہوجائے اس کو کسی تدبیر سے بھی دوبارہ نہیں لوٹایا جاسکتا۔

خلاصہ یہ کہ زید کے لئے حلال نہیں کہ تین طلاق کے بعد نرگس کو بیوی کی حیثیت سے رکھے، بلکہ دونوں پر لازم ہے کہ فوراً علیحدگی اختیار کرلیں۔ تین طلاق کے بعد اگر وہ اکٹھے رہیں گے تو زنا اور بدکاری کے مرتکب ہوں گے، جس کا وبال ان کو دُنیا اور آخرت میں بھگتنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنے قہر اور غضب سے بچائے۔ ہم دونوں سے گزارش کریں گے کہ وہ اہلِ حدیث کے غلط فتویٰ کی آڑ میں گناہِ کبیرہ کا ارتکاب نہ کریں، ورنہ ان دونوں کی دُنیا و آخرت دونوں برباد ہوجائیں گی، اور اہلِ حدیث کا غلط فتویٰ ان کو دُنیا کی ذِلت ورُسوائی اور حق تعالیٰ شانہ کے قہر وعذاب سے نہیں بچاسکے گا۔ اگر انہوں نے اس غلط فتویٰ کی آڑ میں اجماعِ صحابہؓ اور اجماعِ اُمت کی پروانہ کی اور خواہشِ نفس کی پیروی کرتے ہوئے تین طلاق کے بعد بھی میاں بیوی کی حیثیت سے اکٹھے رہنے پر اصرار کیا تو اندیشہ ہے کہ مرتے وقت ایمان سلب ہوجائے اور وہ اسلام سے خارج ہوکر مریں۔

ہوٹلوں میں مرغی کا گوشت

س...... عمرہ یا حج کے لئے سعودی عرب جانا ہوتا ہے تو وہاں قیام کے عرصے میں گوشت خصوصاً مرغی کے گوشت کا استعمال کیسا ہے؟ وہاں جو مرغی آتی ہے وہ دُوسرے ممالک سے آتی ہے، عام پبلک تو خیال نہیں کرتی اور وہ استعمال کرتی ہے، جبکہ دین دار طبقہ خصوصاً تبلیغی حضرات بالکل اس گوشت سے اجتناب کرتے ہیں۔ ہوٹلوں میں سالن اور روسٹ

مرغی وہ استعمال ہوتی ہے جو باہر سے آئی ہوئی ہوتی ہے کیونکہ سستی بھی ہوتی ہے اور بظاہر اچھی بھی۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم اس روسٹ مرغی یا سالن والی مرغی کو استعمال کریں یا نہیں؟ سعودی حکومت یہ کہتی ہے یا جو مرغی منگواتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ذبیحہ حلال ہے، دُوسری طرف دین دار طبقہ خصوصاً تبلیغی حضرات کو اس پر بالکل اعتبار نہیں، اب آپ سے اس بارے میں دریافت کرنا ہے کہ آپ کا کیا فتویٰ ہے؟

ج…… باہر ملکوں سے جو مرغی آتی ہے اوّل تو اس کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ وہ صحیح طور پر ذبح بھی کرتے ہیں یا نہیں؟ اس کے علاوہ مرغی کاٹنے والوں کا اُصول یہ ہے کہ جونہی مرغی کو ذبح کرتے ہیں وہ اس کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیتے ہیں تاکہ اس کے پَر وغیرہ صاف ہوسکیں اور تمام آلائش اس کے اندر ہوتی ہے، اس لئے وہ مرغی ناپاک ہوجاتی ہے اور اس کا کھانا حلال نہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے سعودی عرب میں خصوصاً حج وغیرہ کے موقعوں پر ہوٹلوں میں جو مرغیاں روسٹ کی جاتی ہیں وہ اسی قسم کی ناپاک مرغیاں ہوتی ہیں اس لئے ان کا کھانا حلال نہیں۔

تجارتی کمپنیوں میں پھنسی ہوئی رقوم پر زکوٰۃ کا حکم

س…… علمائے کرام سے سنتے ہیں کہ قرضہ پر زکوٰۃ فرض ہے۔ گزارش یہ ہے کہ ایک مسلمان کا اگر کسی پر دس ہزار یا کم وبیش قرضہ ہو تو زکوٰۃ وصول ہونے پر ادا کرنے کا حکم ہے، مگر سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان کی اگر ساری جمع پونجی قرضہ میں ہو اور اس کا ملنا بھی دُشوار ہو، جس کی کراچی میں کوآپریٹو اسکینڈل ……. زندہ مثال موجود ہے کہ نہ تو جن بھائیوں کی رقمیں پھنس گئی ہیں ان کے ملنے کی اُمید ہے اور نہ ہی وہ نااُمید ہوکر صبر کرسکتے ہیں، لہٰذا اب اگر ایک مسلمان کو اپنے قرضہ والی رقم چالیس سال تک نہیں ملتی تو ۴۰ سال اور بعد میں اس کا کیا حکم ہوگا؟ کیونکہ اس طرح اڑھائی فیصد کے حساب سے تو زکوٰۃ کی مد میں جتنی بھی رقم لوگوں پر قرض ہو وہ زکوٰۃ کی مد میں منہا ہوکر ختم ہوجائے گی۔ اب اگر چالیس سال بعد بھی رقم نہیں ملتی تو کیا ۴۰ سال میں مذکورہ رقم جو زکوٰۃ کی مد میں ختم ہوچکی

ہے زکوٰۃ میں منہا سمجھی جائے گی اور ۴۰ سال کے بجائے اگر ۴۵ سال کے بعد یہ رقم مل جائے تو کیا کرنا ہوگا؟ ذرا تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔

ج……ان تجارتی کمپنیوں میں لوگوں کی جو رقمیں پھنسی ہوئی ہیں ان کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟ اس کو سمجھنے سے پہلے اس پر غور کرلینا مناسب ہوگا کہ شرعی نقطۂ نظر سے ان رُقوم کی نوعیت کیا ہے؟

یہ بات تو ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ جن لوگوں نے ان کمپنیوں میں اپنی پونجی جمع کرائی تھی یہ رقمیں ان کمپنیوں کو بطور قرض کے نہیں دی تھیں بلکہ کاروبار میں شراکت اور منافع میں حصہ داری کے لئے دی تھیں۔ چنانچہ ان کمپنیوں نے ان رُقوم کو کاروبار میں لگایا اور اس کاروبار سے حاصل ہونے والے منافع میں ان رقموں کے مالکان کو شریک کیا۔

ان میں سے بعض کمپنیوں کے بارے میں لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ شریعت کے اُصول مضاربت کے مطابق ان رُقوم سے کاروبار کرتی ہیں، اور شریعت کے مطابق کھاتہ داروں کو منافع کا حصہ تقسیم کرتی ہیں۔ انہوں نے بعض لائقِ اعتماد اہلِ علم سے شرعی اُصول مضاربت کے مطابق کام کرنے کا مکمل خاکہ تیار کرایا، اس کے اُصول و قواعد وضع کئے اور پھر اس مرتب نقشے کے مطابق کاروبار شروع کیا اور یہ حضرات شدّت کے ساتھ اس اَمر کا لحاظ رکھتے تھے کہ کاروبار میں بھی اور منافع کی تقسیم میں بھی کوئی بات شریعت کے خلاف نہ ہونے پائے۔

الغرض! ایسی کمپنیاں جو کھاتہ داروں کے روپے سے شریعت کے اُصول مضاربت کے مطابق کام کرتی تھیں جو رقمیں ان کو دی گئیں وہ قرض نہیں بلکہ ان کے ہاتھ میں امانت تھیں، اور یہ لوگ کھاتہ داروں کی جانب سے کاروبار کرنے کے لئے وکیل تھے اور ان کے ساتھ نفع میں شریک تھے، چنانچہ حضراتِ فقہاءؒ لکھتے ہیں:

> ''مضارب، کام شروع کرنے سے پہلے رأس المال کی رقم کا امین ہوتا ہے، کام شروع کرنے کے بعد وہ اس کی جانب سے وکیل بن جاتا ہے، اور نفع حاصل ہوجانے کے بعد وہ اس کے ساتھ منافع میں شریک ہوجاتا ہے۔''

یہ کمپنیاں اپنے مرتب کردہ نقشے کے مطابق کاروبار کر رہی تھیں اور کھاتہ داروں کو بالالتزام منافع تقسیم کر رہی تھیں کہ یکا یک حکومت نے ان کی تمام املاک پر قبضہ کر کے ان کو کاروبار کرنے سے روک دیا، وہ دن اور آج کا دن کہ یہ تمام املاک اور اثاثے حکومت کے قبضہ وتحویل میں ہیں، ان کمپنیوں کے مالکان نے ہر چند حکومت سے اپیلیں کیں کہ حکومت ہمیں اپنی نگرانی میں کاروبار کی اجازت دیدے اور ہم سے ایک ایک پیسے کا حساب لے، یا کم از کم ہمیں اپنے املاک اور اثاثوں کو فروخت کرنے ہی کی اجازت دی جائے تا کہ ہم متاثرین کو ان کی رقمیں لوٹانے کے قابل ہوسکیں، مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ آیا کھاتہ داروں کی طرف سے حکومت کے سامنے ان کمپنیوں کی بدعنوانی کی کوئی شکایت آئی تھی؟ اور انہوں نے حکومت سے مداخلت کی کوئی درخواست کی تھی؟ یا حکومت نے اسکینڈل بنا کر ان کمپنیوں پر جبری قبضہ کرلیا؟ جہاں تک کھاتہ داروں کا تعلق ہے ان کی طرف سے ایسی کوئی شکایت منظرِ عام پر نہیں آئی، اور نہ یہ کہ انہوں نے حکومت سے مداخلت کی کوئی درخواست کی ہو، بلکہ اس کے برعکس ان کمپنیوں پر عوام کا اعتماد روز بروز بڑھ رہا تھا اور لوگ سرکاری اداروں اور بینکوں سے رُقوم نکال کر ان نجی تجارتی اداروں میں اپنی رقمیں جمع کرا رہے تھے، بلکہ بعض نے اپنے زیورات اور مکانات تک فروخت کر کے ان اداروں میں رقمیں جمع کرانا شروع کردیں، ان اداروں کی یہ عوامی مقبولیت ہی ان اداروں کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی:

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

حکومت کے ''ماہرینِ معاشیات'' اور سرکاری و نیم سرکاری مالیاتی اداروں کے بزرجمہروں کو بجا طور پر یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اگر ان نجی اداروں کی ساکھ بڑھتی رہی اور ان پر عوام کے اعتماد کا یہی عالم رہا تو حکومت کے مالیاتی ادارے اور سرکاری و نیم سرکاری بینک (جو ان کمپنیوں کی وجہ سے موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں) یکسر مفلوج ہوکر رہ جائیں گے اور حکومت کے سودی نظام سے عوام کا اعتماد بالکل ختم ہوجائے گا۔ سرکار کے مالیاتی اداروں کے اس درد کا مداوا حکومت نے یہ تجویز کیا کہ راتوں رات ان گستاخ نجی اداروں پر

فہرست

قبضہ کرلیا اور اس کو اسکینڈل بناکر ان اداروں کے چلانے والوں کو جرمِ بے گناہی کے الزام میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کردیا۔ جس سے سرکارِ عالی کو دو فائدے حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ حکومت کے جو ادارے جان کنی کی حالت میں دَم توڑ رہے تھے، ان نجی اداروں کا گلا گھونٹ کر ان جاں بلب سرکاری اداروں کو آکسیجن مہیا کردی گئی اور انہیں اپنی موت مرنے سے بچالیا گیا۔ دوم یہ کہ ان نجی اداروں کو ان کی گستاخی کی ایسی سزا دی گئی کہ آئندہ دُوسروں کے لئے عبرت ہو۔ اور کوئی شخص حکومت کے سودی نظام کے جال سے نکل کر شریعتِ محمدیہؐ کے مطابق آزادانہ کاروبار کرنے کی جرأت نہ کرسکے۔ حکومت نے اپنے اس اقدام کے ذریعہ ان نجی کمپنیوں کا جو حشر کیا اس کو دیکھنے کے بعد انسان تو انسان، اگر بالفرض کوئی معصوم فرشتہ بھی آسمان سے نازل ہوجائے اور وہ عوام سے وعدہ کرے کہ وہ ان کی رقموں کو پوری دیانت و امانت کے ساتھ کاروبار میں لگائے گا، شریعتِ خداوندی کے عین مطابق کاروبار کرے گا، اور پوری دیانت داری کے ساتھ وہ حاصل شدہ منافع کو حصہ داروں پر تقسیم کرے گا، تب بھی عوام کو حوصلہ اور جرأت نہیں ہوگی کہ وہ اپنے اثاثے اس معصوم فرشتے کے حوالے کردیں، کیونکہ حکومت کے جبری قبضے کی تلوار ان کے سر پر ہمیشہ لٹکتی رہے گی۔ اس کے مقابلے میں وہ حکومت کے سودی اداروں میں رقمیں جمع کرانے کو ترجیح دیں گے، اور ان سے سودی منافع لے کر اپنے دین و ایمان اور اپنے ضمیر کا قتل بہتر سمجھیں گے، شیخ سعدیؒ کے ارشاد: ''سگہا را کشادہ وسنگہا را بستہ'' کی کیسی اچھی تعمیل ہے...؟

ان کمپنیوں پر قبضہ جمانے کے بعد کئی سال سے حکومت، عوام کو رقمیں لوٹانے کے سہانے خواب دِکھا رہی ہے، لیکن آج تک تو وہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے، ان غصب شدہ کمپنیوں میں جو نقد اثاثے موجود تھے شنید ہے سرکار دیار میں اثر و رسوخ رکھنے والے حضرات ان سے اپنا حصہ وصول کرچکے ہیں، باقی سامان گلتا رہے، سڑتا رہے، برباد ہوتا رہے، اور غریب بوڑھے پنشنرز، بیوائیں، یتیم بچے اور نادار لوگ چیختے رہیں، چلاتے رہیں، بلبلاتے رہیں، حکومت کے کارپردازوں کو اس کی کیا پروا...؟

بنی اسرائیل کے مظلوموں کی صدائیں فرعون کے بلند و بالا محلات تک کب پہنچتی ہیں؟

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

الغرض! عوام کی یہ رقمیں جو حکومت کے آہنی چنگل میں پھنسی ہوئی ہیں وہ ان کمپنیوں کے پاس امانت تھیں اور حکومت نے ان کمپنیوں کو اپنی تحویل میں لے کر ان عوامی امانتوں پر قبضہ جمالیا ہے اور ایسا مال جس کو حکومت نے زبردستی اپنی تحویل میں لے لیا ہو وہ حضراتِ فقہاءؒ کی اصطلاح میں ''مالِ ضمار'' کہلاتا ہے، اور ''مالِ ضمار'' کی زکوٰۃ کا حکم یہ ہے کہ جب تک وہ مال دوبارہ وصول نہ ہوجائے اس پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں، اور جب وصول ہوجائے تو مالک اگر پہلے سے صاحبِ نصاب ہے تو جب اس کے نصاب پر سال پورا ہوا اس وقت اس رقم پر بھی صرف اسی سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر اس وصول ہونے والی رقم کا مالک پہلے سے صاحبِ نصاب نہیں تھا تو جب اس رقم پر سال پورا ہوجائے گا تب اس پر اس سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

تاہم اگر کسی کو ان رُقوم کی وصول کا ظنِ غالب ہو، ان کو گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے۔

اس ناکارہ نے یہ مسئلہ اپنے علم و فہم کے مطابق لکھا ہے، اگر اس میں اس کوتاہ فہم سے غلطی ہوئی ہو تو اہلِ علم سے استدعا ہے کہ اس کی تصحیح فرماکر ممنون فرمائیں۔

فہرست

جائیداد میں حصہ

س…… عرض ہے کہ ہمارے والد صاحب کے نام ایک مکان ہے، ہم دو بھائی اور پانچ بہنیں ہیں، تین سال پہلے والد صاحب نے یہ مکان ہماری چھوٹی بہن کے نام کردیا۔ اب بڑی بہن اس مکان میں بچوں کے ساتھ رہ رہی ہیں، جب مکان تیار ہو رہا تھا تو والد صاحب نے بڑی بہن سے ۳لاکھ روپے اُدھار لئے تھے، اس مکان کے آدھے حصے کا کرایہ آٹھ ہزار روپے بھی دو سال سے بہن لے رہی ہیں اور اسی مکان میں رہ رہی ہیں۔ اب وہ کہہ رہی ہیں کہ ۱/۲/۱۹۹۹ء کو میرا قرضہ پورا ہوجائے گا تو میں مکان سے چلی جاؤں گی۔ تمام بہنیں

یہ چاہتی ہیں کہ مجھے مکان میں حصہ نہ ملے، کیونکہ میں پچھلے ۵ سال سے کراچی میں الگ رہ رہا ہوں جبکہ ہمارا مکان حیدرآباد میں ہے، والد صاحب سب بہنوں ہی کی بات مانتے ہیں، ہماری نہیں سنتے۔ میں والد صاحب کا نافرمان نہیں ہوں، جبکہ مکان میری سربراہی میں تیار ہوا، اب خدا جانے کیا ہوا ہے۔

آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ میں ان کا بڑا بیٹا ہوں اگر وہ مجھے جائیداد میں سے حصہ نہیں دیتے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

ج......اگر انہوں نے یہ مکان اپنی چھوٹی بیٹی کے نام کرادیا، تو یہ ان کی چیز تھی، انہوں نے چھوٹی بیٹی کو دے دی۔ البتہ اگر بغیر ضرورت کے اور بغیر وجہ کے انہوں نے یہ عمل کیا ہے تو وہ گنہگار ہوں گے۔

پرائز بونڈ کی پرچیوں کی خرید و فروخت

س......کراچی سمیت ملک بھر میں "پرائز بونڈ" اور اب پرائز بونڈ کی پرچیوں کا کاروبار عام ہوگیا ہے، ہر شخص پرچیاں خرید کر راتوں رات امیر بن جانے کے چکر میں ہے، کیا ان پرچیوں کے انعام سے عمرہ یا کوئی بھی نیک کام یا غریبوں، بیواؤں کی امداد کرسکتے ہیں یا نہیں؟

ج...... یہ پرچیوں کا کاروبار جائز نہیں، اس سے نہ عمرہ جائز ہے اور نہ صدقہ خیرات صحیح ہے، یہ کاروبار بند کردینا چاہئے اور جو رقم اس سلسلے میں حاصل ہوئی ہو وہ غرباء و مساکین کو بغیر نیتِ ثواب کے دے دینی چاہئے۔

سر کا صدقہ

س......ایک عامل صاحب نے کہا ہے کہ: جو لوگ مصیبتوں میں مبتلا ہوں ان کو چاہئے کہ بجائے کسی نام کی طرف منسوب کرنے کے صرف اپنے سر کا صدقہ کریں، صدقہ ادا کرنے سے مصائب رفع ہوجاتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ: صدقہ صرف اپنے سر کا ہوتا ہے۔ مگر ہم نے اب تک جب بھی صدقہ دیا تو اللہ تعالیٰ کے نام کی طرف منسوب کرکے دیا کہ اے اللہ تعالیٰ یہ خیرات آپ کے نام کی ہے، آپ ہمارے حال پر رحم فرمائیں۔

حضرت! کیا عامل کا کہنا ٹھیک ہے یا غلط؟ صحیح طریقہ کیا ہے؟ اور اگر غلط ہے جیسا کہ ہمارا گمان ہے تو اس کی وضاحت فرمادیں عین نوازش ہوگی۔

ج…… اپنے سر کے صدقہ کا مطلب اللہ تعالیٰ کے نام پر ہوتا ہے، اس لئے صحیح ہے، اپنی طرف سے صدقہ کرنا یہ صدقہ بھی فی سبیل اللہ ہوتا ہے، عامل کا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ صدقہ سے مصیبت ٹلتی ہے۔

مشروبات پر دَم کرنا

س…… عرض ہے کہ چند مسائل کے حل قرآن وسنت کی روشنی میں مطلوب ہیں۔

ایک کتاب نظر سے گزری جس میں یہ حدیثِ مبارکہ تھی۔ ترجمہ: ''ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے۔'' (ترمذی)۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ پانی پر کوئی آیت پڑھ کر دَم کرنے کے لئے پھونک ماری جاتی ہے، اس طرح سے پانی میں پھونک مارنا اور وہ پانی پینا جائز ہے یا نہیں؟

ج…… پانی پر دَم کرنے کی ممانعت نہیں، سانس لینے کی ممانعت ہے، واللہ اعلم!

''ماشاء اللہ'' انگریزی میں لکھنا

س…… ''ماشاء اللہ'' انگریزی حروف میں لکھنا جائز ہے یا نہیں؟ کیونکہ رکشوں اور گاڑیوں پر ''ماشاء اللہ'' انگریزی حروف میں لکھا ہوتا ہے، اگر ایسا جائز ہے تو اسپیلنگ بھی دُرست ہونی چاہئے کیونکہ انگریزی میں ''زیر، زبر، پیش، ء'' کے لئے حرف کا سہارا لیا جاتا ہے، میرا مطلب ہے کہ اللہ پاک کا نام صحیح اور دُرست لکھا جانا انتہائی ضروری ہے۔ اگر ''ماشاء اللہ'' انگریزی حروف میں لکھا جاسکتا ہے تو آپ برائے مہربانی اسپیلنگ وغیرہ بھی اخبار میں لکھ دیں تاکہ لوگوں کے لئے آسانی ہو اور دُرست اسپیلنگ لکھ سکیں اور لوگ گناہ اور خطا سے بچ سکیں۔

ج…… میں خود تو انگریزی جانتا نہیں، اس لئے بہتر یہ ہے کہ ''ماشاء اللہ'' وغیرہ الفاظ کو خود عربی ہی میں لکھا جائے، لیکن اگر کسی کو انگریزی لکھنے کا شوق ہے تو کسی انگریزی دان سے اس کا صحیح تلفظ معلوم کرلے، واللہ اعلم!

جوتا نہ پہننے کی منّت ماننا دُرست نہیں

س...... مسئلہ یہ ہے کہ میرے دوست نے منّت مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ میرا فلاں کام کرادے تو میں ساری زندگی جب تک میں زندہ رہا تب تک ۹ر اور ۱۰ر محرّم الحرام کو جوتے نہیں پہنوں گا اور یہ دو دن ننگے پیر رہوں گا۔ آیا اس کی یہ منّت دُرست ہے یا نہیں؟

ج...... یہ منّت دُرست نہیں اور اس کا پورا کرنا بھی ضروری نہیں۔

س...... مذکورہ بالا سوال کی روشنی میں ایک حل طلب سوال یہ ہے کہ اسے دیکھتے ہوئے میں نے بھی منّت مانی کہ اگر اللہ میرے فلاں فلاں کام کرادے یا فلاں فلاں چیزیں مجھے مل جائیں تو میں ان شاء اللہ اس سال محرّم الحرام کی ۹ر اور ۱۰ر تاریخ کو بغیر چپل رہوں گا، اور اللہ تعالیٰ نے میری دُعا سن لی، میں نے محرّم الحرام کی ۹ر اور ۱۰ر تاریخ کو بغیر چپل پہنے دن گزارے اور اس سال میں نے منّت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ میرا یہ کام کرادے تو میں ساری زندگی جب تک زندہ رہوں گا تب تک محرّم الحرام کی ۹ر اور ۱۰ر تاریخ کو بغیر چپل پہنے ہوئے دن گزاروں گا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بہت سے لوگوں نے اس طرف توجہ دِلائی کہ یہ منّت ماننا جائز نہیں۔ اب آپ بتائیں کہ میرے لئے کیا حکم ہے؟ اور کیا اس منّت کا پورا کرنا ضروری ہے؟

ج...... اُوپر لکھ چکا ہوں کہ یہ منّت دُرست نہیں اور اس کا پورا کرنا بھی ضروری نہیں۔

یتیم بچوں کی پرورِش کا حق

س...... میری تین بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں، اور میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے، پچھلے مہینے میرا چھوٹا بیٹا عمان میں طویل بیماری کے بعد انتقال کر گیا، اس نے اپنے پیچھے دو بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی ہے۔ اس کی بیوی اپنے بچوں کو لے کر سیالکوٹ چلی گئی ہے، میں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ عمان میں رہتی ہوں اور اس کو میں نے اور میرے بڑے بیٹے نے بہت روکا مگر وہ اپنے تینوں بچوں کو اور اپنا سب سامان وغیرہ لے کر چلی گئی ہے۔ میرے مرحوم بیٹے نے اپنی بیوی کے نام سیالکوٹ میں ایک گھر بنایا تھا اور اس کی بیوی یہاں اسکول میں پڑھاتی ہے۔

میری بیوہ بہو کا کیا یہ حق بنتا ہے کہ وہ الگ ہوکر رہے جبکہ میرا بیٹا کہتا ہے کہ وہ اس کو اور اس کے بچوں کو اپنے گھر میں رکھ سکتا ہے اور ان کا تمام خرچہ برداشت کرسکتا ہے اور اچھی طرح دیکھ بھال کرسکتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ میرے بڑے بیٹے کے چھ بچے ہیں۔

ج......عدّت کے بعد شرعاً اس کو جانے کا حق تھا، اور بچے اگر چھوٹے تھے تو ان کو اپنی ماں کے پاس رہنا چاہئے۔

س......میری بیوہ بہو کا مکان پر کیا حق ہے؟

ج......اگر آپ کے مرحوم بیٹے نے وہ مکان اپنی بیوی کے نام کردیا تھا تو مکان اسی کا ہے، اس میں دُوسرے کسی کا کوئی حق نہیں۔

س......میرے مرحوم بیٹے کو یہاں سرکار سے کافی روپیہ ملا ہے، اس روپے پر میرا، میری تین بیٹیوں کا اور میرے بڑے بیٹے کا کتنا حق بنتا ہے؟

ج......اس روپے میں (اور مرحوم کے تمام ترکہ میں) آپ کا (یعنی مرحوم کی والدہ کا) چھٹا حصہ ہے، بیوہ کا آٹھواں حصہ اور باقی تمام مرحوم کے بچوں کا ہے، بچوں کے ہوتے ہوئے مرحوم کے بھائی اور بہنوں کا کوئی حق نہیں۔

س......اگر عدّت کے بعد میرے مرحوم بیٹے کی بیوی شادی کرلیتی ہے تو میرے بیٹے کے بچوں کو کون پالے گا؟ میں تو بہت ضعیف ہوں اور کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔

ج......اگر بیوہ ایسی جگہ شادی کرلیتی ہے جو بچوں کے لئے نامحرَم ہے تو اس کو بچوں کی پروَرِش کا حق نہیں ہوگا، بلکہ نانی کو، خالہ کو، دادی کو، پھوپھی کو علی الترتیب پروَرِش کا حق ہوگا۔

س......کیا میرا بڑا بیٹا ان بچوں کو اس کی ماں سے لے سکتا ہے؟

ج......لڑکیوں کو جوان ہونے کے بعد اور لڑکوں کو سات سال کی عمر پوری ہونے پر لے سکتے ہیں۔

س......میرے مرحوم بیٹے کے بچوں اور اپنا تمام خرچہ بیوہ خود اُٹھا رہی ہے، وہ کہتی ہے کہ میرے مرحوم شوہر کے بھائی اور بہنوں کا کوئی حق نہیں ہے۔

ج......میں اُوپر لکھ چکا ہوں کہ مرحوم کے بھائی اور بہنوں کا اس کے چھوڑے ہوئے مال میں

کوئی حق نہیں ہے، ماں کا چھٹا حصہ ہے اور بیوہ کا آٹھواں حصہ، باقی سارا مال یتیموں کا ہے، جو اس کو کھائے گا وہ آگ کے انگارے کھائے گا۔

نوٹ:......یتیموں کے مال کی نگہداشت ان کے تایا کے ذمہ ہے، مگر خود نہ کھائے بلکہ بچوں پر خرچ کرے۔

پوسٹ مارٹم کی شرعی حیثیت

س......آج کل جو لوگ گولی مار کر قتل کردیئے جاتے ہیں ان کی میّت کا اسپتال میں پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے، جس سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ جسم پر کتنی گولیاں ماری گئیں؟ کہاں کہاں ماری گئیں؟ پوسٹ مارٹم کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ میّت کو مادرزاد برہنہ کرکے میز پر ڈال دیتے ہیں، پھر ڈاکٹر آکر اس کا معائنہ کرتا ہے، عورت، مرد دونوں کا پوسٹ مارٹم اسی طرح ہوتا ہے۔ کیا شریعت میں یہ پوسٹ مارٹم جائز ہے؟ جبکہ میّت کے وارث منع کرتے ہیں کہ ہم پوسٹ مارٹم نہیں کرائیں گے، ایک تو ظلم کہ فائرنگ کرکے قتل کیا اور پھر ظلم قتل کے بعد پوسٹ مارٹم کے ذریعے کیا جاتا ہے، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

ج...... پوسٹ مارٹم کا جو طریقہ آپ نے ذکر کیا ہے یہ صریح طور پر ظلم ہے اور اس کو فحاشی میں شمار کیا جاسکتا ہے، اور جب ایک آدمی مرگیا اور اس کے قاتل کا بھی پتا نہیں تو اس کی لاش کی بے حرمتی کرنے کا کیا فائدہ؟ لاش وارثوں کے حوالے کردی جائے، اور اگر لاش لاوارث ہو تو اس کی تدفین کردی جائے۔ بہرحال برہنہ پوسٹ مارٹم حد سے زیادہ تکلیف دہ ہے، خصوصاً جبکہ مردوں اور عورتوں کا ایک طرح پوسٹ مارٹم کیا جاتا ہے، یہ چند در چند قباحتوں کا مجموعہ ہے، گورنمنٹ کو چاہئے کہ اس کو ازرُوئے قانون بند کردے۔

جھوٹے حلف نامے کا کفارہ

س......ایک مدّت سے ذہنی کشمکش میں گرفتار ہوں، آپ سے رہنمائی کا طالب ہوں، قرآن وحدیث کی روشنی میں مجھے میرے مسئلے کا حل بتائیں۔

میرا شمار ایک ماہر ڈاکٹر میں ہوتا ہے، کچھ عرصہ پہلے تک میں دین سے نابلد تھا،

فہرست

تین سال قبل میں ایف آر سی ایس کرنے لندن گیا، وہاں انڈیا سے آئی ہوئی تبلیغی جماعت سے سامنا ہوگیا، اس کے بعد سے میری دُنیا بدل گئی۔ حرام، حلال کا ادراک ہوا، آپ کا کالم بڑی باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ پچھلے دنوں حرام کی کمائی کے متعلق آپ کا جواب پڑھا کہ کس طرح گھرانے کا سربراہ اپنے پورے گھر کو حرام کی کمائی کھلا رہا ہے، اور آپ نے جس طرح دُور اندیشی سے اس کی بیوی کو حل بتایا کہ کسی غیرمسلم سے قرض لے کر گھر چلاؤ۔ میں اسی دن سے سخت مضطرب ہوں، میری کہانی یہ ہے کہ بظاہر اچھے نمبر ہونے کے باوجود جب کراچی میں میڈیکل میں داخلہ نہیں ملا تو میں نے جعلی ڈومیسائل بنا کر پنجاب میں ڈاکٹری میں داخلہ لے لیا اور وہاں ہی سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اب ذہن میں یہ کشمکش ہے کہ چونکہ میں نے ڈومیسائل بنواتے وقت حلف نامہ داخل کیا کہ میں لاہور میں پیدا ہوا ہوں جو کہ جھوٹا حلف نامہ تھا۔ اس کے بعد مستقل رہائش یعنی پی آر سی بھی میں نے داخل کیا، اس کے لئے بھی جھوٹا حلف نامہ داخل کیا، تیسری غلطی یہ کی کہ جب ڈاکٹری کا فارم بھرا تو اس میں بھی جھوٹے حلف نامے داخل کئے، جھوٹے لاہور کے ایڈریس لکھے۔ اب آپ مجھے قرآن وحدیث کی روشنی میں آگاہ فرمائیں کہ ڈگری حاصل کرنے کے لئے میں نے حلال اور حرام میں تمیز نہیں کی، جھوٹے حلف نامے داخل کئے، جھوٹ پر مبنی سرٹیفکیٹ (ڈومیسائل اور پی آرسی) جمع کرائے، اگر میں یہ سب کچھ نہ جمع کراتا تو آج ڈاکٹر نہ ہوتا، نہ ہی داخلہ ملتا، اب یہ سب کچھ کرنے کے بعد جو مجھے ڈگری عطا ہوئی ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ اور اس ڈگری کی وجہ سے جو آمدنی ہو رہی ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ آیا حرام کمائی میں شمار ہوگا یا حلال کمائی کہلائے گی؟ آپ مجھے آگاہ کریں کہ آیا میری کمائی جو ڈاکٹری کے پیشے سے ہوئی ہے وہ حلال ہے یا نہیں؟ اگر حلال نہیں تو میں کچھ اور کام کرکے اپنے اہل وعیال کو حلال کمائی کھلاسکوں۔

ج...... آپ نے جھوٹے حلف نامے داخل کئے ان کا آپ پر وبال ہوا، جن سے توبہ لازم ہے، جھوٹی قسم کھانا شدید ترین گناہ ہے، اس کے لئے آپ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر توبہ کریں۔ جہاں تک آپ کی ڈاکٹری کا تعلق ہے، اگر آپ نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا ہے

فہرست

اور اس میں کوئی گھپلا نہیں کیا اور آپ میں صحیح طور ڈاکٹر کی استعداد موجود ہے تو آپ کا یہ ڈاکٹری کا پیشہ جائز ہے۔

مسجد سے قرآن گھر لے جانے کا حکم

س...... ہماری مسجد میں ۷۰۰ قرآن ہیں، پڑھنے والے یومیہ صرف ۱۳ آدمی ہوتے ہیں، رمضان میں لوگ نئے قرآن لا کر رکھ دیتے ہیں، الماری میں جگہ نہیں ہوتی، لہٰذا پچھلے سال کے قرآن بوری میں ڈال دیتے ہیں تاکہ سمندر میں ڈال دیا جائے۔ ہر مسجد میں کم و بیش یہی حال ہے۔ قرآن ضرورت سے زائد ہیں جن کو بوری میں ڈالنے کے بجائے اگر لوگوں کے گھروں میں تقسیم کردیئے جائیں تو لوگ منع کرتے ہیں کہ مسجد کا مال آپ گھروں میں کیوں تقسیم کرتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ کیا ہم مسجد سے قرآن اُٹھا کر لوگوں میں تقسیم کرسکتے ہیں تاکہ بوری میں ڈالنے اور ضائع ہوجانے سے بچ جائیں جبکہ یہ قرآن مکمل محفوظ ہوتے ہیں۔

ج...... جو قرآن مجید مسجد کی ضرورت سے زائد ہیں، باہر چھوٹے دیہات میں بھجوا دیئے جائیں جہاں قرآن مجید کی کمی ہوتی ہے۔

گٹر کے ڈھکن کے نیچے اخبار لگانا

س...... کارپوریشن گٹر کے ڈھکن سیمنٹ کے بنوا کر لگاتی ہے، جبکہ سیمنٹ کے ڈھکن کے نیچے کی طرف اخبار چپکا ہوتا ہے، اور اس کو اُکھاڑنا بھی ناممکن ہوتا ہے، ان اخباروں میں اکثر اللہ کا نام اور آیات بھی ہوتی ہیں۔ کیا یہ آیات کی بے ادبی نہیں؟ ان گٹر کے ڈھکنوں کے اُوپر جوتے رکھ کر چلنا جائز ہے؟

ج...... ایسے اخبار جن پر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لکھا ہو گٹر کے ڈھکن کے لئے ان کا استعمال جائز نہیں۔

تاریخی روایات کی شرعی حیثیت

س...... اسلامی تعلیمات اور قرآن وسنت کی روشنی میں کسی بھی مسئلہ کے حل کے لئے نگاہیں

آپ ہی کی طرف اُٹھتی ہیں، کیونکہ آپ کے عقائد قرآن اور حدیث سے سرمو متجاوز نہیں ہیں۔ آپ کی خدمت میں مؤرخہ ۲۰ر مئی ۱۹۹۴ء کا روزنامہ جنگ کا تراشا بھیج رہا ہوں، امید ہے آپ اپنے بے پناہ مصروف شیڈول میں سے وقت نکال کر اس کو پڑھیں گے اور اس خاکسار کی اُلجھن کو رفع کریں گے۔ گوکہ اس تراشے میں کوئی ایسی بات نہیں جو میرے ایمان اور عقائد پر کوئی اثر ڈال رہی ہو، مگر جب بھی نگاہ اس طرح کے مضامین پر پڑتی ہے جس میں یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ مضمون نگار کے پاس یہ معلومات کہاں سے آئی ہیں؟ تو شدید اُلجھن پیدا ہو جاتی ہے۔

محترم مولانا! ہم کم علم لوگ یہ خاص طور پر میں اپنے آپ کے لئے کہہ رہا ہوں، ہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات اور معلومات جس میں اس کائنات سے لے کر، ایمان و عقائد کے جملہ مسائل موجود ہیں، کا منبع قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہیں۔ اگر کوئی مضمون نگار کوئی ایسی بات لکھتا ہے جو قرآن سے ثابت نہ ہو اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو نہ بتائی ہو اس کی صحت تسلیم کرنے میں دل بہت لیت ولعل سے کام لیتا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اس مضمون میں مضمون نگار نے غلط باتیں لکھی ہیں، مگر تھوڑا بہت جو قرآن کا مطالعہ کیا ہے اور احادیث اور ان کی تشریحات پڑھی ہیں اس پر یہ مضمون فٹ نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ اُلجھن اور غلط فہمی محض میری جہالت کی وجہ سے ہو، اس لئے معاملہ آپ کی طرف لوٹاتا ہوں۔ براہِ مہربانی وضاحت کیجئے کہ مضمون نگار نے جو کچھ اس مضمون میں لکھا ہے اس کا مأخذ اور منبع کیا ہے اور اگر یہ باتیں صحیح ہیں تو اس کی صحت کی سند کیا ہے؟ اور غلط ہیں تو براہ مہربانی بے لاگ تبصرہ فرمادیجئے، شکریہ۔

ج......آپ کی فرمائش پر میں نے منسلکہ مضمون کو پڑھا، اس پر کچھ روایات ہیں اور کچھ مضمون نگار کے اخذ کردہ نتائج اور قیاسات ہیں۔ تاریخی روایات بعض صحابہؓ وتابعینؒ سے مروی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں، بہرحال مضمون نگار نے جو اقوال نقل کئے ہیں وہ تفسیر ابن جریر اور کتبِ تفسیر میں موجود ہیں۔ ان روایات واقوال کی حیثیت محض ایک تاریخی واقعہ کی ہے، جس کا عقیدہ وعمل سے کوئی تعلق نہیں، اور تاریخی روایات پر صحتِ سند کا

فہرست

بھی زیادہ اونچا معیار برقرار نہیں رہتا، لہٰذا ان کو بس اسی حیثیت سے نقل کیا جائے، نہ صحتِ سند کی ضمانت دی جاسکتی ہے- الا ماشاء اللہ- نہ ان کے تسلیم کرنے پر کسی کو مجبور کیا جاسکتا ہے، اور نہ ان پر کسی عقیدے یا عمل کی بنیاد ہی رکھی جاسکتی ہے۔ یہ اصول نہ صرف زیرِ بحث روایات ہی سے متعلق ہے، بلکہ تمام تاریخی روایات سے متعلق ہے، اس کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔قرآن و حدیث تمام علوم کا سرچشمہ ہے، لیکن قرآن تاریخ کی کتاب نہیں جس میں تاریخی واقعات کو مفصل و مرتب شکل میں بیان کرنے کا التزام کیا گیا ہو، اسی طرح احادیثِ شریفہ کو سمجھنا چاہئے، اگر کوئی واقعہ قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے یا حدیثِ صحیح میں وارد ہوا ہے تو اس کا ماننا ضروری ہے، ورنہ تردّد و قبول دونوں کی گنجائش ہے۔

مضمون نگار نے ''اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ'' کی جو تشریح کی ہے اس میں حدود سے تجاوز ہے، حالانکہ اس کے مضمون کا مرکزِ ماخذ تفسیر بغوی ہے، اور اس پر اس جملہ کی تفسیر میں متعدد اقوال نقل کئے ہیں۔اسی طرح مصنف کے بعض قیاسات بھی محلِ نظر ہیں، جن کی تفصیل کی نہ فرصت ہے، نہ ضرورت ہے!

غیرمسلموں کا مساجد میں سیر و معائنہ کے لئے داخلہ

س...... مسئلہ کچھ یوں ہے کہ آج کل ملک میں ممالکِ غیر سے حکومتی وفود آتے رہتے ہیں، جن میں غیرمسلم بھی شامل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو حکومتی اربابِ حل و عقد و صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی رضامندی سے مساجد کی سیر کروائی جاتی ہے، خاص طور پر ''فیصل مسجد'' اسلام آباد۔ان وفود میں عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں، تو ایسی صورتِ حال میں ان عورتوں اور غیرمسلموں کا مساجد میں داخل ہونا کیا جائز ہے؟

ج...... چند مسائل لائقِ توجہ ہیں:

ا:...... مساجد عبادت گاہیں ہیں، تفریح گاہیں نہیں، ان کو تفریح کی جگہ بنالینا نہایت بُری بات ہے۔

۲:...... غیرمسلم کا مسجد میں جانا تو جائز ہے، لیکن یہ آنے والے اکثر لوگ ایسے

ہوتے ہیں جنھوں نے غیر ستر کا لباس پہنا ہوا ہوتا ہے، ان کے گھٹنے ننگے ہوتے ہیں، عورتیں بے پردہ ہوتی ہیں، اور ان میں سے بہت ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں نے غسلِ جنابت بھی نہ کیا ہو، ایسی حالت میں ان کا مساجد میں آنا حرام اور مسلمانوں کے لئے قابلِ نفرین ہے۔

۳:...... بہت سی عورتیں ایسی ہیں کہ وہ ناپاک حالت میں ہونے کی وجہ سے مساجد میں جانے کی اہل نہیں ہوتیں۔ حیض و نفاس کی حالت میں ہیں یا زچگی کی حالت میں ہیں یا جنابت کی حالت میں ہیں، اور وہ تو چونکہ جاہل ہیں، ان کو مسئلہ معلوم نہیں، نہ ان کے دِل میں اللہ کے گھروں کا احترام ہے، اس لئے بے تکلف وہ بھی آتی جاتی ہیں، ایسی عورتوں کا آنا اور ان کو آنے کی اجازت دینا موجبِ لعنت ہے۔

۴:...... بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ اپنے ساتھ کھیل کود کا سامان لئے پھرتے ہیں، کیمرے ان کے گلے میں حمائل ہیں اور کھانے پینے سے ان کو کوئی پرہیز نہیں، چھوٹے بچے کھیل کود میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ الغرض! مسجد کو بہت سی بے حرمتیوں کا نشانہ بنالیا جاتا ہے، اس لئے ان کا آنا صحیح نہیں۔

۵:...... حکومت اگر غیرمسلموں کو اجازت دیتی ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ ان کے دِلوں میں اسلام کی عظمت قائم ہو، لیکن حکومت کو چاہئے کہ اس کے داخلے کے لئے خاص شرائط مقرّر کرے۔

کیا یونین کے غلط حلف کو توڑنا جائز ہے؟

س...... ہمارے ادارے کے لیبر یونین کے دو رہنماؤں نے گزشتہ چند ماہ قبل ہمارے چند ساتھیوں سے فرداً فرداً وفاداری کا حلف قرآن پاک پر ہاتھ رکھوا کر اُٹھوایا، لیکن اب مذکورہ یونین اور اس کے متعلقہ دونوں رہنما حلف اُٹھانے والوں کے حقوق و اختیارات کو سلب کر رہے ہیں، ادارے کے مزدوروں کے مفادات کے خلاف کام کر رہے ہیں اور ذاتی مفادات حاصل کر رہے ہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی مزدور ان کے خلاف آواز اُٹھاتا ہے تو اسے انتقامی کاروائی کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اس صورتِ حال میں ہمارا مذکورہ یونین و متعلقہ دونوں

رہنماؤں کے ساتھ چلنا مشکل ہے۔

حلف کا متن

''میں فلاں بن فلاں حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ میں یونین کا وفادار رہوں گا، اگر میں غداری کروں گا تو مجھ پر خدا کی مار پڑے گی، اگر میں اس حلف کو توڑنے اور کفارہ ادا کرنے کی غرض سے مولوی یا عالم سے رُجوع کروں گا تو بھی مجھ پر خدا کی مار پڑے گی۔''

اس حلفِ وفاداری کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس حلف کو توڑا جاسکتا ہے تو اس کا کفارہ کیا ہے؟

ج...... کسی فرد یا ادارے یا تنظیم کے ساتھ وفاداری کا ایسا عہد کرنا کہ خواہ وہ جائز کام کرے یا ناجائز، ہر حال میں اس کا وفادار رہے گا، یہ شرعاً جائز نہیں۔ ہاں! یہ عہد کرنا صحیح ہے کہ اچھے اور نیک کام میں وفاداری کروں گا، غلط اور بُرے کام میں وفاداری نہیں کروں گا۔

آپ نے ''حلف نامہ'' کا جو ''متن'' نقل کیا ہے، یہ غیر مشروط وفاداری کا ہے، اور یہ شرعاً ناجائز ہے، خصوصاً اس میں جو کہا گیا ہے کہ: ''کسی مولوی سے بھی رُجوع کروں تو مجھ پر خدا کی مار پڑے'' کے الفاظ بھی ناجائز ہیں۔

۲:...... اگر آدمی غلط اور ناجائز قسم کھالے تو اس کا توڑ دینا واجب ہے اور ایسی قسم کھانے پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور توبہ کرے۔

۳:...... اس حلف کو توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ اس ناجائز حلف کو توڑ کر قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرے، اور قسم توڑنے کا کفارہ قرآنِ کریم میں یہ بیان فرمایا کہ دس محتاجوں کو دو وقت کا کھانا کھلائے (اور اگر کھانا کھلانے کی بجائے ہر محتاج کو صدقۂ فطر کی مقدار غلہ یا اس کی نقد قیمت دیدے تب بھی صحیح ہے)، یا دس محتاجوں کو لباس پہنائے (ہر محتاج کو اتنا لباس دینا کافی ہے جس میں نماز جائز ہو، یعنی ایک لنگی جس سے ناف سے گھٹنوں تک ستر چھپ جائے)، اور یہ نہ کرسکتا ہو تو تین دن کے روزے رکھے۔

کنٹیکٹ لینسز کی صورت میں وضو کے مسائل

س...... آج کل نظر کی عینک کے بجائے ''کنٹیکٹ لینسز'' کا استعمال بہت عام ہو رہا ہے،

کنٹیکٹ **لینسز** آنکھ کے اندر (گول کالے والے حصے کے اُوپر) لگایا جاتا ہے۔ یہ پلاسٹک کی گول شکل میں ہے اور آنکھ کے اس حصے کو ڈھانپ لیتا ہے اور پھر اس کو لگانے کے بعد نظر کی عینک کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ ٹرانس پیرنٹ یعنی شفاف بھی ہوتا ہے، اور مختلف رنگوں میں بھی دستیاب ہے۔ پوچھنا یہ ہے مولانا صاحب! کہ کیا **لینسز** کی آنکھ میں موجودگی کے دوران اگر نماز کے لئے وضو کیا جائے تو کیا وہ دُرست ہوگا؟ (**لینسز** پہننے کے بعد منہ دھویا جاسکتا ہے اگر آنکھ کے اندر پانی بھی چلا جائے تو کوئی حرج نہیں ہوتا، یہ بات ڈاکٹرز کہتے ہیں)۔ براہ مہربانی آپ اسلامی نقطۂ نظر اور وضو کے قواعد وضوابط کے مطابق بتائیں کہ آیا وضو دُرست ہوجاتا ہے یا نہیں؟ دُوسری بات یہ ہے کہ روزے میں اس کے لگانے سے کوئی قباحت تو نہیں؟ روزے کے ٹوٹنے یا مکروہ ہونے کا کوئی ہلکا سا بھی احتمال تو نہیں؟

ج...... اس سے وضو اور غسل پر کوئی فرق نہیں پڑتا، اور روزے پر بھی کوئی کراہت لازم نہیں آتی۔

شوہر کے مرتد ہونے سے نکاح فسخ ہوگیا

س...... میری عمر ۳۰ سال ہے، میرے والد پی آئی اے میں ڈرائیور تھے جو کہ اب ریٹائرڈ ہوچکے ہیں، میرا ایک بھائی جو کہ ابھی زیرِ تعلیم ہے، میری والدہ دِل کی مریضہ ہیں۔ میری شادی والدین کی رضامندی سے میری پھوپھی کے بیٹے سے انڈیا میں ہوئی ہے، میرے شوہر کا نام سعید شیخ ہے، جس سے میرے دو لڑکے ہیں، لڑکے کی عمر ۱۳ سال اور چھوٹے کی عمر ۱۱ سال۔ میرے شوہر نے اب ہندو مذہب اپنالیا ہے اور انڈیا کی تحریک شوشنا جو کہ ہندو تحریک ہے اس میں شامل ہوگیا ہے، شراب پیتا، جوا کھیلتا اور عورتوں کو گھر میں لاتا، قرآن کو پھاڑ کر زمین پر ڈال کر شراب ڈال کر اطراف ناچ ناچ کر یہ کہتا ہے کہ: ''دیکھو تمہارا اللہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا''، اور یہ کہ: ''جب میں مرجاؤں گا تو مجھ کو جلانا''۔ مولانا صاحب! یہ مجھے ناجائز کاموں کے لئے کہتا ہے اور اپنے ہندو دوستوں کو گھر میں لاکر مجھ سے کہتا ہے کہ میں ان سے غلط تعلقات قائم کروں، جب یہ سب ماننے سے میں انکار کرتی ہوں تو مجھے بہت

مارتا ہے اور سگریٹ سے جلاتا ہے۔ ان سب باتوں کی خبر میرے والدین کو ہوئی تو میری والدہ انڈیا آکر مجھے اور بچوں کو پاکستان لے آئیں، مجھے پاکستان آئے ہوئے ۲ سال ۷ مہینے ہوگئے ہیں۔ میرا میرے شوہر سے کوئی رابطہ نہیں ہے، نہ وہ مجھے کوئی خرچ، نہ خط، کچھ بھی نہیں بھیجتا ہے۔ میں گھر کے قریب ایک فیکٹری میں کام کرکے اپنے بچوں کی کفالت کرتی ہوں۔ مولانا صاحب! قرآن وسنت کی روشنی میں میرا ایسے شخص کے ساتھ نکاح ہے یا ختم ہوگیا ہے؟ (میرے شوہر نے گھر میں مندر بنالیا ہے اور بدھ کو پوجا صبح شام کرتے ہیں، اور مجھے نماز روزے کسی بھی چیز کی اجازت نہیں ہے)۔

ج...... جو واقعات سوال میں لکھے ہیں، اگر صحیح ہیں تو شوہر کے مرتد ہوجانے کے بعد نکاح فسخ ہوچکا ہے، اور چونکہ اس عرصے میں عدّت ختم ہوچکی ہے اس لئے آپ اگر چاہیں تو دُوسری جگہ شادی کرسکتی ہیں، پہلے شوہر کے ساتھ اب کوئی تعلق نہیں رہا۔

چار شادیوں پر پابندی اور مساوات کا مطالبہ

س...... گزشتہ دنوں کراچی میں عورتوں کے عالمی دن کے موقع پر مختلف سماجی تنظیموں کی جانب سے تقاریب منعقد ہوئیں، جن میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ: ''ایک سے زیادہ شادیوں پر پابندی عائد کی جائے اور عورتوں کو مردوں کے مساوی وراثت کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ اسی طرح شادی اور طلاق میں عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔''

۱:...... اسلامی نقطۂ نگاہ سے ان مطالبات کی کیا اہمیت ہے؟

۲:...... ایسے مطالبے کرنے والے شرعی نقطۂ نگاہ سے کیا اب تک دائرۂ اسلام میں داخل ہیں؟

۳:...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اَحکامات کا مذاق اُڑانے والوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اَحکامات کے خلاف آواز اُٹھانے والوں کی اسلام میں کیا سزا ہے؟

ج...... ان بے چاری خواتین نے جن کے مطالبات آپ نے نقل کئے ہیں، یہ دعویٰ کب کیا

ہے کہ وہ اسلام کی ترجمانی کررہی ہیں، تاکہ آپ یہ سوال کریں کہ وہ دائرۂ اسلام میں رہیں یا نہیں؟ رہا یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ان مطالبات کی کیا اہمیت ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مرد کو بشرطِ عدل چار شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے، عورت کو چار شوہر کرنے کی اجازت اللہ تعالیٰ نے تو کجا؟ کسی ادنیٰ عقل وفہم کے شخص نے بھی نہیں دی۔ اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے وراثت اور شہادت میں عورت کا حصہ مرد سے نصف رکھا ہے، اور طلاق کا اختیار مرد کو دیا ہے، جبکہ عورت کو طلاق مانگنے کا اختیار دیا ہے، طلاق دینے کا نہیں۔ اب فرمانِ الٰہی سے بڑھ کر اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کون کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مسلم معاشرے میں بڑی بھاری اکثریت ایسی باعفت، سلیقہ منداور اطاعت شعار خواتین کی رہی ہے جنھوں نے اپنے گھروں کو جنت کا نمونہ بنا رکھا ہے، واقعتاً حورانِ بہشتی کو بھی ان کی جنت پر رشک آتا ہے، اور یہ پاکباز خواتین اپنے گھر کی جنت کی حکمران ہیں، اور اپنی اولاد اور شوہروں کے دِلوں پر حکومت کررہی ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض گھروں میں مرد بڑے ظالم ہوتے ہیں اور ان کی خواتین ان سے بڑھ کر بے سلیقہ اور آدابِ زندگی سے ناآشنا۔ ایسے گھروں میں میاں بیوی کی ''جنگِ اَنا'' ہمیشہ برپا رہتی ہے اور اس کے شور شرابے سے ان کے آس پڑوس کے ہمسایوں کی زندگی بھی اجیرن ہوجاتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ''عورتوں کے عالمی دن'' کے موقع پر جن بیگمات نے اپنے مطالبات کی فہرست پیش کی ہے، ان کا تعلق بھی خواتین کے اسی طبقے سے ہے جن کا گھر جہنم کا نمونہ پیش کررہا ہے، اور اس کے جگر شگاف شعلے اخبارات کی سطح تک بلند ہورہے ہیں، اور وہ غالباً اپنے ظالم شوہروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کررہی ہیں، اور چونکہ یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ وہ دُوسروں کو بھی اپنے جیسا سمجھا کرتا ہے اس لئے اپنے گھروں کو جہنم کی آگ میں جلتے ہوئے دیکھ کر یہ بیگمات سمجھتی ہوں گی کہ جس طرح وہ خود مظلوم ومقہور ہیں، اور اپنے ظالم شوہروں کے ظلم سے تنگ آچکی ہیں، کچھ یہی کیفیت مسلمانوں کے دُوسرے گھروں میں بھی ہوگی، اس لئے وہ بزعمِ خود تمام مسلم خواتین کی طرف سے مطالبات

پیش کر رہی ہیں۔ حالانکہ یہ ان کی ''آپ بیتی'' ہے، ''جگ بیتی'' نہیں۔ سو ایسی خواتین واقعی لائقِ رحم ہیں، ہر نیک دِل انسان کو ان سے ہمدردی ہونی چاہئے، اور حکومت سے مطالبہ کیا جانا چاہئے کہ ان مظلوم بیگمات کو ان کے درندہ صفت شوہروں کے چنگل سے فوراً نجات دِلائے۔

میں ایسے مطالبے کرنے والی خواتین کو مشورہ دُوں گا کہ وہ اپنی برادری کی خواتین میں یہ تحریک چلائیں کہ جس شخص کی ایک بیوی موجود ہو اس کے حبالہ عقد میں آنے کو کسی قیمت پر بھی منظور نہ کیا کریں، ظاہر ہے کہ اس صورت میں مردوں کی ایک سے زیادہ شادی پر خود بخود پابندی لگ جائے گی اور ان محترم بیگمات کو حکومت سے مطالبہ کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

رہا طلاق کا اختیار تو اس کا حل پہلے سے موجود ہے کہ جب بھی میاں بیوی کے درمیان اَن بن ہو فوراً خلع کا مطالبہ کر دیا جائے، ظالم شوہر خلع نہ دے تو عدالت خلع دِلوادے گی، بہرحال اس کے لئے حکومت سے مطالبے کی ضرورت نہیں۔ رہا مرد و عورت کی برابری کا مسئلہ! تو آج کل امریکہ بہادر اس مساوات کا سب سے بڑا علمبردار بھی ہے اور ساری دُنیا کا اکیلا چودھری بھی، یہ مطالبہ کرنے والی خواتین امریکی ایوانِ صدر کا گھیراؤ کریں اور مطالبہ کریں کہ جب سے امریکہ مہذب دُنیا کی برادری میں شامل ہوا ہے آج تک اس نے ایک خاتونِ خانہ کو بھی امریکی صدارت کا منصب مرحمت نہیں فرمایا، لہٰذا فی الفور امریکہ کے صدر کلنٹن صدارت کے منصب سے اپنی اہلیہ محترمہ کے حق میں دستبردار ہو جائیں، اسی طرح امریکی حکومت کے وزراء اور ارکانِ دولت بھی اپنی اپنی بیگمات کے حق میں دستبردار ہو کر گھروں میں جا بیٹھیں، پھر یہ خواتین فوراً یہ قانون وضع کریں کہ جتنا عرصہ مردوں نے امریکہ پر راج کیا ہے اتنے عرصے کے لئے خواتین حکومت کریں گی، اور اتنے عرصہ تک کسی مرد کو امریکی حکومت کے کسی منصب پر نہیں لیا جائے گا، تاکہ مرد و زن کی مساوات کی ابتدا امریکہ بہادر سے ہو۔ اگر ان معزّز خواتین نے اس معرکے کو سر کر لیا تو دُنیا میں عورت اور مرد کی برابری کی ایسی ہوا چلے گی کہ ان خواتین کو اخبارات کے اوراق سیاہ

کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی، اللہ تعالیٰ ان خواتین کے حالِ زار پر رحم فرمائیں۔

مذہب سے باغی ذہن والے کا خواب اور اس کی تعبیر

س…… ایک بچی نے اپنا ایک طویل اور عجیب و غریب خواب ذکر کیا تھا، جس میں طبیعت کی جذباتیت کی بنا پر تشکیک، اِلحاد اور اعمالِ صالحہ سے بے رغبتی کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک خواب بیان کیا، جس میں عالمِ برزخ میں رُوحوں کی آپس میں ملاقات، ملائکہ سے گفتگو اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی تجلیات کے نورانی پَردوں میں زیارت اور اللہ رَبّ رحیم کی مہربان ذات سے شرفِ ہم کلامی کا حسین و جمیل منظر پیش کیا گیا تھا، اس پر چند حروف رقم کرتا ہوں تاکہ خواب کی دُنیا کا کچھ خاکہ بھی سامنے آجائے اور مذکورہ خواب کے کچھ تعبیری پہلوؤں کا تذکرہ بھی ہوجائے۔

ج…… بیٹی! میرے پاس اتنے لمبے خط پڑھنے کی فرصت نہیں ہوتی، مگر تمہارا خط اس کے باوجود اوّل سے آخر تک پورا پڑھا۔ پہلے یہ سمجھ لو کہ خواب میں آدمی کے خیالات جو اس کے تحت الشعور اور لاشعور میں دبے ہوئے ہوتے ہیں، مختلف صورتوں میں متشکل ہوجاتے ہیں، اس لئے یہ پتہ چلانا کہ خواب کے کون سے اجزاء اصل واقعہ ہیں اور کون سے ذہنی خیالات کی پیداوار، بڑا مشکل ہوتا ہے۔

دُوسری بات یہ ملحوظ رکھنی چاہئے کہ خواب کے جو اجزاء آدمی کے ذہنی خیالات سے ماورا ہوں، وہ بھی تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں، ان کے ظاہری مفہوم مراد نہیں ہوتے۔

تیسری بات یہ یاد رہنی چاہئے کہ مابعد الموت (قبر اور حشر) کے حالات اس دُنیا میں کامل و مکمل ظاہر نہیں ہوسکتے، نہ بیداری میں اور نہ خواب میں، اس لئے کہ ہماری اس زندگی کا پیمانہ ان کا متحمل ہی نہیں ہوسکتا، اس لئے خواب میں مابعد الموت کے جو مناظر دِکھائے جاتے ہیں، وہ ایک ہلکی سی جھلک ہوتی ہے۔

ان تین باتوں کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب اپنے خواب پر غور کیجئے، آپ کا ذہن مذہب سے باغی اور خدا کا منکر تھا، موت کے بعد کی زندگی کا قائل نہیں تھا، اس لئے حق

تعالیٰ شانہ نے آپ کو خواب میں اس زندگی کے بارے میں (آپ کی قوّتِ برداشت کی رعایت رکھتے ہوئے) چند ہلکے پھلکے مناظر دِکھائے، نانی اماں نے جس پوسٹ آفس کی بات کی تھی، اس سے مراد دُعا و اِستغفار اور ایصالِ ثواب ہے، جو زندوں کی طرف سے مرحومین کو کیا جاتا ہے، اور اَرواح کا آپس میں خوش گپیوں میں مشغول دیکھنا، اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ مسلمان اَرواح کی وہاں ملاقات ہوتی ہے، اور فرشتوں کے ساتھ آپ کی گفتگو اور آپ کو رَبّ العالمین سے ملاقات کے لئے جانا اس طرف اشارہ تھا کہ اہلِ ایمان کے ساتھ بہت رحمت و شفقت کا معاملہ کیا جاتا ہے، اور نماز، روزہ اور تلاوت کے بارے میں سوالات اس بات پر تنبیہ تھی کہ وہاں یہی چیزیں کام آتی ہیں جن کو یہاں ہم لوگ "شغلِ بے کاری" سمجھا کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کہا جانا کہ "کیسی ہو تم؟" اس پر آپ کے ان الفاظ سے مجھے تو وجد آ گیا کہ "میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اس آواز میں کتنی نرمی اور محبت ہوتی ہے، آہ! وہ میٹھی مہربان اور شفقت بھری آواز"۔ واقعی حق تعالیٰ شانہ کے کلام کی شیرینی اور مٹھاس اور اس کی لذّت اور سحر آفرینی کی کیفیت سے الفاظ کا ناطقہ بند ہے، یہ آپ کو ذرا سی جھلک دِکھائی گئی کہ کلامِ الٰہی میں کیا لذّت، تأثیر ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ان مقبول بندوں کا کیا عالم ہوگا جن کو حق تعالیٰ شانہ اپنی ہم کلامی کا شرف عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے لطف سے، محض اپنے فضل سے اپنی ذاتِ عالی کے طفیل ہمیں بھی یہ دولتِ کبریٰ نصیب فرمائیں۔

حق تعالیٰ شانہ کے دیدار کی جو کیفیت آپ نے قلمبند کی ہے، وہ محض ایک ہلکی پھلکی سی تمثیل ہے، ورنہ ساری دُنیا کی ماؤں کی ممتا بھی یکجا کرلی جائے اور پوری کائنات کا حسن و جمال بھی کسی ایک چیز میں مرتکز ہو جائے تو وہ اس پاک ذات کی ادنیٰ مخلوق ہوگی، مخلوق کو خالق سے کیا نسبت؟ اور اس بے مثال ذاتِ عالی کی کیا مثال؟ بہرحال یہ سارے مناظر آپ کے ذہنی پیمانے کے مطابق تھے اور آپ کی "انکارِ خدا کی آگ" پر نشتر لگانا تھا کہ کیا یہ سب کچھ دیکھ کر بھی خدا کا انکار کروگی؟ اب میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ آپ کا یہ خواب مبارک ہے اور اس میں آپ کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اپنی زندگی کی لائن تبدیل کریں اور

اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تیاری میں مشغول ہوجائیں۔ جوان ہونے کے بعد آپ سے حقوق اللہ اور حقوق العباد میں جو جو کوتاہیاں ہوئی ہیں، عبادات میں سستی ہوئی ہے، اس سے توبہ کریں اور ان تمام چیزوں کی تلافی کریں۔ ہاں! یہ بات بھی یاد رکھیں کہ خوابوں سے نہ کوئی ولی بنتا ہے اور نہ یہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس لئے خواب کو کوئی اہمیت نہ دی جائے بلکہ بیداری کے اعمال، اخلاق، عقائد کو دُرست کرنے اور اللہ و رسولؐ کے مطابق بنانے پر پوری توجہ اور ہمت لگانی چاہئے۔ میری معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ مابعد الموت کے یہ تمام مناظر جو آپ کو دِکھائے گئے ہیں ان کی حقیقت اتنی ہی نہیں جو آپ کو دِکھائی گئی، وہاں کے جتنے حالات سمجھ میں آسکتے ہیں وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرماچکے ہیں، اس سے زیادہ وہاں کے حالات سمجھ میں نہیں آسکتے جب تک کہ وہاں جاکر ان کا مشاہدہ نہ ہوجائے۔ بہرحال آپ کا فرض ہے کہ اب آپ زندگی کی لائن کو بدلیں تاکہ جب آپ یہاں سے جائیں تو آپ کا شمار ''مؤمنات قانتات'' میں ہو اور اس کے لئے ضروری ہے کہ کسی شیخ متبعِ سنت سے اصلاحی تعلق قائم کرلیں اور ان کی ہدایات کے مطابق زندگی گزاریں، واللہ الموفق!

کیا میں زندگی میں وصیت کرسکتا ہوں؟

س…… میرا ارادہ ہے کہ میں سنت کے مطابق اپنی زندگی میں وصیت کروں، میری صرف ایک لڑکی ہے، دُوسری کوئی اولاد نہیں، اور ہم چار بھائی ہیں اور پانچ بہنیں ہیں، جو سب شادی شدہ ہیں، ہم چاروں بھائیوں کی کمائی جدا جدا ہے، اور والد مرحوم کی میراث صرف برساتی زمین ہے جو اَب تک تقسیم نہیں ہوئی، باقی ہر کسی نے اپنی کمائی سے دُکان، مکان خرید کیا ہے، جو ہر ایک کے اپنے اپنے نام پر ہے، اور میری اپنی کمائی سے دو دُکان اور رہائشی مکان ہیں، ایک میں، میں خود رہتا ہوں اور دُوسرے مکان کو کرایہ پر دے رکھا ہے، اور ایک آٹے کی چکی ہے جس کی قیمت تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار روپے ہے۔ اب میرا خیال ہے کہ میں ایک دُکان لڑکی اور اپنی زوجہ کے نام کروں اور دُوسری دُکان اور چکی اور مکان جو کرایہ

فہرست

پر ہے ان کے بارے میں خدا کے نام پر وصیت کروں یعنی کسی مسجد یا دینی مدرسہ میں ان کی قیمت فروخت کر کے دے دی جائے، اور بقایا زمین کا میرا حصہ وہ بھائیوں اور بہنوں کو ملے، اور کیونکہ میرا کوئی لڑکا وغیرہ نہیں ہے جو بعد میں میرے لئے دُعا وفاتحہ کرے اس لئے اب میرے دِل میں فکر رہتا ہے کہ میں اپنی تمام جائیداد کی وصیت کر کے دُنیا سے جاؤں اور تمام جائیداد کو اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے وقف کردُوں جو صدقۂ جاریہ بن جائے، اور میں نے ایک عالمِ دین سے مسئلہ وصیت کا دریافت کیا، اس نے کہا: آپ زندگی میں اپنی جائیداد فروخت کر کے کسی دینی مدرسہ میں لگادیں کیونکہ آج کل بھائی لوگ وصیت کو پورا نہیں کرتے، اس لئے آپ اپنی زندگی میں یہ کام کرلیں۔ لیکن مولانا صاحب! آج کل حالات اجازت نہیں دیتے ہیں کیونکہ میری دس سال کی کمائی ہوئی چیزیں ہیں اور کوئی دُوسرا ذریعہ نہیں ہے کہ میں اپنی زندگی بسر کروں اور مزدوری نہیں کرسکتا ہوں، زمین وغیرہ برساتی ہے اس پر کوئی بھروسہ نہیں ہے، اگر میں ان کو اپنی زندگی میں فروخت کر کے صدقہ کروں تو ڈَر ہے محتاج ہونے کا، اور اب میری عمر چالیس بیالیس ہے، آپ براہِ کرم میری رہنمائی فرمائیں، کیا کروں؟ اور باقی میرے بھائی وغیرہ سب الحمدللہ اچھی حالت میں ہیں، محتاج نہیں، صاحبِ دولت ہیں، اگر میں کسی اور کو اپنا وکیل مقرّر کروں کہ آپ میرے مرنے کے بعد یہ فروخت کر کے دینی کام میں لگادیں یا کسی عالمِ دین کو وکیل بنادُوں تو کیسا ہے؟ کیونکہ وارثوں پر بھروسہ نہیں ہے، وہ اپنی لالچ میں وصیت کو پورا نہ کریں گے، اس لئے آپ میری جائیداد تقسیم کر کے اور وصیت کے بارے میں بتا کر شکریہ کا موقع دیں۔ میرے وارث یہ ہیں: چار بھائی، پانچ بہنیں، ایک لڑکی، بیوی اور میری والدہ صاحبہ۔

ج…… آپ کے خط کے جواب میں چند ضروری مسائل ذکر کرتا ہوں:

۱:…… آپ اپنی صحت کے زمانے میں کوئی دُکان یا مکان بیوی کو یا لڑکی کو ہبہ کردیں تو شرعاً جائز ہے، مکان یا دُکان ان کے نام کر کے ان کے حوالہ کردیں۔

۲:…… یہ وصیت کرنا جائز ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرا اتنا مال مساجد و مدارس میں دے دیا جائے۔

۳:...... وصیت صرف ایک تہائی مال میں جائز ہے، اس سے زیادہ کی وصیت وارثوں کی اجازت کے بغیر صحیح نہیں، اگر کسی نے ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کی تو تہائی مال میں تو وصیت نافذ ہوگی، اس سے زیادہ میں وارثوں کی اجازت کے بغیر نافذ نہیں ہوگی۔

۴:...... اگر کسی کو اندیشہ ہو کہ وارث اس کی وصیت کو پورا نہیں کریں گے تو اس کو چاہئے کہ دو ایسے آدمیوں کو جو متقی اور پرہیزگار بھی ہوں اور مسائل کو سمجھتے ہوں، اس وصیت کو پورا کرنے کا ذمہ دار بنادے، اور وصیت لکھوا کر اس پر گواہ مقرّر کردے اور گواہوں کے سامنے یہ وصیت ان کے سپرد کردے۔

۵:...... وفات کے وقت آپ جتنی جائیداد کے مالک ہوں گے اس میں سے ایک تہائی میں وصیت نافذ ہوگی، اور باقی دو تہائی میں درج ذیل حصے ہوں گے:

۱:...... بیوی کا آٹھواں حصہ۔ ۲:...... والدہ کا چھٹا حصہ۔ ۳:-بیٹی کا نصف۔

۴:...... باقی بھائی بہنوں میں اس طرح تقسیم ہوگا کہ بھائی کا حصہ بہن سے دُگنا ہو۔

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ پر کام کرنے کا حکم

س...... میں کمپیوٹر کے شعبے سے منسلک ہوں اور میری ذمہ داری انٹرنیٹ کے ساتھ ہے، اس میں ہر قسم کے پروگرام ہوتے ہیں۔ کیا شرعی حیثیت سے اس کام کو کرنے کی اجازت ہے؟

ج...... کمپیوٹر جدید دور کی ایسی ٹیکنالوجی ہے جس میں مفید اور مضر دونوں کام لئے جاسکتے ہیں، اس لئے اس کو استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ البتہ اس میں کوشش کی جاتی ہے کہ جو اس کے بُرے پہلو اور غلط اثرات ہیں اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا جائے۔ اس شعبہ سے منسلک ہونا اور کام کرنے میں کوئی قباحت نہیں، بلکہ کوشش کرنی چاہئے کہ اس شعبہ خاص انٹرنیٹ میں زیادہ سے زیادہ اسلام سے متعلق کام کیا جائے اور اس کو کافروں کے لئے آزاد نہ چھوڑا جائے۔

عیسائی عورت سے نکاح کا شرعی حکم

س...... کوئی مسلمان اپنی مسلمان بیوی کے ہوتے ہوئے کسی دُوسرے غیر مسلم ملک میں

فہرست

صرف ملازمت کی خاطر عیسائی عورت سے شادی کر سکتا ہے کہ نہیں؟ اور ایسا کرنے کی شکل میں اس کا پہلا نکاح کیسا ہوگا؟ باقی رہے گا؟ وہ عیسائی (عورت) اس کے لئے حلال ہوگی؟ اور اس مسلمان شخص کا ایمان باقی رہے گا؟ اور اس کی کمائی، دولت مسجد میں لگانا کیسا ہوگا؟

ج...... پہلے سے مسلمان بیوی کا نکاح میں ہونا تو عیسائی عورت کے ساتھ نکاح کرنے سے مانع نہیں، البتہ چند دیگر وجوہ کی بنا پر ایسی شادی ناجائز ہے۔

اوّلاً:...... اہلِ کتاب کی جن عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے ان سے مراد وہ اہلِ کتاب ہیں جو دارالاسلام کے شہری ہوں، جن کو ''ذمی'' کہا جاتا ہے، دارالکفر کے باشندے مراد نہیں۔ لہٰذا اسلامی مملکت کی ذمی عورتوں سے، جبکہ وہ اہلِ کتاب دارالحرب میں رہتے ہیں ان کی عورتوں سے نکاح مکروہِ تحریمی ہے (اور مکروہِ تحریمی، حرام کے قریب ہونے کی وجہ سے ناجائز کہلاتا ہے) لہٰذا یہ نکاح منعقد تو ہوجائے گا مگر مکروہِ تحریمی ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگا اور ایسا کرنے والا گناہگار ہوگا۔

ثانیاً:...... اہلِ کتاب کی عورتوں کے ساتھ نکاح کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ واقعتاً اہلِ کتاب ہوں بھی، محض نام کے عیسائی، یہودی نہ ہوں۔ آج کل کے بہت سے یہود و نصاریٰ صرف نام کے یہودی، عیسائی ہیں، ورنہ واقع کے اعتبار سے وہ قطعاً ملحد ہوتے ہیں، وہ نہ کسی کتاب کے قائل ہیں، نہ کسی نبی کے، نہ دین و مذہب کے، اگر ایسی عیسائی عورت ہو جو صرف قومی طور پر ''عیسائی'' کہلاتی ہے، واقعتاً ملحد اور لادین ہو، اس کے ساتھ نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا اور ایسا جوڑا شرعی نقطۂ نظر کے لحاظ سے بدکاری و زناکاری کا مرتکب شمار ہوگا۔

ثالثاً:...... کسی مسلمان نے اہلِ کتاب کی عورت سے شادی کی ہو تو شرعی قانون کے لحاظ سے اولاد مسلمان شمار ہوگی، لیکن دیارِ غیر میں عیسائی عورتوں سے جو شادیاں رچائی جاتی ہیں ان سے پیدا ہونے والی اولاد اپنی ماں کا مذہب اختیار کرلیتی ہے بلکہ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ شادی سے پہلے یہ جوڑا طے کرلیتا ہے کہ آدھی اولاد شوہر کی ہوگی اور آدھی بیوی کے مذہب پر ہوگی، اگر ایسی شرط لگائی جائے تو ایسی شادی کرنے والا مسلمان یہ

فہرست

شرط لگاتے ہی مرتد ہوجائے گا کیونکہ اس نے اپنی اولاد کے کافر ہونے کو گوارا کرلیا اور اس پر رضامندی دے دی، اور کسی کے کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے، لہٰذا ایسی شرط لگاتے ہی یہ شخص ایمان سے خارج ہوکر مرتد ہوجائے گا اور اس کی پہلی بیوی نکاح سے خارج ہوجائے گی۔

رابعاً:...... ہمارے بھولے بھالے نوجوان امریکہ وغیرہ کی شہریت حاصل کرنے اور روٹی کمانے کا ذریعہ پیدا کرنے کی خاطر عیسائی عورتوں کے چکر میں تو پڑ جاتے ہیں لیکن ان ممالک کے قانون کے مطابق چونکہ طلاق کا حق مرد کے بجائے عورت کو حاصل ہے لہٰذا ایسی عورتیں جن کے جال میں ہمارے بھولے بھالے نوجوان پھنسے تھے ان کو طلاق دے کر گھربار پر بھی اور اولاد پر بھی قبضہ کرلیتی ہیں اور یہ شوہر صاحب "خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃ" کا مصداق دونوں جہان میں راندۂ درگاہ ہوجاتا ہے، چونکہ فقہ کا قاعدہ ہے: "المعروف کالمشروط" یعنی جس چیز کا عام رواج اور عرف ہو اس کو ایسا سمجھنا چاہئے کہ گویا عقد کے وقت اس کی شرط رکھی گئی تھی، لہٰذا ان ممالک کے عرف کے مطابق گویا یہ شخص اس شرط پر نکاح کر رہا ہے کہ عورت جب چاہے اس کو طلاق دے کر بچوں پر قبضہ کرلے۔

ان وجوہات کی بنا پر غیرممالک میں مسلمان نوجوانوں کا عیسائی عورتوں سے شادی کرنا ناجائز ہے اور دُوسری وجہ کی بنا پر نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا، اور تیسری وجہ چونکہ موجبِ کفر ہے اس لئے اس صورت میں اس کا پہلی بیوی سے نکاح فسخ ہوجائے گا، اور چوتھی وجہ میں بھی اندیشۂ کفر ہے، البتہ اگر کوئی کفریہ شرط نہیں رکھی گئی تھی اور نہ معروف تھی تو پہلی بیوی اس کے نکاح میں رہے گی، مگر یہ شخص عیسائی عورت سے نکاح کرنے کی بنا پر گناہگار ہوگا، **ھٰذا ما عندی واللہ أعلم بالصواب!**

قبر پر اذان دینا

س...... جناب میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے گاؤں میں ایک مولوی صاحب آئے ہوئے ہیں اور انہوں نے آتے ہی ہمیں ایک نئی اُلجھن میں ڈال دیا ہے، وہ یہ کہ وہ میّت کو دفنانے کے بعد تلقین کے بعد باآوازِ بلند اذان دیتے ہیں۔

ج……علامہ شامیؒ نے حاشیہ درمختار میں دو جگہ (ج:۱ ص:۳۵۸، ج:۲) اور حاشیہ بحر میں (ج:۱ ص:۲۶۹) اس کا بدعت ہونا نقل کیا ہے۔

س…… ہمارے ہاں میّت کے ہاتھ ناف پر رکھ دیتے ہیں، یہ طریقہ کس حد تک دُرست ہے یا غلط؟ ہماری رہنمائی فرمائیں، ہم بڑی اُلجھن میں ہیں۔

ج……میّت کے دونوں ہاتھ اس کے پہلوؤں میں رکھے جائیں، سینے پر یا ناف پر نہیں۔

ترکہ میں سے شادی کے اخراجات نکالنا

س…… ہمارے والد کی پہلی بیوی سے دو لڑکیاں ایک لڑکا ہے، پہلی بیوی کی وفات کے بعد دُوسری بیوی سے سات لڑکیاں ایک لڑکا ہے۔ تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کی شادی باقی ہے۔ دسمبر ۱۹۹۳ء میں والد صاحب کی وفات کے بعد والدہ صاحبہ کا کہنا ہے کہ والد نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں سے غیرشادی شدہ اولاد کی شادی ہوگی، اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔

۱:……وراثت کب تقسیم ہونی چاہئے؟

۲:……کیا وراثت میں سے غیرشادی شدہ اولاد کے اخراجات نکالے جاسکتے ہیں؟

ج……۱: تمہارے والد کے انتقال کے ساتھ ہی ہر وارث کے نام اس کا حصہ منتقل ہوگیا، تقسیم خواہ جب چاہیں کرلیں۔

ج……۲: چونکہ والدین نے باقی بہن بھائیوں کی شادیوں پر خرچ کیا ہے، اس لئے ہمارے یہاں یہی رواج ہے کہ غیرشادی شدہ بہن بھائیوں کے اخراجات نکال کر باقی تقسیم کرتے ہیں۔

دراصل باقی بہن بھائی والدہ کی خواہش پوری کرنے پر راضی ہوں تو شادی کے اخراجات نکال کر تقسیم کیا جائے، اگر راضی نہ ہوں تو پورا ترکہ تقسیم کیا جائے، لیکن شادی کا خرچہ تمام بہن بھائیوں کو اپنے حصوں کے مطابق برداشت کرنا ہوگا۔

اُردو ترجمہ پر قرآن مجید کا ثواب

س……قرآن مجید کی تلاوت کے بجائے اگر قرآن مجید کا اُردو ترجمہ ترتیب وار پڑھا جائے تو ثواب ملے گا، کیونکہ اگر اُردو ترجمہ کو عربی میں کردیا جائے تو قرآن مجید بن جاتا ہے؟

ج…… قرآن مجید عربی میں نازل ہوا ہے اور اس کے ہر لفظ کی تلاوت پر دس نیکیوں کا وعدہ ہے، ظاہر ہے کہ اس کے ترجمے پر اَجر و ثواب نہیں، اس لئے قرآنِ کریم کی تلاوت کا ثواب تو عربی الفاظ کی تلاوت پر ہی ملے گا، ترجمے کے ذریعہ مفہوم سمجھنے کا ثواب ملے گا، قرآنِ کریم کی تلاوت کا ثواب نہیں ہوگا۔

س…… بعض مولوی صاحبان سے سنا ہے کہ جو میاں بیوی اس دُنیا میں نیک اعمال کرتے ہیں تو اگلے جہان میں وہ ایک ساتھ ہوں گے۔ اب اگر مؤمن میاں بیوی میں سے میاں مرجائے اور بیوی دُوسری شادی کرلے جو کہ اس کا اسلامی حق ہے اور دُوسرا شوہر بھی نیک اور متقی ہو تو آخرت میں یہ بیوی کون سے شوہر کے نام سے پہچانی جائے گی اور کس شوہر کے ساتھ ہوگی؟ کیونکہ شوہر تو دونوں نیک اعمال والے ہیں۔

ج…… اس میں اہلِ علم کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ بیوی آخری شوہر کے پاس ہوگی، کیونکہ جب اس نے دُوسرا نکاح کرلیا تو پہلے شوہر سے اس کا تعلق ختم ہوگیا۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ عورت کو اختیار دیا جائے گا کہ دونوں میں سے کس کے ساتھ رہنا پسند کرتی ہے، جس کو پسند کرے اس کے ساتھ اس کا عقد کردیا جائے گا۔

معاش کے لئے کفر اختیار کرنا

س…… میرے ایک محترم دوست نے چند دن پہلے معاشی حل کے لئے قادیانیت کو قبول کیا، ان سے بات کرنے پر انہوں نے کہا کہ قادیانیت کا جو فارم میں نے پڑھا ہے اس کی شرائط میں کہیں بھی کفریہ کلام نہیں، مثلاً زنا نہ کرنا، بدنظری نہ کرنا، رشوت نہ لینا، جھوٹ نہ بولنا، اور مرزا غلام احمد قادیانی کو مہدی علیہ السلام ماننا۔ اور اس نے صرف ضرورت پوری ہونے تک قادیانیت قبول کی ہے اور بعد میں وہ لوٹ آئے گا۔ کیا اس کے اس فعل کے بعد اسلام رہا؟ اگر نہیں تو بیوی بچوں کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے؟ اگر گھر والوں کو چھوڑنے پر بھی تیار نہ ہو اور اس کی چند جوان اولاد بھی ہیں اور جو مال وہ دے تو اسے استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟

ج…… مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے ماننے والوں کے کافر و مرتد ہونے میں کسی قسم کا شبہ

اور تردّد نہیں، اللہ تعالیٰ کی عدالت بھی ان کو کافر و مرتد قرار دے چکی ہے، اور عالمِ اسلام کی اعلیٰ عدالتیں بھی، اس شخص کو اگر اس مسئلے میں کوئی شبہ ہے تو وہ اہلِ علم سے تبادلۂ خیال کرے۔

قادیانیت کا فارم پُر کرنا، اپنے کفر و ارتداد پر دستخط کرنا ہے۔ جہاں تک معاشی مسئلے کا تعلق ہے، معاش کی خاطر ایمان کو فروخت نہیں کیا جاسکتا، اور ان صاحب کا یہ کہنا کہ وہ بعد میں لوٹ آئے گا، قابلِ اعتبار نہیں۔ جب ایک چیز صریح کفر ہے تو اس کو اختیار کرنا ہی ناروا ہے، اور اس کو اختیار کرتے ہی آدمی دین سے خارج ہوجاتا ہے، تو اس کے واپس لوٹنے کی کیا ضمانت؟

اس شخص کو قادیانیت کی حقیقت اور ان کے کفریہ عقائد سے آگاہ کیا جائے، اگر اس کی سمجھ میں آجائے اور وہ ان سے توبہ کرلے تو ٹھیک، ورنہ اس کے بیوی بچوں کا فرض ہے کہ اس شخص سے قطع تعلق کرلیں اور یہ سمجھ لیں کہ وہ مرگیا ہے۔

چونکہ یہ شخص قادیانی فارم پُر کرچکا ہے، اس لئے اگر یہ تائب ہوجائے تو اس کو اپنے ایمان کی بھی تجدید کرنی ہوگی، اور نکاح بھی دوبارہ پڑھوانا ہوگا (جس کی تفصیل میرے رسائل ''تحفۂ قادیانیت'' اور ''خدائی فیصلہ'' وغیرہ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے)۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

س...... آپ کو زحمت دے رہا ہوں، روزنامہ ''نوائے وقت'' اتوار ۱۰/جون ۱۹۹۰ء میں ''نورِ بصیرت'' کے مستقل عنوان کے ذیل میں میاں عبدالرشید صاحب نے ''باز اور بڑھیا'' کے عنوان سے ایک اقتباس تحریر کیا (تراشہ ارسالِ خدمت ہے)، جس میں احقر کے علم کے مطابق مصنف نے حدیثِ نبویؐ کی نفی، جہاد بالسیف اور جہاد باللسان کے بارے میں اپنی آراء اور مسواک (سنتِ رسولؐ) کے بارے میں ہرزہ سرائی سے کام لیا ہے۔ آپ سے استدعا ہے کہ میاں عبدالرشید صاحب کی کوتاہ علمی اور ہرزہ سرائی کا مدلل جواب عنایت فرمائیں تاکہ احقر اسے روزنامہ ہذا میں چھپوا کر بہت سارے مسلمانوں کے شکوک، جو کہ مصنف نے تحریر ہذا کے ذریعے پیدا کئے ہیں، دُور کرسکے، اللہ تعالیٰ آپ کو اجرِ عظیم عنایت فرمائیں۔

''نورِ بصیرت'' کے عنوان سے لکھا ہوا میاں عبدالرشید کا متذکرہ بالا مضمون یہ ہے:

''باز اور بڑھیا''

''رومیؒ نے ایک حکایت لکھی ہے، کسی بڑھیا کے مکان کی چھت پر ایک باز آ کے بیٹھ گیا اور اتفاق سے بڑھیا کے ہاتھ آ گیا، بڑھیا نے اسے پیار کرتے کرتے اس کی چونچ کو دیکھا تو بولی: ہائے افسوس! چونچ اتنی بڑھ گئی ہے اور آگے سے ٹیڑھی بھی ہوگئی ہے۔ پھر اس کے پنجے دیکھے تو اسے اور افسوس ہوا کہ ناخن اتنے بڑھ گئے ہیں۔ بڑھیا نے قینچی لی، پہلے باز کی بڑھی ہوئی چونچ کاٹی، پھر اس کے پنجے ٹھیک کئے، پھر اس کے پَر کاٹ کر دُرست کئے، اس کے بعد خوشی سے بولی: اب یہ کتنا پیارا لگتا ہے!

رومیؒ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ بعض لوگ اچھی بھلی چیزوں کو نکما اور بے کار بنا دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اس کی اصلاح کر دی ہے۔ یہی کچھ ہمارے اسلام سے کیا جارہا ہے۔ ایک طرف، اس کے اندر سے جہاد اور شوقِ شہادت نکالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ دُوسری طرف، رسوم پر زور دے کر اعمال کو رُوح سے بے گانہ بنایا جارہا ہے، جس سے مسلمانوں میں تنگ نظری، تعصب اور فرقہ پرستی پھیل رہی ہے۔ تیسری طرف، مسلمانوں کو قصے کہانیوں میں اُلجھایا جارہا ہے، جس کے نتیجے میں وہ حقیقت پسندی سے دُور ہو رہے ہیں۔

ایک فوجی افسر نے مجھے بتایا کہ ان کے دفتر کے ساتھ جو مسجد ہے، وہاں نمازِ ظہر کے بعد ایک کتاب پڑھ کر سنائی جاتی ہے، ایک دن ابنِ ماجہ کے حوالے سے یہ ''حدیث'' بیان کی گئی کہ دو اشخاص تھے، ان میں سے ایک نے شہادت کی موت پائی، دُوسرا

طبعی موت مرا، کسی نے خواب میں دیکھا کہ طبعی موت مرنے والا شہید سے کئی برس پہلے جنت میں داخل ہوا۔ پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ چونکہ طبعی موت مرنے والے نے نمازیں زیادہ پڑھی تھیں، اس لئے اسے شہید پر فوقیت ملی۔ ہے ماننے والی بات؟ کیا یہ بات اسلام کی تعلیم کے سراسر منافی نہیں؟ متفقہ مسئلہ ہے کہ شہادت کی موت افضل ترین موت ہے، شہید بغیر کسی حساب کتاب کے سیدھا جنت میں جاتا ہے، کیا یہ فوجیوں کے اندر سے شہادت کا شوق ختم کرنے کی کوشش تو نہیں؟

سورۃ الصّف کی چوتھی آیت ہے (ترجمہ): ''اللہ تعالیٰ فی الواقع انہیں محبوب رکھتے ہیں جو ان کی راہ میں صف بستہ لڑیں، جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

یہ واضح طور پر لڑائی کے بارے میں ہے۔

لیکن اسی افسر نے مجھے بتایا کہ وہاں اس آیت کو چھوڑ کر آیہ:۱۱ کی تفسیر یوں بیان کی گئی ہے: ''جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد نہیں بلکہ) کوشش کرتے ہیں اپنے اموال سے اپنی جانوں سے۔'' ظاہر ہے کہ کوشش سے مراد تبلیغی دوروں پر جانا ہے۔

ایک اور فوجی افسر نے واقعہ سنایا کہ بہاول پور کی طرف ان کے تین ٹینک بڑی نہر میں گر گئے جوانوں نے تلاش کی، دو مل گئے، تیسرا نہ ملا۔ شام کو کرنل نے جو ماشاء اللہ اسی پرہیزگار جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، جوانوں کا اکٹھا کیا اور کہا: معلوم ہوتا ہے کہ آج تم نے مسواک ٹھیک طرح سے نہیں کی تھی، اس وجہ سے ٹینک نہیں ملا، کل صبح مسواک اچھی طرح سے کرکے آنا۔ دُوسرے دن جوان اچھی طرح سے مسواک کرکے نہر میں اُترے تو تیسرا ٹینک بھی مل گیا۔''

ج……میاں صاحب نے پیرِ رومیؒ کے حوالے سے ''باز اور بڑھیا'' کی جو تمثیلی حکایت نقل کی ہے وہ بھی بجا، اور اس کو نقل کرکے میاں صاحب کا یہ ارشاد بھی سرآنکھوں پر کہ:

''یہی کچھ ہمارے اسلام کے ساتھ کیا جارہا ہے۔''

چنانچہ میاں صاحب کا زیرِ نظر مضمون بھی اسی کی اچھی مثال ہے، جس میں متعدّد پہلوؤں سے ''روایتی بڑھیا'' کا کردار ادا کیا گیا ہے۔

اوّل:……ایک اُمتی کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو تعلق ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی سنتے ہی اس کا سر جھک جائے، اور اس کے لئے کسی چون و چرا کی گنجائش نہ رہ جائے، اس لئے کہ ایک اُمتی کے لئے، اگر وہ واقعتاً اپنے آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمتی سمجھتا ہے، سب سے آخری فیصلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم وارشاد کے بعد نہ کسی چون و چرا کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کے خلاف اپیل ہوسکتی ہے، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

''فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا.'' (النساء:۶۵)

ترجمہ:……''پھر قسم ہے آپؐ کے رَبّ کی! یہ لوگ ایمان دار نہ ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپؐ سے تصفیہ کروالیں، پھر آپؐ کے اس تصفیے سے اپنے دِلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورے طور پر تسلیم کرلیں۔'' (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

لیکن ارشادِ ربانی کے مطابق، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ سن کر میاں صاحب کا سر اس کے سامنے نہیں جھکتا، بلکہ وہ اس کو: ''جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت نکالنے کی کوشش اور رسوم پر زور دے کر اعمال کو رُوح سے بے گانہ بنانے کی غلطی'' سے تعبیر کرتے

ہیں، وہ اس حدیثِ نبوی اور ارشادِ مصطفوی (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) کو ''اسلام کی بڑھتی ہوئی چونچ'' سمجھ کر روایتی بڑھیا کی طرح فوراً اسے مقراضِ قلم سے کاٹ ڈالتے ہیں، اور اسلام کی قطع و برید کا یہ عمل ان کے خیال میں ''نورِ بصیرت'' کہلاتا ہے۔ حالانکہ روایتی بڑھیا کی طرح نہ انہیں یہ معلوم ہے کہ اس حدیث شریف کا مدعا کیا ہے؟ نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ وہ اس حدیث شریف کو جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کے منافی سمجھتے ہیں، اور انہیں یہ حدیث شریف اسی طرح فالتو نظر آتی ہے، جس طرح بڑھیا کو باز کی چونچ اور بڑھے ہوئے ناخن فالتو نظر آئے تھے۔

دوم:...... میاں صاحب ایک فوجی افسر کے حوالے سے ہمیں بتاتے ہیں کہ:

''ان کی مسجد میں ظہر کے بعد ایک کتاب پڑھ کر سنائی جاتی ہے، ایک دن وہاں ''ابنِ ماجہ'' کے حوالے سے یہ حدیث بیان کی گئی۔''

یہ کتاب جو ظہر کے بعد پڑھ کر سنائی جارہی تھی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجرِ مدنی نوّر اللہ مرقدہٗ کی کتاب ''فضائلِ نماز'' ہے، اور اس میں یہ ''حدیث'' صرف ابنِ ماجہ کے حوالے سے نہیں ذکر کی گئی، بلکہ اس کے حوالے کے لئے مندرجہ ذیل کتابوں کا نام درج ہے:

۱:...... مؤطا امام مالکؒ	۲:...... مسندِ احمد	۳:...... ابوداؤد
۴:...... نسائی	۵:...... ابنِ ماجہ	۶:...... صحیح ابنِ خزیمہ
۷:...... صحیح ابنِ حبان	۸:...... مستدرک حاکم	۹:...... بیہقی
۱۰:...... ترغیب وترہیب منذری		۱۱:...... درِ منثور

لیکن ان کے فوجی افسر نے بتایا کہ ابنِ ماجہ کے حوالے سے یہ ''حدیث'' بیان کی گئی اور میاں صاحب نے بغیر تحقیق اس کو اپنے کالم میں گھسیٹ دیا۔ شاید میاں صاحب نے روایتی بڑھیا کی طرح قرآنِ کریم کی درج ذیل آیت کو بھی (نعوذ باللہ) فالتو سمجھا:

''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا

أَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا ۢبِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ.“

(الحجرات:۶)

ترجمہ:......”اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کرلیا کرو، کبھی کسی قوم کو نادانی سے ضرر نہ پہنچادو، پھر اپنے کئے پر پچھتانا پڑے۔“ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

چنانچہ میاں صاحب نے بغیر تحقیق کے اس خبر پر اعتماد کرلیا اور حدیثِ نبوی کو اپنی ناروا تنقید کے نشانے پر رکھ لیا۔

سوم:...... یہ ”حدیث“ جو میاں صاحب کے فوجی افسر کے بقول ابنِ ماجہ کے حوالے سے پڑھی جارہی تھی، مندرجہ ذیل صحابہ کرامؓ سے مروی ہے:

۱:......حضرت سعد بن ابی وقاصؓ:

مؤطا امام مالک ص:۱۶۱، مسندِ احمد ج:۱ ص:۱۷۰، صحیح ابنِ خزیمہ ج:۱ ص:۱۶۰، مستدرک حاکم ج:۱ ص:۲۰۰۔

امام حاکمؒ اس کو اپنی سند کے ساتھ نقل کرکے فرماتے ہیں: صحیح الاسناد۔ امام ذہبیؒ تلخیص مستدرک میں فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے۔ امام نورالدین ہیثمیؒ اس کو مسند امام احمد اور طبرانی کے حوالے سے نقل کرکے فرماتے ہیں: مسندِ احمد کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔

۲:......حضرت عبید بن خالدؓ:

مسندِ احمد ج:۳ ص:۵۰۰، ج:۴ ص:۲۱۹، ابوداؤد ج:۱ ص:۳۴۲، نسائی ج:۱ ص:۲۸۱، سننِ کبریٰ بیہقی ج:۳ ص:۳۷۱، مصابح السنۃ ج:۳ ص:۴۴۲، مشکوٰۃ ص:۴۵۱۔ یہ حدیث بھی صحیح ہے اور اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

۳:......حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ:

مسندِ احمد ج:۱ ص:۱۶۳، ابنِ ماجہ ص:۲۸۱، سننِ کبریٰ بیہقی ج:۳ ص:۳۷۲، مسندِ ابویعلیٰ ج:۲ ص:۹، صحیح ابنِ حبان ج:۵ ص:۲۷۷، مسندِ بزار (کشف الاستار عن زوائد البزار ج:۴ ص:۲۲۷)۔

امام نورالدین ہیثمیؒ اس حدیث کو مسندِ احمد، مسندِ ابویعلیٰ اور مسندِ بزار کے حوالے سے نقل کرکے فرماتے ہیں: ان تمام کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ (مجمع الزوائد ج:۱۰ ص:۲۰۴)

۴:......حضرت ابوہریرہؓ:

مسندِ احمد ج:۲ ص:۳۳۳۔

امام ہیثمیؒ فرماتے ہیں: باسناد حسن۔ (مجمع الزوائد ج:۱۰ ص:۲۰۴) اور یہی بات شیخؒ نے امام منذریؒ سے بھی نقل کی۔

۵:......حضرت عبداللہ بن شدادؓ:

مسندِ احمد ج:۱ ص:۱۶۳، مشکوٰۃ ص:۴۵۱، مجمع الزوائد ج:۱۰ ص:۲۰۴

(حضرت شیخؒ نے بھی ان تمام احادیث کی طرف اشارہ فرمایا ہے)۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ حدیث متعدّد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے مروی ہے، ائمہ حدیث نے اس کی تخریج فرمائی ہے اور اس کے راویوں کی توثیق و تعدیل فرمائی ہے۔ لیکن ہمارے میاں صاحب کے نزدیک شاید حضراتِ محدثینؒ کی جرح و تعدیل اور تصحیح و تحسین بھی ایک فالتو چیز ہے اور وہ اسے روایتی بڑھیا کی طرح کاٹ دینا چاہتے ہیں۔

چہارم:......صحابہ کرامؓ کے دور سے آج تک اہلِ علم اس حدیث کو سنتے سناتے اور پڑھتے پڑھاتے آئے ہیں، لیکن کسی کے گوشۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ اس سے جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کی نفی ہوتی ہے، البتہ اس حدیث سے نماز کی فضیلت اور طاعت و عبادت کے ساتھ طویل عمر ملنے کی سعادت پر ضرور استدلال کیا گیا، چنانچہ صاحبِ مصابیح السنۃ اور صاحبِ مشکوٰۃ نے اس حدیث کو "باب استحباب المال والعمر للطاعة" کے تحت ذکر کیا ہے، امام نورالدین ہیثمیؒ نے اسے ایک بار "نماز کی فضیلت" کے بیان میں اور دُوسری بار "باب فیمن طال عمره من المسلمین" کے ذیل میں ذکر کیا ہے، صحیح ابنِ حبان میں یہ حدیث درج ذیل عنوان کے تحت ذکر کی گئی ہے:

"ذکر البیان بأن من طال عمره وحسن عمله قد یفوق الشهید فی سبیل الله تبارک وتعالیٰ."

ترجمہ:......''اس اَمر کا بیان کہ جس شخص کی طویل عمر ہو اور عمل اچھا ہو، وہ کبھی شہید فی سبیل اللہ سے بھی فوقیت لے جاتا ہے۔''

الغرض! جہاد فی سبیل اللہ اور شہادت فی سبیل اللہ کے بے شمار فضائل ہیں، لیکن یہ کون نہیں جانتا کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے اور نماز فرضِ عین ہے، نماز کے تارک پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، اور نماز ہی کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ دین کا ستون ہے، جس نے اس کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا، اور جس نے اس کو گرایا اس نے دین کو ڈھادیا۔ چنانچہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد دین کا سب سے بڑا اور سب سے اہم رُکن نماز ہے، نماز کے ان فضائل کو ذکر کرنے سے یہ کیسے لازم آیا کہ جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کو ختم کیا جارہا ہے؟ اور جو شخص نماز ہی نہیں پڑھتا (جیسا کہ ہمارے معاشرے کی اکثریت کا حال ہے، جن میں فوجی افسر اور جوان بھی شامل ہیں) وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں کیا جہاد کرے گا؟ اور اس کے دِل میں کیا شوقِ شہادت ہوگا؟ لیکن میاں صاحب کے خیال میں شاید جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کے مقابلے میں نماز، روزہ اور دین کے دیگر اعمال وشعائر بھی فالتو چیز ہیں۔ اس لئے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی کسی چیز کی فضیلت کو شہادت فی سبیل اللہ سے بڑھ کر فرمائیں تو میاں صاحب اس کو بھی ماننے کے لئے تیار نہیں، اب انصاف فرمایئے کہ اسلام کے ساتھی روایتی بڑھیا کا کردار کون ادا کر رہا ہے...؟

میاں صاحب سورۃ الصّف کی چوتھی آیت کا ذکر کرتے ہوئے اسے فوجی افسر کے حوالے سے ہمیں بتاتے ہیں کہ:

''وہاں اس آیت کو چھوڑ کر آیت نمبر ۱۱ کی تفسیر یوں بیان کی گئی کہ: جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد نہیں بلکہ) کوشش کرتے ہیں اپنے اموال سے، اپنی جانوں سے۔

ظاہر ہے کوشش سے مراد تبلیغی دوروں پر جانا ہے۔''

میں پہلے قرآنی آیت کا حوالہ دے چکا ہوں کہ بغیر تحقیق کے سنی سنائی بات پر اعتماد کرکے کوئی کاروائی نہیں کرنی چاہئے، اور میاں صاحب کے فوجی افسر کی روایت کا حال

بھی اُوپر معلوم ہوچکا ہے کہ حضرت شیخؒ ایک حدیث کے لئے ایک درجن کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں کہ ان ''فوجی افسر'' کا حافظہ صرف ''ابنِ ماجہ'' کے نام کا بوجھ بمشکل اُٹھاسکا، اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بات کیا کہی جارہی ہوگی اور میاں صاحب کے راوی نے اس کو کیا سے کیا سمجھا ہوگا؟

جو بات کہی جارہی ہوگی وہ یہ ہوگی کہ دین کی دعوت وتبلیغ اور مسلمانوں میں اسلامی شعائر قائم کرنے کی جو محنت بھی ہو اس پر ''فی سبیل اللہ'' کا اطلاق ہوتا ہے، خود جہاد فی سبیل اللہ بھی اسی محنت کی ایک شکل ہے، چنانچہ سب جانتے ہیں کہ جہاد سے پہلے مسلمانوں کے اَمیرِ لشکر کی طرف سے کافروں کو یہ دعوت دی جاتی ہے:

✽:......تم اسلام قبول کرلو، تمہارے حقوق بھی وہی ہوں گے جو ہمارے ہیں، اور تمہاری ذمہ داریاں بھی وہی ہوں گی جو ہماری ذمہ داریاں ہیں۔

✽:......اگر تم اسلام لانا نہیں چاہتے تو ہم نے جو اسلام کے قانون کا نظام قائم کر رکھا ہے، اس کے ماتحت رہنے کو قبول کرلو، اور اس کے لئے جزیہ ادا کرو۔

✽:......اگر جزیہ دے کر اسلامی نظام کے ماتحت رہنا بھی قبول نہیں کرتے ہو تو مقابلے کے لئے تیار ہوجاؤ، تلوار ہمارا اور تمہارا فیصلہ کرے گی۔

اسلامی جہاد کی یہ دفعات ہر طالبِ علم کو معلوم ہیں، جس سے واضح ہے کہ جہاد بھی دعوت الی اللہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ہے۔ اس کے بعد دعوت وتبلیغ کے ''فی سبیل اللہ'' ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ حضراتِ مفسرین نے ''فی سبیل اللہ'' کی تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کو ملاحظہ فرمالیا جائے جس سے معلوم ہوگا کہ علمِ دین حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا بھی ''فی سبیل اللہ'' میں داخل ہے، اور حج وعمرہ بھی ''فی سبیل اللہ'' میں شامل ہے، اب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ دین کی سربلندی اور احیائے اسلام کے لئے جو

فہرست

کوشش بھی کی جائے وہ ''فی سبیل اللہ'' میں داخل ہے، اور اس پر وہی اَجر و ثواب مرتب ہوگا جو ''فی سبیل اللہ'' کے لئے موعود ہے تو اس کی یہ بات کیا بے جا ہے؟

میں میاں صاحب سے یہ پوچھتا ہوں کہ تبلیغی سفروں پر جانا تو آپ کے خیال میں ''فی سبیل اللہ'' میں داخل نہیں، لیکن ''جہاد فی سبیل اللہ'' کی وہ تین دفعات جو میں نے ذکر کی ہیں، کیا آپ نے ان کو پورا کرلیا ہے...؟

کیا ہمارے فوجی افسران کافروں کو یہ دعوت دیتے ہیں کہ تم بھی ہمارے دین میں داخل ہوکر ہمارے بھائی بن جاؤ...؟

کیا یہ دعوت دی جاتی ہے کہ اگر اسلام قبول نہیں کرتے تو اسلامی نظام جو ہم نے قائم کر رکھا ہے، جزیہ دے کر اس کی ماتحتی قبول کرلو؟ اور کیا ہمارے ملک میں واقعتاً اسلامی نظام نافذ بھی ہے جس کی ماتحتی کی کسی کافر قوم کو دعوت دے جائے...؟ جب تک آپ اسلامی نظام نہ قائم کرلیں، اس کی دعوت کیسے دیں گے؟ اور جب تک اس کی دعوت نہ دی جائے، اسلامی جہاد کیسے ہوگا؟ اور اس پر اسلامی جہاد کے فضائل کیسے مرتب ہوں گے؟ کیا میاں صاحب اس معمے کو حل فرمائیں گے...؟

اور مسواک کے بارے میں میاں صاحب نے جو گل افشانی فرمائی ہے، اس کا جواب خود ان کی تحریر کے آخر میں موجود ہے کہ:

''دُوسرے دن جوان اچھی طرح مسواک کرکے نہر میں
اُترے تو تیسرا ٹینک بھی مل گیا۔''

اگر سنتِ نبوی (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) پر عمل کرنے سے مددِ خداوندی شاملِ حال ہوجائے تو اس پر ذرا بھی تعجب نہیں، اور جب تک مجاہدینِ اسلام سنتِ نبویؐ کے پابند نہ ہوں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد نہیں ہوسکتی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات اس کے شاہد ہیں، اور خود میاں صاحب نے جو واقعہ نقل کیا ہے وہ بھی اس کی روشن دلیل ہے، لیکن شاید میاں صاحب کے دِل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی کوئی اہمیت نہیں، اس لئے وہ اس صحیح واقعہ کو مذاق میں اُڑانا چاہتے ہیں، اور

روایتی بڑھیا کی طرح باز کے پَر کاٹ دینا چاہتے ہیں، حق تعالیٰ شانہ فہمِ سلیم عطا فرمائیں۔

خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شادیوں پر شبہات کی وضاحت

س...... ہمارے ایک دوست جو بڑے فنکار ہیں، وہ اکثر دین کی باتوں پر تبصرہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اکثر و بیشتر وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے مسئلے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: میں اس بات پر حیران ہوں کہ اتنی شدید مصروفیات جہاد اور تبلیغ دین کے باوجود ان کے پاس اتنا وقت کیسے تھا کہ وہ اتنی شادیاں کرتے اور عورتوں کے حقوق ادا کرسکتے تھے۔ ان کے تبصرہ کا میں کیا جواب دوں؟ وضاحت فرمائیں، مجھے شدید افسوس ہوتا ہے!

ج...... یورپ کے مستشرقین نے اپنے تعصب، نادانی اور جہلِ مرکب کی وجہ سے اسلام کے جن مسائل کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے ان میں ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعدّدِ ازواج کا مسئلہ بھی ہے، جس پر انہوں نے خاصی زہر چکانی کی ہے۔ ہمارا جدید طبقہ مستشرقین سے مرعوب اور احساسِ کمتری کا شکار ہے، وہ ایسے تمام مسائل میں- جن پر مستشرقین کو اعتراض ہے- ندامت و معذرت کا انداز اختیار کرتا ہے، اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ مغرب کے سامنے سرخرو ہونے کے لئے ان حقائق کا ہی انکار کردیا جائے، چنانچہ وہ عقلی شبہات کے ذریعہ ان حقائق کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آپ کے دوست کی گفتگو بھی اسی ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے، وہ بظاہر بڑے معصومانہ انداز میں یہ پوچھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتنی بیویوں کے حقوق کیسے ادا کرتے تھے؟ لیکن سوال کا منشا اصل واقعہ پر اعتراض ہے۔

بہر حال آپ کے دوست اگر چند اصولی باتیں ذہن میں رکھیں تو مجھے توقع ہے کہ ان کے خدشات زائل ہوجائیں گے۔

ا:......سب سے پہلے یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ دین کے مسائل کو خوش طبعی اور ہنسی مذاق کا موضوع بنانا نہایت ہی خطرناک مرض ہے۔ آدمی کو شدت کے ساتھ ان سے پرہیز کرنا چاہئے، خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی (جو اہل ایمان کا مرجعِ

فہرست

عقیدت ہی نہیں، مدارِ ایمان بھی ہے)، آپؐ کے بارے میں لب کشائی تو کسی مسلمان کے لئے کسی طرح بھی روا نہیں۔ قرآن کریم میں ان منافقوں کا واقعہ ذکر کیا گیا ہے جو اپنی نجی محفلوں میں رسولِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو، قرآن کریم کی آیاتِ شریفہ کو طنز و مذاق کا نشانہ بناتے تھے، جب ان سے بازپُرس کی جاتی تو کہہ دیتے: ''اجی! ہم تو بس یونہی دل لگی اور خوش طبعی کی باتیں کر رہے تھے۔'' ان کے اس ''عذرِ گناہ، بدتر از گناہ'' کے جواب میں ارشاد ہے: ''کیا تم اللہ تعالیٰ سے، اس کی آیات سے اور اس کے رسول کے ساتھ دل لگی کرتے تھے؟ بہانہ نہ بناؤ، تم نے دعویٰ ایمان کے بعد کفر کیا ہے!'' (التوبہ:۶۵،۶۶)

اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ عالی کو دل لگی اور خوش طبعی کا موضوع بنانا کتنا خطرناک ہے، جسے قرآن کریم کفر قرار دیتا ہے! اس لئے ہر مسلمان سے، جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو، میری ملتجیانہ درخواست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول و فعل کو اپنے ظریفانہ تبصروں کو موضوع بنانے سے مکمل پرہیز کریں، ایسا نہ ہو کہ غفلت میں کوئی غیرمحتاط لفظ زبان سے نکل جائے اور متاعِ ایمان برباد ہوکر رہ جائے، نعوذ باللہ من ذالک!

۲:...... ایک بنیادی غلطی یہ ہے کہ بہت سے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بلند و بالا ہستی کو اپنی سطح پر غور و فکر کرتے ہیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات اپنی ذہنی سطح سے اونچی دیکھتے ہیں تو ان کا ذہن اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مقام و مرتبہ عطا فرمایا ہے اور جن کمالات و خصوصیات سے آپ کو نوازا ہے وہ ہمارے فہم و ادراک کی حد سے ماورا ہے، وہاں تک کسی جن و ملک کی رسائی ہے، نہ کسی نبیٔ مرسل کی، جہاں جبریل امین کے پَر جلتے ہوں وہاں ما و شما کی عقلی تگ و دو کی کیا مجال ہے! آپ کے دوست بھی اسی بنیادی غلطی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اگر وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات سے ناپتے تو انہیں کوئی حیرت نہ ہوتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اتنی بیویوں کے حقوق کیسے ادا فرماتے تھے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ادا اپنے اندر اعجاز کا

فہرست

پہلو رکھتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سے قلیل عرصے میں بتوفیق خداوندی انسانی زندگیوں میں جو انقلاب برپا کیا اور امت کو روحانی و مادّی کمالات کی جس اوجِ ثریا پر پہنچادیا، کیا ساری امت مل کر بھی اس کارنامہ کو انجام دے سکتی ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کون سی بات ایسی ہے جو اپنے اندر حیرت انگیز اعجاز نہیں رکھتی، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ میں: ''آپ کا کون سا معاملہ عجیب نہیں تھا!''

۳:...... آپ کے دوست کو یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ محض عقلی احتمالات یا حیرت و تعجب کے اظہار سے کسی حقیقت، واقعہ کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً: ایک شخص سر کی آنکھوں سے سورج نکلا ہوا دیکھ رہا ہے، اس کے برعکس ایک ''حافظ جی'' محض عقلی احتمالات کے ذریعہ اس کھلی حقیقت کا انکار اور اس پر حیرت و تعجب کر رہا ہے۔ اہل عقل اس ''حافظ جی'' کی عقل و فہم کی داد نہیں دیں گے بلکہ اسے اندھا ہونے کے ساتھ ساتھ ضدی اور ہٹ دھرم بھی قرار دیں گے۔ ٹھیک اسی طرح سمجھئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ازواجِ مطہرات کے حقوق نہایت عدل و انصاف کے ساتھ ادا کرنا ایک حقیقتِ واقعیہ ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا سے تشریف لے گئے اس وقت آپؐ کے یہاں نو بیویاں تھیں، ان میں آٹھ کے یہاں باری باری شب باشی فرماتے تھے (حضرت سودہؓ نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے رکھی تھی، اس لئے ان کے یہاں شب باشی نہیں فرماتے تھے)۔ (صحیح بخاری و مسلم، مشکوٰۃ ص:۲۷۹)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہایت عدل و انصاف کے ساتھ ازواج کے حقوق ادا فرماتے تھے اور پھر یہ دعا کرتے تھے: ''یا اللہ! جو بات میرے اختیار میں ہے اس میں تو پورا عدل و انصاف سے برتاؤ کرتا ہوں، اور جو چیز آپ کے اختیار میں ہے، میرے اختیار میں نہیں (یعنی کسی بی بی کی طرف دل کا زیادہ میلان) اس میں مجھے ملامت نہ کیجئے!'' (ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، مشکوٰۃ ص:۲۷۹)۔ اس قسم کی بہت سی احادیث صحابہ کرام اور خود امہات المؤمنین رضوان اللہ علیہم

اجمعین سے مروی ہیں، گویا یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف ازواجِ مطہراتؓ کے حقوق ادا فرماتے تھے بلکہ اس میں آپؐ نے عدل وانصاف کا اعلیٰ ترین معیار قائم کرکے دکھایا، خود ارشاد فرماتے تھے:

''تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے گھر والوں کے لئے سب سے بہتر ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لئے تم سب سے بہتر ہوں!'' (ترمذی، دارمی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ ص:۲۸۱)

اب اس ثابت شدہ حقیقت پر حیرت وتعجب کا اظہار کرنا اور اس سے انکار کی کوشش کرنا اس پر وہی ''حافظ جی'' کی مثال صادق آتی ہے جو آنکھیں بند کرکے محض عقلی احتمالات کے ذریعہ طلوعِ آفتاب کی نفی کی کوشش کر رہا ہے۔

۴:...... اور اگر آپ کے دوست کو اس بات کا شبہ ہے کہ امت کے لئے چار تک شادیوں کی اجازت ہے تو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے چار سے زائد شادیاں کیسے جائز تھیں؟ تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اللہ تعالیٰ نے بہت سے خصوصی احکام دیئے تھے، جن کو اہلِ علم کی اصطلاح میں ''خصائصِ نبوی'' کہا جاتا ہے۔ حافظ سیوطیؒ نے ''الخصائص الکبریٰ'' میں، حافظ ابونعیمؒ نے ''دلائل النبوۃ'' میں اور علامہ قسطلانیؒ نے ''مواہب لدنیہ'' میں ان ''خصائص'' کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کردیا ہے۔ نکاح کے معاملے میں بھی آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد خصوصیات تھیں جن کو سورۂ احزاب کے چھٹے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے، ان میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپؐ کے لئے چار سے زائد شادیوں کی اجازت تھی۔

ایک یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنے پدری ومادری خاندان کی خواتین میں سے صرف اس سے نکاح کرنا جائز تھا جنھوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ ہجرت کی ہو، آپؐ کے خاندان کی جن عورتوں نے ہجرت نہیں کی تھی ان سے آپؐ کا نکاح جائز نہیں تھا۔ ایک خصوصیت یہ تھی کہ اگر کوئی خاتون مہر کے بغیر آپؐ کے عقد میں آنے کی پیشکش کرے اور آپؐ اس کو قبول فرمالیں تو بغیر مہر کے آپؐ کا عقد صحیح تھا، جبکہ امت کے لئے نکاح میں مہر

کا ہونا ضروری ہے، اگر زوجین نے یہ شرط کرلی ہو کہ مہر نہیں ہوگا تب بھی ''مہرِ مثل'' لازم آئے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ بیویوں کے درمیان برابری کرنا آپؐ کے ذمہ ضروری نہیں تھا (اس کے باوجود آپؐ ازواجِ مطہراتؓ کے درمیان برابری اور عدل وانصاف کی پوری رعایت فرماتے تھے، جیسا کہ اوپر عرض کرچکا ہوں)، جبکہ امت کے وہ افراد جن کے عقد میں دو یا زیادہ بیویاں ہوں ان کے ذمہ بیویوں کے درمیان برابری رکھنا فرض ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ:

''جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان کے درمیان عدل اور برابری نہ کرے وہ قیامت کے دن ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو مفلوج ہوگا۔''

(ترمذی، ابوداوٴد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، مشکوٰة ص:۲۷۹)

الغرض! نکاح کے معاملے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سے خصوصیات تھیں، اور بیک وقت چار سے زائد بیویوں کا جمع کرنا بھی آپؐ کی انہی خصوصیات میں شامل ہے، جس کی تصریح خود قرآن مجید میں موجود ہے۔

حافظ سیوطیؒ ''خصائصِ کبریٰ'' میں لکھتے ہیں کہ: شریعت میں غلام کو صرف دو شادیوں کی اجازت ہے، اور اس کے مقابلے میں آزاد آدمی کو چار شادیوں کی اجازت ہے، جب آزاد کو بمقابلہ غلام کے زیادہ شادیوں کی اجازت ہے، تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عام افرادِ اُمت سے زیادہ شادیوں کی کیوں اجازت نہ ہوتی؟

متعدد انبیاء کرام علیہم السلام ایسے ہوئے ہیں جن کی چار سے زیادہ شادیاں تھیں، چنانچہ حضرت داوٴد علیہ السلام کے بارے میں منقول ہے کہ ان کی سو بیویاں تھیں، اور صحیح بخاری (ج:۱ ص:۳۹۵) میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سو یا ننانوے بیویاں تھیں۔ بعض روایات میں کم وبیش تعداد آئی ہے۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجرؒ نے ان روایات میں تطبیق کی ہے اور وہب بن منبہ کا قول نقل کیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے یہاں

فہرست

تین سو بیویاں اور سات سو کنیزیں تھیں۔ (فتح الباری ج:۶ ص:۲۶۰)

بائبل میں اس کے برعکس ذکر کیا گیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی سات سو بیویاں اور تین سو کنیزیں تھیں (۱۔سلاطین، ۱۱۔۳) ظاہر ہے کہ یہ حضرات ان تمام بیویوں کے حقوق ادا کرتے ہوں گے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نو ازواجِ مطہراتؓ کے حقوق ادا کرنا ذرا بھی محلِ تعجب نہیں!

۵:.......آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کے بارے میں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس جنتی مردوں کی طاقت عطا کی گئی تھی، اور ہر جنتی کو سو آدمیوں کی طاقت عطا کی جائے گی۔ اس حساب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں چار ہزار مردوں کی طاقت تھی۔

(فتح الباری ج:۱ ص:۳۷۸)

جب امت کے ہر مریل سے مریل آدمی کو چار تک شادیاں کرنے کی اجازت ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جن میں چار ہزار مردوں کی طاقت ودیعت کی گئی تھی کم از کم سولہ ہزار شادیوں کی اجازت ہونی چاہئے تھی...!

۶:.......اس مسئلہ پر ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کرنا چاہئے، ایک داعی اپنی دعوت مردوں کے حلقے میں بلاتکلف پھیلا سکتا ہے، لیکن خواتین کے حلقے میں براہ راست دعوت نہیں پھیلا سکتا، حق تعالیٰ شانہ نے اس کا یہ انتظام فرمایا کہ ہر شخص کو چار بیویاں رکھنے کی اجازت ہے، جو جدید اصطلاح میں اس کی ''پرائیویٹ سیکریٹری'' کا کام دے سکیں اور خواتین کے حلقے میں اس کی دعوت کو پھیلا سکیں۔ جب ایک امتی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے یہ انتظام فرمایا ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، جو قیامت تک تمام انسانیت کے نبی اور ہادی و مرشد تھے، قیامت تک پوری انسانیت کی سعادت جن کے قدموں سے وابستہ کردی گئی تھی، اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایت و رحمت سے امت کی خواتین کی اصلاح و تربیت کے لئے خصوصی انتظام فرمایا ہو تو اس پر ذرا بھی تعجب نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ حکمت و ہدایت کا یہی تقاضا تھا۔

۷:......اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت وجلوت کی پوری زندگی کتابِ ہدایت تھی، آپؐ کی جلوت کے افعال واقوال کو نقل کرنے والے تو ہزاروں صحابہ کرامؓ موجود تھے، لیکن آپؐ کی خلوت وتنہائی کے حالات امہات المؤمنینؓ کے سوا اور کون نقل کرسکتا تھا؟ حق تعالیٰ شانہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ان خفی اور پوشیدہ گوشوں کو نقل کرنے کے لئے متعدد ازواجِ مطہراتؓ کا انتظام فرمادیا، جن کی بدولت سیرتِ طیبہ کے خفی سے خفی گوشے بھی امت کے سامنے آگئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلوت وجلوت کی پوری زندگی ایک کھلی کتاب بن گئی جس کو ہر شخص، ہر وقت ملاحظہ کرسکتا ہے۔

۸:......اگر غور کیا جائے تو کثرتِ ازواج اس لحاظ سے بھی معجزۂ نبوت ہے کہ مختلف مزاج اور مختلف قبائل کی متعدد خواتین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی سے نجی زندگی کا شب وروز مشاہدہ کرتی ہیں، اور وہ بیک زبان آپؐ کے تقدس وطہارت، آپؐ کی خشیت و تقویٰ، آپؐ کے خلوص وللّٰہیت اور آپؐ کے پیغمبرانہ اخلاق واعمال کی شہادت دیتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی میں کوئی معمولی سا جھول اور کوئی ذرا سی بھی کجی ہوتی تو اتنی کثیر تعداد ازواجِ مطہراتؓ کی موجودگی میں وہ کبھی بھی مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی کی پاکیزگی کی یہ ایسی شہادت ہے جو بجائے خود دلیلِ صداقت اور معجزۂ نبوت ہے۔ یہاں بطورِ نمونہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں جس سے نجی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس وطہارت اور پاکیزگی کا کچھ اندازہ ہوسکے گا۔ وہ فرماتی ہیں: ''میں نے کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ستر نہیں دیکھا، اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی میرا ستر دیکھا۔'' کیا دنیا میں کوئی بیوی اپنے شوہر کے بارے میں یہ شہادت دے سکتی ہے کہ مدة العمر انہوں نے ایک دوسرے کا ستر نہیں دیکھا؟ اور کیا اس اعلیٰ ترین اخلاق اور شرم وحیا کا نبی کی ذات کے سوا کوئی نمونہ مل سکتا ہے؟ غور کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نجی زندگی کے ان ''خفی محاسن'' کو ازواجِ مطہرات کے سوا کون نقل کرسکتا تھا...؟

صحیح بخاری پر عدم اعتماد کی تحریک

س……مسئلہ یہ ہے کہ صحیح بخاری کی روایات واسناد پر عدم اعتماد کی تحریک چل رہی ہے، اس تحریک کے پسِ پردہ جو لوگ ہیں اس کی تفصیل وفہرست خاصی طویل ہے، بہرحال نمونے کے طور پر صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ادارہ فکرِ اسلامی کے جنرل سیکریٹری جناب طاہر المکی صاحب، جناب عمر احمد عثمانی صاحب کی کتاب ''رجم اصل حد ہے یا تعزیر'' کے تعارفی نوٹس میں لکھتے ہیں:

''اہلِ حدیث حضرات کے علاوہ دُوسرے اسلامی فکر خصوصاً احناف کا امام بخاری کی تحقیقات کے متعلق جو نقطۂ نظر رہا ہے وہ مولانا عبدالرشید نعمانی مدرّس جامعہ بنوری ٹاؤن، علامہ زاہد الکوثری مصری اور انور شاہ کشمیری کی کتابوں سے ظاہر ہے۔

مولانا عبدالرشید نعمانی کی تحقیقات سے صرف ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''کیا دو تہائی بخاری غلط ہے''

ترجمہ:……علامہ مقبلی اپنی کتاب الأرواح النوافخ میں لکھتے ہیں:

ایک نہایت دین دار اور باصلاحیت شخص نے مجھ سے عراقی کی ''الفیہ'' (جو اُصولِ حدیث میں ہے) پڑھی اور ہمارے درمیان صحیحین کے مقام ومرتبہ خصوصاً بخاری کی روایات کے متعلق بھی گفتگو ہوئی……تو ان صاحب نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپؐ سے دریافت کیا کہ اس کتاب یعنی خصوصاً بخاری کی کتاب کے متعلق حقیقتِ اَمر کیا ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو تہائی غلط ہے۔

خواب دیکھنے والا کا گمان غالب ہے کہ یہ ارشادِ نبوی بخاری کے راویوں کے متعلق ہے، یعنی ان میں دو تہائی راوی غیر عادل ہیں کیونکہ بیداری میں ہمارا موضوعِ بحث بخاری کے راوی ہی تھے، واللہ اعلم۔''

(دیکھئے: مقبلی کی کتاب الارواح النوافح ص:۶۸۹، ۶۹۰)

اس اچھوتی اور نادرِ روزگار دلیل پر طاہر المکی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ ہے بخاری کے فنی طور پر سب سے زیادہ صحیح ہونے کی حقیقت، اس کو ایڈٹ کرنے میں مولانا عبدالرشید نعمانی کے ساتھ جامعہ بنوری ٹاؤن کے مفتی ولی حسن بھی شریک رہے ہیں جیسا کہ اپنی حواشی کے آخر میں نعمانی صاحب نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا ہے، عبدالرشید صاحب فرماتے ہیں:

جب بخاری کے دو تہائی راوی غیر عادل ہیں تو ان کی روایات کی کیا حیثیت جو یقیناً بخاری کی دو تہائی روایات سے زیادہ بنتی ہیں، کیونکہ بہت سے راوی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ کئی کئی روایتیں بیان کرتے ہیں۔'' (بحوالہ رجم اصل حد ہے یا تعزیر ص:۳۹)

محترمی! اب آپ مجھے بتائیں کہ کیا مذکورہ حوالے سے جو کچھ بیان کیا گیا ہے، آیا وہ صحیح ہے یا غلط؟ اگر آپ کے نزدیک صحیح ہے تو کیا میں صحیح بخاری کے نسخے ضائع کردُوں؟ اور کیا مدارس کی انتظامیہ کو بذریعہ اخبار ترغیب دُوں کہ وہ اپنے مدارس کے نصاب سے صحیح بخاری کو خارج کردیں؟ مجھے اُمید ہے کہ میری اس اُلجھن کو دُور فرماکر عنداللہ ماجور ہوں گے۔

ج…… درج بالا خط ملنے پر اس ناکارہ نے حضرت نعمانی مدظلہ العالی کی خدمت میں عریضہ لکھا، جو درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''حضرت مخدوم و معظم! مدت فیوضہم و برکاتہم، السلام علیکم

فہرست

ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ایک صاحب نے طاہر المکی کے حوالے سے آنجناب کی ایک عبارت نقل کرکے تیز وتند سوال کیا ہے۔ یہ اس شخص کا چوتھا خط ہے، میں نے مناسب سمجھا کہ ''توجیه القول بما لا یرضٰی به قائله'' کے بجائے آنجناب ہی سے اس سلسلے میں مشورہ کرلیا جائے۔ مختصر سا اشارہ فرمادیا جائے کہ طاہر مکی کی نقل کہاں تک صحیح ہے؟ اور ان صاحب کے اخذ کردہ نتیجے سے کہاں تک اتفاق کیا جاسکتا ہے؟ چونکہ مجھے ہفتہ کے دن سفر پر جانا ہے اس لئے میں اس خط کا جواب کل ہی نمٹا کر جانا چاہتا ہوں۔ دعواتِ صالحہ کی اِلتجا ہے۔

والسلام

خویدکم **محمد یوسف** عفا اللہ عنہ۔''

حضرتِ موصوف مدظلہ العالی نے درج ذیل جواب تحریر فرمایا:

''محترمی! وفقنی الله وایاکم لما یحب ویرضٰی!

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

اس وقت درس گاہ میں ''الأرواح النوافخ'' موجود نہیں، ''دراسات اللبیب'' معین سندھیؒ کی تعلیقات میں عرصہ ہوا جب تلقی صحیحین کی بحث میں آپس کے اختلاف میں لکھا تھا کہ تلقی کا مسئلہ اختلافی ہے، اختلافی احادیث میں اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں، اس پر بحث کرتے ہوئے کہیں اس خواب کا بھی ذکر آگیا تھا۔ ''الارواح'' کے مصنف علامہ مقبلی پہلے زیدی تھے پھر مطالعہ کرکے سنی ہوگئے تھے اور عام یمنیوں کی طرح جیسے امیر یمانی، وزیر یمانی، قاضی شوکانی وغیرہ ہیں غیر مقلد ہوگئے تھے، انہوں نے تلقی رواۃ کے سلسلے میں اس خواب کا ذکر کیا تھا، خواب کی جو حیثیت ہے ظاہر ہے،

رواۃ کی تعدیل و تجریح میں اختلاف شروع سے چلا آتا ہے، جیسے مذاہبِ اربعہ میں اختلاف ہے، اس سے نہ کسی چیز کا بطلان لازم آتا ہے، نہ کسی مختلف چیز پر اجماع۔ یہ ہے اصل حقیقت تلقی امت کی بحث کی کہ نہ متون کی ساری امت کو تلقی ہے نہ رواۃ پر، جیسے تمام اختلافی مسائل کا حال ہے۔

قرآنِ کریم کا ثبوت قطعی ہے، لیکن اس کی تعبیر و تفسیر میں اختلاف ہے، پھر کیا اس اختلاف کی بنا پر قرآنِ کریم کو ترک کردیا جائے گا؟ یہی حال متونِ صحیحین ورُواۃِ صحیحین کا ہے کہ نہ ان کا متن اُمت کے لئے واجب العمل ہے اور نہ ہر راوی بالاجماع قابلِ قبول ہے۔ اب منکرینِ حدیث اس سلسلے میں جو چاہیں رَوِش اختیار کریں۔ قرآنِ کریم کی تعبیر و تفسیر میں اختلاف تھا، اور رہے گا۔ روایات کے قبول، عدمِ قبول میں مجتہدین کا اختلاف تھا، اور رہے گا، **فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر**۔

والسلام

محمد عبدالرشید نعمانی

۲۵/۲/۱۴۱۵ھ۔"

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرّم و محترم! زید لطفہٗ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے گرامی نامے کے جواب پر چند اُمور مختصراً لکھتا ہوں، فرصت نہیں، ورنہ اس پر پورا مقالہ لکھتا۔

۱:......آپ کی اس تحریک کی بنیاد طاہر المکی صاحب کی اس تحریر پر ہے جس کا حوالہ آپ نے خط میں نقل کیا ہے، اور آپ نے اس تحریر پر اس قدر اعتماد کیا کہ اس کی بنیاد پر مجھ سے دریافت فرماتے ہیں کہ:

''مذکورہ حوالے سے جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟ اگر آپ کے (یعنی راقم الحروف کے) نزدیک بھی صحیح ہے تو کیا میں صحیح بخاری کے نسخے ضائع کردُوں؟ اور کیا مدارس کی انتظامیہ کو بذریعہ اخبار ترغیب دُوں کہ وہ اپنے مدارس کے نصاب سے صحیح بخاری کو خارج کردیں؟''

طاہرالمکی صاحب کی تحریر پر اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے آپ کو یہ سوچنا چاہئے کہ ان صاحب کا تعلق کہیں منکرینِ حدیث کے طائفے سے تو نہیں؟ اور یہ کہ کیا یہ صاحب اس نتیجے کے اخذ کرنے میں تلبیس و تدلیس سے تو کام نہیں لے رہے؟

طاہرالمکی کا تعلق جس طبقے سے ہے، تلبیس و تدلیس اس طبقے کا شعار ہے، اور سنا گیا ہے کہ طاہرالمکی کے نام میں بھی تلبیس ہے، اس کے والد میانجی عبدالرحیم مرحوم ''مکی مسجد کراچی'' میں مکتب کے بچوں کو پڑھاتے تھے، وہیں ان کی رہائش گاہ تھی، اسی دوران یہ صاحب پیدا ہوئے اور ''مکی مسجد'' کی طرف نسبت سے علامہ طاہرالمکی بن گئے، سننے والے سمجھتے ہوں گے کہ حضرت ''مکہ'' سے تشریف لائے ہیں۔

۲:...... مولانا عبدالرشید نعمانی مدظلہ العالی کے حوالے سے اس نے قطعاً غلط اور گمراہ کن نتیجہ اخذ کیا ہے، جیسا کہ مولانا مدظلہ العالی کے خط سے ظاہر ہے، اوّل تو مقبلی زیدی اور پھر غیرمقلد تھا، پھر اس کا حوالہ خواب کا ہے، اور سب جانتے ہیں کہ خواب دینی مسائل میں حجت نہیں۔ پھر مولانا نے یہ حوالہ یہ ظاہر کرنے کے لئے نقل کیا ہے کہ رُواۃِ بخاری کے بارے میں بعض لوگوں کی یہ رائے ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانی مدظلہ العالی ایک دینی مدرسہ کے شیخ الحدیث ہیں، اگر ان کی وہ رائے ہوتی جو آپ نے طاہرالمکی کی تلبیسانہ عبارت سے سمجھی ہے تو وہ آپ کی تحریک ''عدمِ اعتماد'' کے علم بردار ہوتے، نہ کہ صحیح بخاری پڑھانے والے شیخ الحدیث۔

۳:...... طاہرالمکی نے امام العصر حضرت مولانا محمد انورشاہ کشمیریؒ کو بلاوجہ گھسیٹا ہے، حضرتؒ نے بیس برس سے زیادہ صحیح بخاری کا درس دیا، اور تدریسِ بخاری شروع کرنے

فہرست

سے پہلے ۱۳ مرتبہ صحیح بخاری شریف کا بغور و تدبر مطالعہ فرمایا اور اس کی تمام شروح کا بغور و تدبر مطالعہ فرمایا، صحیح بخاری کی دو بڑی شرحیں ''فتح الباری'' اور ''عمدۃ القاری'' تو حضرتؒ کو ایسے حفظ تھیں جیسے گویا سامنے کھلی رکھی ہوں۔ (مقدمہ فیض الباری ص:۳۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نہ صرف یہ کہ صحیح بخاری کو ''أصح الکتب بعد کتاب اللہ'' سمجھتے ہیں بلکہ صحیحین کی احادیث کی قطعیت کے قائل ہیں، چنانچہ ''فیض الباری'' میں فرماتے ہیں:

''صحیح کی احادیث قطعیت کا فائدہ دیتی ہیں یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے، جمہور کا قول ہے کہ قطعیت کا فائدہ نہیں دیتیں، لیکن حافظ رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے کہ قطعیت کا فائدہ دیتی ہیں۔ شمس الائمہ سرخسیؒ حنفیہ میں سے، حنابلہ میں سے حافظ ابنِ تیمیہؒ اور شیخ ابنِ صلاحؒ بھی اسی طرف مائل ہیں۔ ان حضرات کی تعداد اگرچہ کم ہے مگر ان کی رائے ہی صحیح رائے ہے، شاعر کا یہ قول ضرب المثل ہے:
میری بیوی مجھے عار دِلاتی ہے ہماری تعداد کم ہے، میں نے اس سے کہا کہ کریم لوگ کم ہی ہوا کرتے ہیں۔''

(فیض الباری ص:۴۵)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں لکھتے ہیں:

''محدثین کا اتفاق ہے کہ صحیحین میں جتنی حدیثیں متصل مرفوع ہیں، صحیح ہیں، اور یہ دونوں اپنے مصنّفین تک متواتر ہیں، اور جو شخص ان دونوں کی توہین کرتا ہے وہ متبدع ہے اور مسلمانوں کے راستے سے منحرف ہے۔''

۴:...... کسی حدیث کا صحیح ہونا اور چیز ہے، اور اس کا واجب العمل ہونا دُوسری چیز ہے، اس لئے کسی حدیث کے صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ واجب العمل بھی ہو، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ منسوخ ہو، یا مقید ہو، یا مؤوّل ہو، اس کے لئے ایک عامی کا علم کافی

نہیں، بلکہ اس کے لئے ہم ائمہ اجتہاد رحمہم اللہ کی اتباع کے محتاج ہیں۔ قرآنِ کریم کا قطعی ہونا تو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، لیکن قرآنِ کریم کی بعض آیات بھی منسوخ و مؤوّل یا مقید بالشرائط ہیں، صرف انہی اجمالی اشارات پر اکتفا کرتا ہوں، تفصیل و تشریح کی گنجائش نہیں، واللہ اعلم!

حقانی صاحب کی حج تجاویز

س...... بتاریخ ۱۶/جون ۱۹۹۳ء کالم نویس جناب ارشاد احمد حقانی صاحب نے حالیہ نگران حکومت کے زیرِ انتظام حجِ بیت اللہ سے واپسی پر ''حج کے انتظامات، بعض توجہ طلب پہلو'' کے عنوان سے جن خیالات کا اظہار اخبار ''جنگ'' کراچی میں کیا ہے، اس کو پڑھ کر سخت تکلیف ہوئی اور طرح طرح کے خیالات کے اظہار سے ایسا محسوس ہوا کہ وہ منیٰ کی ساری غلاظت کو اپنے ساتھ کراچی لے آئے ہیں۔ جس شہر میں ہر راستے پر، ہر زمانے میں اور خصوصاً سخت گرمی کے زمانے میں جو گٹر بہہ رہا ہے اور حتیٰ کہ ہمارے مکان کے دروازے پر پڑوس کے گٹر کا سیاہ سیلاب سارے راستے پر پھیلا ہوا ہے اس کی طرف کسی کی نظر نہیں، جہاں مستقلاً لوگ رہائش پذیر ہیں اور سارے شہر میں گٹر کے ناپاک پانی نے طہارت اور صفائی کو مستقل عذاب اور خطرہ میں ڈال دیا ہے، اس کی اصلاح کے لئے زورِ قلم اور حکومت اور عمال کی توجہ مبذول نہ کراکر مفت کی مہمانی کا حق اس ذہنیت سے ادا کر رہے ہیں جو پاکستان کی بدنامی کا باعث ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ فقہی مسائل میں بھی اپنی قابلیت کا جس طرح اظہار کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت کی معلومات کی داد دینے والا سارے عالمِ اسلام میں کوئی نہیں۔

میں، آپ جیسے مُسلَّم بزرگ اور مفتیٔ وقت سے اس سلسلے میں رُجوع کرنا ایک اسلامی فریضہ سمجھ کر یہ خط لکھ رہا ہوں کہ برائے کرم جناب ارشاد احمد حقانی صاحب کے اظہارِ خیال کی روشنی میں جو انہوں نے ''طوافِ زیارت'' کے سلسلے میں تحریر فرمایا ہے، اس کی اسلامی اور فقہی حیثیت کیا ہے؟ جیسا کہ ارشاد احمد حقانی نے اپنے کالم میں لکھا ہے کہ:

”بعض فقہاء کے نزدیک اس بات کی اجازت موجود ہے کہ ”طوافِ زیارت“ عرفات جانے سے پہلے بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ میرے بہت سے قارئین کے لئے یہ بات باعثِ حیرت ہوگی، لیکن یہ اجازت موجود ہے۔ مگر اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے اور اس پر عمل بھی شاذ ہی کیا جاتا ہے۔“ (کیا یہی صحیح ہے؟)

”اگر کمزور اور ضعیف حجاج اور خواتین کو اس کی اطلاع دی جائے اور انہیں طوافِ زیارت عرفات جانے سے پہلے ادا کرنے کی ترغیب دی جائے تو دو چار لاکھ حاجی تو ایسا کر سکتے ہیں، جس سے بعد از عرفات کے دنوں میں رش کم کیا جاسکتا ہے۔“

”ویسے میں اس بات کا بھی حامی اور قائل ہوں کہ عرفات سے واپسی پر کئے جانے والے طوافِ زیارت کے وقت میں بھی توسیع کا جائزہ لیا جانا چاہئے اور جید علماء اس مسئلے پر غور کریں۔“

”حرم شریف کی غیر معمولی توسیع کے باوجود بیس پچّیس لاکھ افراد کا تین روز میں طوافِ زیارت مکمل کرنا شدید اژدہام پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا، جس سے ضعیف مردوں اور عورتوں کا تو کجا مضبوط اور جوان حاجیوں کا عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔“

”طوافِ زیارت کو آسان کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔“

اس کے بعد حقانی صاحب نے منیٰ اور عرفات کے سلسلے میں عام حجاج کی سہولت کے حوالے سے جس طرح جو کچھ لکھا ہے اس سے ہم جیسے مسلمان دین دار حاجیوں کو قطعی اتفاق نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے علم و قلم مسلمان کو اس لئے عطا نہیں کیا کہ وہ اپنے کو ساری مخلوق سے بالاتر اور اپنی محدود عقل کو سب سے افضل و برتر سمجھے اور ان خیالات کا ہر موقع پر اظہارِ خیال

کرے۔ سعودی حکومت تو ٹھنڈے پانی کا تھیلا مفت میں حجاجِ کرام کے لئے منیٰ اور عرفات میں مسلسل تقسیم کیا کرتی ہے، اور روز بروز ہر طرح کی سہولت فراہم کر رہی ہے، اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

منیٰ میں میرا بھی قیام تھا، مگر میں نے وہ تعفن اور گندگی نہیں دیکھی جو حقانی صاحب کو نظر آئی، اگر کسی کا قیام بدقسمتی سے کوڑا کرکٹ اور گٹر کے پاس ہو تو پھر بھی اس کا اظہار عوامی انداز سے ہونا چاہئے، یہ اخبار والوں کو بھی لازم ہے کہ ایسے جذباتی برانگیختی کے مضامین کو اخبار میں جگہ نہ دیں، جو اخبار کے رویہ کو متنازع بنادے اور نفرت و فساد کو جنم دے۔ بہرکیف! اس مسئلے پر علماء اور حجاجِ کرام کو اپنے مُسلَّمہ واضح خیالات کا اظہار کرنا لازم ہے۔

ج...... جناب حقانی صاحب کا کالم میں نے آپ کا خط موصول ہونے کے بعد اخبار منگوا کر پڑھا، موصوف نے اپنے مضمون (۱۶ر جون ۱۹۹۳ء) کی قسط میں چند مسائلِ شرعیہ پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے ان میں اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا مسئلہ

جناب حقانی صاحب رقم طراز ہیں:

> ''سعودی وزارتِ اطلاعات کے حکام نے عقلمندی کی،
> ہمیں مزدلفہ سے رات کے گیارہ بجے ہی بسوں پر سوار کرادیا اور
> سیدھے جمرۃ العقبیٰ پر لے گئے، اس وقت وہاں کوئی ہجوم نہیں تھا اور
> ہم سب نے سات سات کنکریاں ماریں۔''

موصوف کی اس تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ رات ڈھلنے سے پہلے ہی گیارہ بجے مزدلفہ سے چل کھڑے ہوئے اور آدھی رات سے پہلے پہلے وہ جمرۃ العقبہ کی رَمی سے بھی فارغ ہوچکے تھے۔ اگر میں نے ان کی اس عبارت کا مفہوم صحیح سمجھا ہے تو سعودی حکام کی عقلمندی نے ان سے مناسکِ حج کی ادائیگی میں دو سنگین غلطیاں کرادیں۔ ایک یہ کہ مزدلفہ پر وقوف کرنا حج کے واجبات میں سے ہے، اس کے فوت ہوجانے پر دَم لازم آتا ہے اور

اسے قصداً چھوڑ دینا حرام ہے۔

وقوفِ مزدلفہ کا وقت حنفیہ کے نزدیک یوم النحر (ذوالحجہ کی دسویں تاریخ) کی صبحِ صادق سے شروع ہوتا ہے، شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک نصف شب کے بعد ہے، البتہ مالکیہ کے نزدیک رات کے کسی حصے پر وہاں ٹھہرنا واجب ہے، چونکہ حقانی صاحب اور ان کے رفقاء رات کے گیارہ بجے ہی مزدلفہ سے چل پڑے، اس لئے حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے قول کے مطابق ان کا وقوفِ مزدلفہ فوت ہوگیا، جس کی وجہ سے ان پر دَم بھی واجب ہوا اور گناہ بھی لازم آیا۔

دُوسری غلطی یہ کہ یوم النحر کو جمرۃ العقبہ کی رَمی کا وقت شافعیہ وحنابلہ کے نزدیک آدھی رات کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور حنفیہ ومالکیہ کے نزدیک صبحِ صادق کے بعد سے۔ اب اگر حقانی صاحب صبحِ صادق سے پہلے جمرۃ العقبہ کی رَمی سے فارغ ہوچکے تھے تب تو حنفیہ ومالکیہ کے نزدیک ترکِ واجب کی وجہ سے ان پر دَم لازم آیا اور اگر نصف شب سے پہلے ہی رَمی کرلی تھی تو تمام ائمہ کے نزدیک ان پر دَم لازم ہوا۔

دُوسرا مسئلہ

حقانی صاحب سفارش کرتے ہیں:

> ''اس ضمن میں کمزور حجاج بالخصوص خواتین کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے کہ وہ اپنا وکیل مقرّر کرکے رَمیٔ جمرات کا فرض ادا کریں۔''

اس ضمن میں یہ وضاحت کافی ہے کہ شریعت نے رَمیٔ جمرات کا وقت بہت وسیع رکھا ہے، مثلاً: پہلے دن یوم النحر کو صرف جمرۃ العقبہ کی رَمی کرنی ہے، مگر اس کا وقت پورے آٹھ پہر (چوبیس گھنٹے) تک پھیلا ہوا ہے، کیونکہ یہ وقت یوم النحر کی صبحِ صادق سے شروع ہوکر گیارہویں تاریخ کی صبحِ صادق تک ہے۔ اور رات کے وقت خصوصاً بارہ بجے کے بعد جمرات پر کوئی ہجوم نہیں ہوتا، اس لئے کمزور مرد اور خواتین رات کو اطمینان سے رَمی کرسکتے ہیں۔ اور رَمیٔ جمرات کے لئے کسی کو وکیل بنانا صرف اس صورت میں صحیح ہے کہ کوئی دن میں

یا رات میں خود چل کر جمرات تک پہنچنے اور رَمی کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو۔ اس لئے حقانی صاحب کی یہ سفارش کہ معذور اور غیرمعذور مرد اور خواتین کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے کہ بغیر عذرِ شرعی کے وہ کسی کو اپنا وکیل مقرّر کردیں، قطعاً لائقِ التفات نہیں۔

حقانی صاحب کا اپنے اجتہاد پر عمل

حقانی صاحب خود معذور نہیں تھے، لیکن انہوں نے پہلے دن کی رَمی تو وقت سے پہلے کرلی اور باقی دنوں کی رَمی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''بقیہ دو دنوں کے لئے میں نے تو اپنے نوجوان ساتھیوں کو وکیل مقرّر کیا اور انہی کے ذریعہ اپنے حصے کے پتھر مروائے۔''

حالانکہ منیٰ کے دنوں میں حاجی کو رَمیٔ جمرات کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔

اب اس کو تساہل پسندی کے سوا کیا کہا جائے کہ بغیر کسی عذرِ شرعی کے موصوف نے رَمی کے لئے نوجوان ساتھیوں کو وکیل مقرّر کردیا اور انہی کے ذریعہ رَمی کروالی۔ ظاہر ہے کہ شرعاً ان کا وکیل مقرّر کرنا دُرست نہ تھا، اور وہ ترکِ واجب کے مرتکب ہوئے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انہیں اس ترکِ واجب پر افسوس بھی نہیں بلکہ وہ اس ضمن میں فقہائے اُمت کی ''اصلاح'' کے درپے ہیں، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

''فقہاء نے رَمیٔ جمرات کے حوالے سے بعض ایسے اَحکام اور شرائط مقرّر کر رکھی ہیں غالباً جن میں قدرے اجتہاد کی گنجائش ہے۔''

حضراتِ فقہائے اُمت نے رَمیٔ جمرات کے بارے میں جو اَحکام و شرائط مقرّر کی ہیں وہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ سے مستنبط ہیں، تمام فقہائے اُمت کے اجماعی فیصلوں کو نظرانداز کرکے نئی راہ اختیار کرنے کا نام ''اجتہاد'' نہیں بلکہ خواہشِ نفس کی پیروی ہے۔

تیسرا مسئلہ

تیسرا مسئلہ جس میں موصوف نے ''اجتہاد'' کی ضرورت پر زور دیا ہے وہ ہے

وقوفِ عرفات سے پہلے طوافِ زیارت سے فارغ ہوجانا، موصوف لکھتے ہیں کہ:

"بعض فقہاء کے نزدیک اس بات کی اجازت موجود ہے کہ طوافِ زیارت، عرفات جانے سے پہلے بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ میرے بہت سے قارئین کے لئے یہ بات باعثِ حیرت ہوگی، لیکن یہ اجازت موجود ہے، مگراس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے اوراس پر عمل بھی شاذ ہی کیا جاتا ہے۔ اگر کمزور اور ضعیف حجاج اور خواتین کو اس کی اطلاع دی جائے اور انہیں طوافِ زیارت، عرفات جانے سے پہلے ادا کرنے کی ترغیب دی جائے تو دو چار لاکھ حاجی تو ایسا کرسکتے ہیں، جس سے بعداز عرفات کے دنوں میں رش کم کیا جاسکتا ہے۔"

جناب حقانی صاحب نے جو تحریر فرمایا ہے کہ بعض فقہاء کے نزدیک وقوفِ عرفات سے پہلے طوافِ زیارت کرنے کی اجازت موجود ہے۔ یہ اس ناکارہ کے لئے بالکل جدید انکشاف ہے، قریباً نصف صدی تک فقہی کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے بال سفید ہوگئے، لیکن افسوس ہے کہ مجھے ایسے کسی فقیہ کا سراغ نہیں مل سکا جو وقوفِ عرفات سے پہلے طوافِ زیارت سے فارغ ہوجانے کا فتویٰ دیتا ہو۔ اگر موصوف ان "بعض فقہاء" کا نام نشان بتادیں تو اہلِ علم ان کے ممنون ہوں گے اور اس پر غور کرسکیں گے کہ ان "بعض فقہاء" کے فتویٰ کی قدر و قیمت کیا ہے...؟

جہاں تک اس ناکارہ کے ناقص مطالعے کا تعلق ہے، مذاہبِ اربعہ اس پر متفق ہیں کہ وقوفِ عرفات سے قبل طوافِ زیارت نہیں ہوسکتا، کیونکہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک طوافِ زیارت کا وقت یوم النحر کی صبحِ صادق سے شروع ہوتا ہے، اور امام شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک یوم النحر کی نصف شب کے بعد سے اس کا وقت شروع ہوجاتا ہے، گویا یوم النحر کی نصف شب سے پہلے طوافِ زیارت کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔ اور جس مسئلے میں مذاہبِ اربعہ متفق ہوں ان کے خلاف فتویٰ دینا "اجتہاد" نہیں بلکہ "اِلحاد" ہے۔

القرآن ریسرچ سینٹر تنظیم کا شرعی حکم

س.....مولانا صاحب! آج کل ایک نیا فتنہ قرآن سینٹر کے نام سے بہت زوروں پر ہے، اس کا بانی محمد شیخ انگلش میں بیان کرتا ہے اور ضروریاتِ دین کا انکار کرتا ہے۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' میں آپ کی کوئی مفصل تحریر شائع ہوگی، مگر آپ کے مسائل میں ایک خاتون کے سوال نامہ کے جواب میں آپ کا مختصر سا جواب پڑھا، اگرچہ وہ تحریر کسی حد تک شافی تھی مگر اس سلسلہ کی تفصیلی تحریر کی اب بھی ضرورت ہے۔ اگر آپ نے ایسی کوئی تحریر لکھی ہو یا کہیں شائع ہوئی ہو تو اس کی نشاندہی فرمادیں، یا پھر از راہ کرم امتِ مسلمہ کی اس سلسلے میں راہ نمائی فرماویں۔

ج.....آپ کی بات درست ہے، ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' میں میرا نہایت مختصر سا جواب شائع ہوا تھا، اور احباب کا اصرار تھا کہ اس سلسلے میں کوئی مفصل تحریر آنی چاہئے، چنانچہ میری ایک مفصل تحریر ماہنامہ ''بینات'' کراچی کے ''بصائر وعبر'' میں شائع ہوئی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے افادۂ عام کے لئے قارئین کی خدمت میں پیش کردیا جائے، جو حسبِ ذیل ہے۔

''مسلمانانِ ہندوستان کی دلی خواہش اور چاہت تھی کہ ایک ایسی آزاد ریاست اور ملک میسر آجائے جہاں مسلمان آزادی سے قرآن وسنت کا آئین نافذ کرسکیں اور انہیں دین اور دینی شعائر کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، چونکہ مسلمانوں کا جذبہ نیک تھا، اس لئے اس میں جوان، بوڑھے، عوام وخواص اور عالم وجاہل سب برابر کے متحرک وفعال تھے۔ بالآخر لاکھوں جانوں اور عزتوں کی قربانی کے بعد ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو ایک مسلم ریاست کی حیثیت سے پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ قیامِ پاکستان کا مقصد اسلامی نظامِ حکومت یعنی حکومتِ الٰہیہ کا قیام باور کرایا گیا تھا، جس کا عنوان تھا: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!'' اور یہ ایسا نعرہ تھا جس کے زیرِ اثر تمام مسلمان مر مٹنے کے لئے تیار تھے، حتیٰ کہ وہ مسلمان جن کے علاقے تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی حدود میں آتے تھے وہ بھی اس کے

قیام میں پیش پیش تھے، لیکن: اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! ”مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!“ کے مصداق، آج نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود بھی پاکستانی مسلمانوں کو اسلامی نظامِ حکومت نصیب نہیں ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون!

اُلٹا پاکستان روز بروز مسائلستان بنتا چلا گیا، اس میں مذہبی، سیاسی، روحانی غرض ہرطرح کے فتنے پیدا ہوتے چلے گئے، ایک طرف اگر انگلینڈ میں مرتد رشدی کا فتنہ رونما ہوا، تو دوسری طرف پاکستان میں یوسف کذاب نام کا ایک بدباطن دعویٔ نبوت لے کر میدان میں آ گیا، اسی طرح بلوچستان میں ایک ذکری مذہب ایجاد ہوا جس نے وہاں کعبہ اور حج جاری کیا، یہاں رافضیت اور خارجیت نے بھی پَر پُرزے نکالے، یہاں شرک و بدعات والے بھی ہیں اور طبلہ و سارنگی والے بھی، اس ملک میں ایک گوہر شاہی نام کا ملعون بھی ہے جن کے مریدوں کو چاند میں اس کی تصویر نظر آتی ہے، اور خود اس کو اپنے پیشاب میں اپنے مصلح کی شبیہ دکھائی دیتی ہے، اس میں ایک بدبخت عاصمہ جہانگیر بھی ہے جو تحفظِ حقوق انسانیت کی آڑ میں کتنی لڑکیوں کی چادرِ عفت کو تار تار کر چکی ہے۔

اسی طرح اس ملک میں ”جماعت المسلمین“ نامی ایک جماعت بھی ہے جو پوری امت کی تجہیل و تحمیق کرتی ہے، یہاں ڈاکٹر مسعود کی اولاد بھی ہے جو اپنے علاوہ کسی کو مسلمان ماننے کے لئے تیار نہیں، یہاں غلام احمد پرویز کی ذرّیت بھی ہے جو امت کو ذخیرۂ احادیث سے بدظن کر کے اپنے پیچھے لگانا چاہتی ہے، اور ان سب سے آگے اور بہت آگے ایک نیا فتنہ اور نئی جماعت ہے جس کے تانے بانے اگرچہ غلام احمد پرویز سے ملتے ہیں، مگر وہ کئی اعتبار سے غلام احمد پرویز کو پیچھے چھوڑ گئی ہے، غلام احمد پرویز نے امت کو احادیث سے برگشتہ کرنے کی ناکام کوشش کی تھی، ہاں! البتہ اس نے چند آیاتِ قرآنی پر بھی اپنی تاویلاتِ باطلہ کا تیشہ چلایا تھا، مگر اس نئی جماعت اور نئے فتنے کے سربراہ محمد شیخ نامی شخص نے تقریباً پورے اسلامی عقائد کی عمارت کو منہدم کرنے کا تہیہ کرلیا ہے، چنانچہ وہ توراة، زبور، انجیل اور دوسرے صحفِ آسمانی کے وجود اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسرے انبیاء پر فضیلت و برتری اور انبیاء کرام کے مادّی وجود کا منکر ہے، بلکہ وہ بھی اصل میں تو مرزا غلام احمد قادیانی کی

طرح مدعیٔ نبوت ہے، مگر وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی ناکام حکمتِ عملی کو دہرانا نہیں چاہتا، کیونکہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح براہِ راست نبوت اور عقیدۂ اجراء وحی کا دعویٰ کرکے قرآن وسنت اور علمائے امت کے شکنجے میں نہیں آنا چاہتا، یہ تو وہ بھی جانتا ہے کہ وحیٔ نبوت بند ہوچکی ہے، اور جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنے لئے اجراء وحیٔ نبوت کا دعویٰ کرے وہ دجال وکذاب اور واجب القتل ہے۔ اس لئے محمد شیخ نامی اس شخص نے اس کا عنوان بدل کر یہ کہا کہ: ''جو شخص جس وقت قرآن پڑھتا ہے اس پر اس وقت قرآن کا وہ حصہ نازل ہورہا ہوتا ہے، اور جہاں قرآن مجید میں ''قل'' کہا گیا ہے، وہ اس انسان ہی کے لئے کہا جارہا ہے۔'' یوں وہ ہر شخص کو نزولِ وحی کا مصداق بتاکر اپنے لئے نزولِ وحی اور اجراء نبوت کے معاملہ کو لوگوں کی نظروں میں ہلکا کرنے کی کوشش کرتا ہے، چنانچہ وہ اس کو یوں بھی تعبیر کرتا ہے:

> ''انبیاء، اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے ہیں اور لوگوں کی اصلاح کرتے ہیں اور میں بھی یہی کام انجام دے رہا ہوں۔''

نعوذ باللہ! منصبِ نبوت کو اس قدر خفیف اور ہلکا کرکے پیش کرنا اور یہ جرأت کرنا کہ میں بھی وہی کام کررہا ہوں جو -نعوذ باللہ- انبیاء کرام کیا کرتے ہیں، کیا یہ دعویٔ نبوت اور منصبِ نبوت پر فائز ہونے کی ناپاک کوشش نہیں...؟

لوگوں کی نفسیات بھی عجیب ہے، اگر وہ ماننے پر آئیں تو ایک ایسا شخص جو کسی اعتبار سے قابلِ اعتماد نہیں، جس کی شکل وشباہت مسلمانوں جیسی نہیں، جس کا رہن سہن کسی طرح اسلاف سے میل نہیں کھاتا، ابلیسِ مغرب کی نقالی اس کا شعار ہے، اسوۂ نبوی سے اسے ذرّہ بھر مناسبت نہیں، اس کی چال ڈھال، رفتار وگفتار اور لباس وپوشاک سے کوئی اندازہ نہیں لگاسکتا کہ یہ شخص مسلمان بھی ہے کہ نہیں؟ پھر طرہ یہ کہ وہ نصوصِ صریحہ کا منکر ہے، اور تأویلاتِ فاسدہ کے ذریعہ اسلام کو کفر، اور کفر کو اسلام باور کرانے میں مرزا غلام احمد قادیانی کے کان کاٹتا ہے، فلسفۂ اجراءِ نبوت کا نہ صرف وہ قائل ہے بلکہ اس کا داعی اور منادی ہے۔

وہ تمام آسمانی کتابوں کا یکسر منکر ہے، وہ انبیاء کے مادّی وجود کا قائل نہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی وجود کی بھول بھلیوں کے گورکھ دھندوں سے آپؐ کی نبوت و رسالت اور مادّی وجود کا انکاری ہے، انبیائے بنی اسرائیل میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ترجیح دیتا ہے۔

ذخیرۂ احادیث کو من گھڑت کہانیاں کہہ کر نا قابلِ اعتماد گردانتا ہے، غرضیکہ عقائدِ اسلام کے ایک ایک جز کا انکار کر کے ایک نیا دین و مذہب پیش کرتا ہے، اور لوگ ہیں کہ اس کی عقیدت و اطاعت کا دَم بھرتے پھرتے ہیں، اور اس کو اپنا پیشوا اور راہ نما مانتے ہیں۔

اس کے برعکس دوسری جانب اللہ کا قرآن ہے، نصوصِ صریحہ اور احادیثِ نبویہؐ کا ذخیرہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت و کردار کی شاہراہ ہے، اور اجماعِ امت ہے، جو پکار پکار کر انسانوں کی ہدایت و راہ نمائی کے خطوط متعین کرتے ہیں، مگر ان ازلی محروموں کے لئے یہ سب کچھ نا قابلِ اعتماد ہے۔

کس قدر لائقِ شرم ہے کہ یہ حرماں نصیب، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وفرماں برداری کی بجائے اپنے گلے میں اس ملحد و بے دین کی غلامی کا پٹہ سجانے اور اس کی امت کہلانے میں ''فخر'' محسوس کرتے ہیں۔ حیف ہے اس عقل و دانش اور دین و مذہب پر! جس کی بنیاد الحاد و زندقہ پر ہو، جس میں قرآن و سنت کی بجائے ایک جاہل مطلق کے کفریہ نظریات و عقائد کو درجہ استناد حاصل ہو، سچ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں تو عقل و خرد چھین لیتے ہیں، جھوٹ سچ کی تمیز ختم ہوجاتی ہے اور ہدایت کی توفیق سلب ہوجاتی ہے۔

گزشتہ ایک عرصہ سے اس قسم کی شکایات سننے میں آرہی تھیں کہ سیدھے سادے مسلمان اس فتنے کا شکار ہو رہے ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں کچھ لکھنے کا خیال ہوا تو ایک صاحب راقم الحروف اور دارالعلوم کراچی کے فتاویٰ کی کاپی لائے اور فرمائش کی کہ اس فتنہ کے خلاف آواز اُٹھائی جائے، اس لئے کہ حکومت اور انتظامیہ اس فتنہ کی روک تھام کے لئے نہایت بے حس اور غیر سنجیدہ ہے، جبکہ یہ فتنے روز بروز بڑھ رہا ہے، کس قدر لائقِ افسوس ہے کہ اگر کوئی شخص بانئ پاکستان یا موجودہ وزیراعظم کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوجائے تو

فہرست

حکومت کی پوری مشینری حرکت میں آجاتی ہے، لیکن یہاں قرآن وسنت، دینِ متین اور حضراتِ انبیاء اور ان کی نبوت کا انکار کیا جاتا ہے، ان کی شان میں نازیبا کلمات کہے جاتے ہیں، مگر حکومت ٹس سے مس نہیں ہوتی، اور انتظامیہ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان ہر دو تحریروں کو یکجا شائع کردیا جائے، تاکہ مسلمانوں کا دین وایمان محفوظ ہوجائے، اور لوگ اس فتنہ کی سنگینی سے واقف ہوکر اس سے بچ سکیں۔

راقم الحروف کا مختصر جواب اگرچہ روزنامہ جنگ کے کالم ''آپ کے مسائل اور ان کا حل'' میں شائع ہوچکا ہے، مگر دارالعلوم کراچی کا فتویٰ شائع نہیں ہوا، چنانچہ سب سے پہلے ایک ایسی خاتون کا مرتب کردہ سوال نامہ ہے جو براہ راست اس فتنے سے متأثر رہی ہے، اس کے بعد راقم الحروف کا جواب ہے، اور آخر میں دارالعلوم کراچی کا جواب ہے، اور سب سے آخر میں اختتامیہ کلمات ہیں، چونکہ دارالعلوم کراچی کے فتویٰ میں قرآنی آیات اور دوسری نصوص کے ترجمے نہیں تھے اس لئے افادۂ عام کی خاطر قرآنی آیات اور عربی عبارتوں کے ترجمے کردیئے گئے ہیں، قرآنی آیات کا ترجمہ حضرت تھانویؒ کے ترجمہ سے نقل کیا گیا ہے۔

سوال نامہ

س…… محترم مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

احوال حال کچھ اس طرح ہے کہ بحیثیت مسلمان میں اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہوئے دین کو ضرب پہنچانے اور اس کے عقائد کی عمارت کو مسمار کرنے کی جو کوششیں کی جارہی ہیں، اس کے متعلق غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی حتی الوسع کوشش کرنا چاہتی ہوں۔

محترم! یہاں پر چند تنظیموں کی جانب سے نام نہاد پمفلٹ آڈیو/ ویڈیو کیسٹس کے ذریعے ایسا لٹریچر فراہم کیا جارہا ہے جس سے بڑا طبقہ شکوک وشبہات اور بے یقینی کی کیفیت کا شکار ہورہا ہے۔ پاکستان، جسے اسلامی فلسفہ وفکر کے ذریعے حاصل کیا گیا، اس کے شہر کراچی میں ایک تنظیم ''القرآن ریسرچ سینٹر'' کے نام سے عرصہ چھ سات سال سے قائم ہے، اس تنظیم کے بنیادی عقائد مندرجہ ذیل ہیں:

۱:......دنیا کے وجود میں آنے سے پہلے انسانیت کی بھلائی کے لئے قرآن پاک معجزانہ طور پر اکٹھا دنیا میں موجود تھا، مختلف انبیاء پر، مختلف ادوار میں، مختلف کتابیں نازل نہیں ہوئیں، بلکہ اس کتاب یعنی قرآن پاک کو مختلف زمانوں میں مختلف ناموں سے پکارا گیا، کبھی توریت، کبھی انجیل اور کبھی زبور کے نام سے۔

قرآن جو جہاں اور جس وقت پڑھ رہا ہے اس پر اسی وقت نازل ہو رہا ہے، اور جہاں "قل" کہا گیا ہے وہ اس انسان کے لئے کہا جا رہا ہے جو پڑھ رہا ہے۔

۲:......انبیاء کا کوئی مادّی وجود نہیں رہا، اس دنیا میں وہ نہیں بھیجے گئے، بلکہ وہ صرف انسانی ہدایت کے لئے Symbols کے طور پر استعمال کئے گئے اور موجودہ دنیا سے ان کا کوئی مادّی تعلق نہیں۔ قرآن شریف کے اندر وہ انسانی رہنمائی کے لئے صرف فرضی کرداروں اور کہانیوں کی صورت میں موجود ہیں۔

۳:......قرآن شریف میں چونکہ حضورؐ کو زمانِ حال یعنی Present میں پکارا گیا ہے، لہٰذا حضور بحیثیتِ روح ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہیں، اور وہ مادّی وجود سے مبرا ہیں اور نہ تھے۔

۴:......حضور کی دیگر انبیاء پر کوئی فضیلت نہیں، وہ دیگر انبیاء کے برابر ہیں، بلکہ حضرت موسیٰ بعض معنوں اور حیثیتوں میں یعنی قرآن پاک نے بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ کا کثرت سے ذکر کیا، جس کی وجہ سے ان کی فضیلت حضور پر زیادہ ہے، حضور کے متعلق جتنی بھی احادیث تاریخ اور تفسیر میں موجود ہیں وہ انسانوں کی من گھڑت کہانیاں ہیں۔

ان تمام عقائد کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپ قرآن وسنت کے مطابق یہ فتویٰ دیں کہ:

۱:...... یہ عقائد اسلام کی رُو سے دُرست ہیں یا نہیں؟

۲:......اس کو اپنانے والا مسلمان رہے گا؟

۳:......ایسی تنظیموں کو کس طرح روکا جائے؟

۴:......ایسے شخص کی بیوی کے لئے کیا حکم ہے، جس کے عقائد قرآن وسنت کے مطابق ہیں، جو تمام انبیاء، تمام کتابوں، آخرت کے دن اور احادیث پر مکمل یقین اور ایمان رکھتی ہو؟

۵:......آخر میں مسلمانیت کے ناطے اپیل ہے کہ ایسے اشخاص سے بھرپور مناظرہ کیا جائے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم سے کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا، کیونکہ ہم سچے مسلمان ہیں۔ ایک خاتون۔کراچی

راقم الحروف کا جواب

ج......السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، میری بہن! یہ فتنوں کا زمانہ ہے اور جس شخص کے ذہن میں جو بات آجاتی ہے، وہ اس کو بیان کرنا شروع کردیتا ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سلف بیزاری اور انکارِ حدیث کا نتیجہ ہے، اور جو لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں وہ پورے دین کا انکار کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں میں اپنے رسالہ ''انکارِ حدیث کیوں؟'' میں لکھ چکا ہوں کہ:

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشادات کے ساتھ بے اعتنائی برتنے والوں اور آپ کے اقوالِ شریفہ کے ساتھ تمسخر کرنے والوں کے متعلق اعلان کیا گیا کہ ان کے قلوب پر خدائی مہر لگ چکی ہے، جس کی وجہ سے وہ ایمان و یقین اور رُشد و ہدایت کی استعداد گم کرچکے ہیں، اور ان لوگوں کی ساری تگ و دو خواہشِ نفس کی پیروی تک محدود ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

''وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ، حَتّٰىٓ اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ.'' (محمد:۱۶)

ترجمہ:......''اور بعض آدمی ایسے ہیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کان لگاتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اُٹھ کر باہر جاتے ہیں تو دوسرے اہل علم سے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی تحقیر کے طور پر) کہتے ہیں کہ: حضرت نے ابھی کیا بات فرمائی تھی؟ یہ وہ لوگ ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کردی ہے اور وہ اپنی نفسانی

خواہشوں پر چلتے ہیں۔“ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

قرآن کریم نے صاف صاف یہ اعلان بھی کردیا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کو صرف اسی مقصد کے لئے بھیجا جاتا ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے، پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انکار اور آپؐ کے ارشادات سے سرتابی کرنا گویا انکارِ رسالت کے ہم معنی ہے۔ اس طرح آپؐ کی اطاعت کے منکرین، انکارِ رسالت کے مرتکب ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو جب قرآن ہی وحیِ خداوندی بتلاتا ہے (وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی. اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی)، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلماتِ طیبات کو جب قرآن ہی ”گفتہ او گفتہ اللہ بود“ کا مرتبہ دیتا ہے، تو بتلایا جائے کہ حدیثِ نبوی کے حجتِ دینیہ ہونے میں کیا کسی شک وشبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے...؟ اور کیا حدیثِ نبوی کا انکار کرنے سے، خود قرآن ہی کا انکار لازم نہیں آئے گا؟ اور کیا فیصلۂ نبوت میں تبدیلی کے معنی خود قرآن کو بدل ڈالنا نہیں ہوں گے؟ اور اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ قرآن کریم بھی تو امت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زبانِ مبارک سے سنا، اور سن کر اس پر ایمان لائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ: ”یہ قرآن ہے۔“ یہ ارشاد بھی تو حدیثِ نبوی ہے۔ اگر حدیثِ نبوی حجت نہیں تو قرآن کریم کا ”قرآن“ ہونا کس طرح ثابت ہوگا؟ آخر یہ کون سی عقل و دانش کی بات ہے کہ اس مقدس و معصوم زبان سے صادر ہونے والی ایک بات تو واجب التسلیم ہو اور دوسری نہ ہو...؟

امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

فہرست

''یہ تو میرے میاں (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کمال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور یہ میرا کلام ہے۔'' ورنہ ہم نے تو دونوں کو ایک ہی زبان سے صادر ہوتے ہوئے سنا تھا۔''

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ: ''قرآن تو حجت ہے، مگر حدیث حجت نہیں ہے۔'' ان ظالموں کو کون بتلائے کہ جس طرح ایمان کے معاملے میں خدا اور رسول کے درمیان تفریق نہیں ہوسکتی کہ ایک کو مانا جائے اور دوسرے کو نہ مانا جائے۔ ٹھیک اسی طرح کلام اللہ اور کلامِ رسول کے درمیان بھی اس تفریق کی گنجائش نہیں کہ ایک کو واجب الاطاعت مانا جائے اور دوسرے کو نہ مانا جائے، ایک کو تسلیم کرلیجئے تو دوسرے کو بہرصورت تسلیم کرنا ہوگا۔ اور ان میں سے ایک کا انکار کردینے سے دوسرے کا انکار آپ سے آپ ہوجائے گا۔ خدائی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اس کے کلام کو تسلیم کرنے کا دعویٰ کیا جائے اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کو ٹھکرادیا جائے، وہ ایسے ظالموں کے خلاف صاف اعلان کرتا ہے:

''......فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ.'' (الانعام:۳۳)

ترجمہ:...... ''پس اے نبیؐ! یہ لوگ آپؐ کے کلام کو نہیں ٹھکراتے، بلکہ یہ ظالم، اللہ کی آیتوں کے منکر ہیں۔''

لہٰذا جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے اور کلام اللہ کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں، انہیں لامحالہ رسول اور کلامِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی ایمان لانا ہوگا، ورنہ ان کا دعوائے ایمان حرفِ باطل ہے۔''

جس تنظیم کا آپ نے تذکرہ کیا ہے ان عقائد کے رکھنے والے مسلمان نہیں ہیں،

کیونکہ انہوں نے دین کی پوری کی پوری عمارت کو مسمار کردینے کا عزم کرلیا ہے، نیز انہوں نے تمام شعائرِ اسلام اور قرآن وحدیث اور انبیاء اور ان پر نازل ہونے والی کتابوں کا انکار کیا ہے، اور جو لوگ اسلامی معتقدات کا انکار کریں، ان میں تاویلاتِ باطلہ کریں، اور اپنے کفر کو اسلام باور کرائیں، وہ ملحد وزندیق ہیں، اور زندیق، کافر ومرتد سے بڑھ کر ہے، اس لئے کہ وہ بکرے کے نام پر خنزیر کا گوشت فروخت کرتا ہے، اور امتِ مسلمہ کو دھوکا دے کر ان کے ایمان واسلام کو غارت کرتا ہے، اسی بنا پر اگر زندیق گرفتار ہونے کے بعد توبہ بھی کرلے تو اس کی توبہ کا اعتبار نہیں، اس لئے حکومتِ پاکستان کا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کو اس الحاد وزندقہ سے روکے، اگر رُک جائیں تو فبہا ورنہ ان پر اسلامی آئین کے مطابق ارتداد وزندقہ کی سزا جاری کرے۔

اہل ایمان کا ان سے رشتہ ناطہ بھی جائز نہیں، اگر ان میں سے کسی کے نکاح میں کوئی مسلمان عورت ہو تو اس کا نکاح بھی فسخ ہوجاتا ہے۔

جہاں تک مناظرے کا تعلق ہے، ان حضرات سے مناظرہ بھی کرکے دیکھا، مگر ان کے دل میں جو بات بیٹھ گئی ہے اس کو قبر کی مٹی اور جہنم کی آگ ہی دور کرسکتی ہے، واللہ اعلم!

دارالعلوم کراچی کا جواب

الجواب حامدًا ومصلیًا

۱،۲:...... سوال میں ذکر کردہ اکثر عقائد قرآن وسنت اور اجماعِ امت کی تصریحات اور موقف کے بالکل خلاف ہیں، اس لئے اگر کسی شخص کے واقعتاً یہی عقائد ہیں تو وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے، اور اس کے ماننے والے بھی کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔

مذکورہ نظریات وعقائد کا قرآن وسنت کی رو سے باطل ہونا ذیل میں ترتیب وار تفصیل سے ملاحظہ فرمائیں:

۱:...... یہ (کہنا کہ قرآن پاک کو مختلف زمانوں میں مختلف ناموں سے پکارا گیا، کبھی تورات، کبھی انجیل اور کبھی زبور، اور مختلف ادوار میں مختلف کتابیں نازل نہیں ہوئی)

کفریہ عقیدہ ہے، کیونکہ پوری امت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ صحفِ آسمانی کے علاوہ آسمانی کتابیں چار ہیں، اور قرآن کریم میں اس کی تصریح ہے کہ قرآن کے علاوہ تین آسمانی کتابیں اور ہیں، جن میں سے توراۃ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور زَبور حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل کی گئی، لہٰذا قرآن کے علاوہ مذکورہ تین کتب کے مستقل وجود کا انکار کرنا درحقیقت قرآنِ کریم کی ان آیات کا انکار کرنا ہے جن میں ان کتابوں کے مستقل وجود کا ذکر ہے، درج ذیل آیات اور ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

"وَاَنْزَلَ التَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِیْلَ. مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ." (آل عمران:۳،۴)

ترجمہ:...... "اور (اسی طرح) بھیجا تھا تورات اور انجیل کو اس کے قبل لوگوں کی ہدایت کے واسطے۔" (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

"وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰةُ وَالْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ." (آل عمران:۶۵)

ترجمہ:...... "حالانکہ نہیں نازل کی گئی تورات اور انجیل مگر ان کے (زمانہ کے بہت) بعد۔" (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

"وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ." (المائدۃ:۴۶)

ترجمہ:...... "اور ہم نے ان کو انجیل دی جس میں ہدایت تھی اور وضوح تھا۔"

"وَلْیَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِیْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْهِ." (المائدۃ:۴۷)

ترجمہ:...... "اور انجیل والوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں نازل فرمایا ہے اس کے موافق حکم کیا کریں۔"

"وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰةَ وَالْاِنْجِیْلَ." (المائدۃ:۱۱۰)

ترجمہ:...... "اور جبکہ میں نے تم کو کتابیں اور سمجھ کی باتیں

اور تورات اور انجیل تعلیم کیں۔''

''اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ۔'' (الاعراف:۱۵۷)

ترجمہ:......''جو لوگ ایسے رسول نبی اُمّی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔''

''وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ۔'' (الانبیاء:۱۰۵)

ترجمہ:......''اور ہم (سب آسمانی) کتابوں میں لوحِ محفوظ (میں لکھنے) کے بعد لکھ چکے ہیں کہ اس زمین (جنت) کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔''

''وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیّٖنَ عَلٰی بَعْضٍ وَّاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔'' (الاسراء:۵۵)

ترجمہ:......''اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے، اور ہم داوٴد (علیہ السلام) کو زبور دے چکے ہیں۔''

''فَأْتُوْا بِالتَّوْرٰةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔''

(آل عمران:۹۳)

ترجمہ:......''پھر توراة لاوٴ، پھر اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔''

''وَکَیْفَ یُحَکِّمُوْنَکَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰةُ فِیْهَا حُکْمُ اللهِ۔'' (المائدة:۴۳)

ترجمہ:......''اور وہ آپؐ سے کیسے فیصلہ کراتے ہیں حالانکہ ان کے پاس تورات ہے، جس میں اللہ کا حکم ہے۔''

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

''اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰةَ فِیْهَا هُدًی وَّنُوْرٌ۔'' (المائدة:۴۴)

ترجمہ:......''ہم نے تورات نازل فرمائی تھی جس میں ہدایت تھی اور وضوح تھا۔''

''وَقَفَّيْنَا عَلٰى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰةِ.'' (المائدۃ:۴۶)

ترجمہ:......''اور ہم نے ان کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو اس حالت میں بھیجا کہ وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی تورات کی تصدیق فرماتے تھے۔'' (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

''اِنِّىْ رَسُوْلُ اللهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰةِ.'' (الصّف:۶)

ترجمہ:......''میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو تورات (آچکی) ہے، میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں۔'' (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

''وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا ۢ بَعِيْدًا.'' (النساء:۱۳۶)

ترجمہ:......''اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا انکار کرے، اور اس کے فرشتوں کا، اور اس کی کتابوں کا، اور اس کے رسولوں کا، اور روزِ قیامت کا، تو وہ شخص گمراہی میں بڑی دور جا پڑا۔'' (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

''كُلٌّ اٰمَنَ بِاللهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ.'' (البقرۃ:۲۸۵)

ترجمہ:......''سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ، اور اس کے فرشتوں کے ساتھ، اور اس کی کتابوں کے ساتھ، اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ۔''

اور یہ کہنا کہ: ''قرآن جو جس وقت پڑھ رہا ہے، اس پر اسی وقت نازل ہو رہا ہے، اور ''قل'' اسی کے لئے کہا جا رہا ہے جو پڑھ رہا ہے۔'' یہ بھی تعبیر کے لحاظ سے غلط ہے،

فہرست

کیونکہ قرآن کریم ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا نازل ہو چکا ہے، اس کے اولین اور آخرین براہ راست مخاطب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اب جو شخص پڑھ رہا ہے وہ قرآن کا اولین اور براہِ راست مخاطب نہیں ہے، بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے مخاطب ہے اور اس اعتبار سے اپنے آپ کو مخاطب سمجھنا بھی چاہئے۔

۲:...... یہ عقیدہ بھی کفریہ ہے (کہ انبیاء کا مستقل کوئی وجود نہیں تھا)، کیونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ انبیاء کا مستقل وجود تھا، وہ دنیا میں لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے اور وہ بشریت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، انہوں نے عام انسانوں کی طرح دنیا میں زندگی گزاری، ان میں بشری حوائج اور مادّی صفات پائی جاتی تھیں، چنانچہ وہ کھاتے بھی تھے، پیتے بھی تھے اور انہوں نے نکاح بھی کئے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ سے معجزات بھی ظاہر فرمائے، انہوں نے اللہ کے راستے میں جہاد بھی کیا، یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو اپنے وجود کے لئے مادّہ اور مستقل وجود کا تقاضا کرتی ہیں، اس کے بغیر ان کا وجود اور ظہور ہی محال ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ: ''انبیاء کا مادّی وجود نہیں رہا، قرآن میں وہ صرف فرضی کرداروں اور کہانیوں کی صورت میں موجود ہیں'' بالکل غلط اور قرآن و سنت کی صریح نصوص کے خلاف ہے، اس سلسلے میں درج ذیل آیاتِ قرآنیہ ملاحظہ فرمائیں:

''كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ.'' (البقرۃ:۲۱۳)

ترجمہ:...... ''سب آدمی ایک ہی طریق کے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو بھیجا جو کہ خوشی (کے وعدے) سناتے تھے اور ڈراتے تھے اور ان کے ساتھ (آسمانی) کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں، اس غرض سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں ان کے امورِ اختلافیہ (مذہبی) میں فیصلہ فرمادیں۔''

”وَمَا نُرسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ.“

(الانعام:۴۸)

ترجمہ:......”اور ہم پیغمبروں کو صرف اس واسطے بھیجا کرتے ہیں کہ وہ بشارت دیں اور ڈراویں۔“

”یٰـمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَأْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا.“

(الانعام:۱۳۰)

ترجمہ:......”اے جماعت جنات اور انسانوں کی! کیا تمہارے پاس تم ہی میں کے پیغمبر نہیں آئے تھے؟ جو تم سے میرے احکام بیان کرتے تھے اور تم کو آج کے دن کی خبر دیا کرتے تھے۔“

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

”وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِکَ وَجَعَلْنَا لَھُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّیَّةً.“ (الرعد:۳۸)

ترجمہ:......”اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیئے۔“

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

”وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ.“ (النحل:۳۶)

ترجمہ:......”اور ہم ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجتے رہے ہیں کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچتے رہو۔“

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

”وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا.“ (الاسراء:۱۵)

ترجمہ:......”اور ہم (کبھی) سزا نہیں دیتے جب تک کسی

فہرست

رسول کو نہیں بھیج دیتے۔‘‘

”وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّآ اِنَّھُمْ لَیَأْکُلُوْنَ الطَّعَامَ وَیَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ.“ (الفرقان:۲۰)

ترجمہ:......”اور ہم نے آپؐ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے۔“

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

”وَکَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِیٍّ فِی الْاَوَّلِیْنَ. وَمَا یَأْتِیْھِمْ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ.“ (الزخرف:۶،۷)

ترجمہ:......”اور ہم پہلے لوگوں میں بہت سے نبی بھیجتے رہے ہیں، اور ان لوگوں کے پاس کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ انہوں نے استہزاء نہ کیا ہو۔“

”کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ.“ (البقرۃ:۱۵۱)

ترجمہ:......”جس طرح تم لوگوں میں ہم نے ایک (عظیم الشان) رسول کو بھیجا تم ہی میں سے ہماری آیات (واحکام) پڑھ پڑھ کر تم کو سناتے ہیں اور (جہالت سے) تمہاری صفائی کرتے رہتے ہیں اور تم کو کتاب (الٰہی) اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور تم کو ایسی (مفید) باتیں تعلیم کرتے رہتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی۔“ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

”وَقَالُوْا مَالِ ھٰذَا الرَّسُوْلِ یَأْکُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ.“ (الفرقان:۷)

ترجمہ:......”اور یہ (کافر) لوگ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ (ہماری طرح) کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔“

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

”لَقَدْ مَنَّ اللهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ.“ (آل عمران:۱۶۴)

ترجمہ:......”حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں انہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں، اور ان کو کتاب اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں۔“

”هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ.“ (الفتح:۲۸)

ترجمہ:......”وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت دی، اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر دنیا میں بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے۔“ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

”رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ.“

(الطّلاق:۱۰)

ترجمہ:......”ایک ایسا رسول (بھیجا) جو تم کو اللہ کے صاف صاف احکام پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں، تاکہ ایسے لوگوں کو کہ جو ایمان لاویں اور اچھے عمل کریں (کفر و جہل کی) تاریکیوں سے نور کی طرف لے آویں۔“

"لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ." (التوبۃ:۱۲۸)

ترجمہ:...... "(اے لوگو) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں، جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے، جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں، (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے بالخصوص) ایمان داروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں۔"

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ." (الحجرات:۲)

ترجمہ:...... "اے ایمان والو! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے بلند مت کیا کرو، اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے آپس میں ایک دوسرے سے کھل کر بولا کرتے ہو۔"

قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو زمانۂ حال میں جو خطاب کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت قرآن کریم کا نزول آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو رہا تھا اس وقت آپؐ اپنے مادّی وجود کے ساتھ دنیا میں موجود تھے، اس لئے زمانۂ حال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کیا گیا، یہ مطلب نہیں کہ آپؐ بحیثیت روح ہر وقت، ہر جگہ موجود ہیں۔

یہ عقیدہ (رکھنا کہ چونکہ قرآن شریف میں صیغہ حال سے پکارا گیا ہے، اس لئے حضورؐ بحیثیتِ روح ہر جگہ موجود ہیں، اور وہ مادّی وجود سے مبرا ہیں) قرآن وسنت کی صریح نصوص اور اہل السنۃ والجماعۃ کے موقف کے خلاف ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر کسی شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ہر وقت، ہر جگہ موجود ہیں، اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہر وقت، ہر جگہ موجود ہیں، تو یہ کھلا ہوا شرک ہے، اور نصاریٰ کی طرح رسول کو خدائی کا درجہ دینا ہے، اور اگر کوئی شخص کسی تأویل کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتا ہے تب بھی اس عقیدہ کے غلط اور فاسد ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور ایسا شخص گمراہ ہے۔ ملاحظہ ہو: جواہر الفقہ ج:۱

ص:۱۱۵، تبرید النواظر مصنفہ مولانا سرفراز صفدر صاحب مدظلہم۔

۴:......اہل السنۃ والجماعۃ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیتِ مجموعی تمام انبیاء سے افضل ہیں، البتہ بعض جزئیات اور واقعات میں اگر کسی نبی کو کوئی فضیلت حاصل ہے تو وہ اس کے معارض نہیں۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شرفِ کلام حاصل ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صفت "خلت" حاصل ہے، وغیرہ وغیرہ، یہ تمام جزئی فضیلتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجموعی فضیلت کے منافی اور اس کے معارض نہیں ہیں۔

اور یہ کہنا کہ: "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جتنی بھی احادیث، تاریخ اور تفسیر میں موجود ہیں وہ انسانوں کی من گھڑت کہانیاں ہیں۔" درحقیقت احادیثِ نبویہ کا انکار ہے، جو کہ موجبِ کفر ہے، پوری امتِ محمدیہ کا اس پر اجماع ہے کہ حدیث، قرآن کریم کے بعد دین کا دوسرا اہم مأخذ ہے، قرآن کریم نے جس طرح اللہ رب العزت کے احکام کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے، اسی طرح جنابِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کی بھی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے، لہٰذا قرآن میں بہت سے ایسے احکام ہیں جن کی تفصیل قرآن میں مذکور نہیں، بلکہ ان کی تفصیلات اللہ رب العزت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور عمل پر چھوڑ دی ہیں، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں ان کی تفصیلات اور ان پر عمل کرنے کا طریقہ اپنے قول و فعل سے بیان کیا، اگر احادیث انسانوں کی من گھڑت ہیں تو قرآن کریم کے ایسے احکام پر عمل کرنے کا طریقہ کیا ہوگا؟ اور یہ ہمیں کیسے معلوم ہوں گے؟

اور اللہ رب العزت نے جس طرح قرآن کریم کے الفاظ کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، اسی طرح قرآن کریم کے معانی کی بھی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، اور معانی قرآن کی تعلیم حدیث ہی میں ہوئی، اور جن ذرائع سے قرآن کریم ہم تک پہنچا ہے، انہی ذرائع سے احادیث بھی ہم تک پہنچی ہیں، اگر یہ احادیث من گھڑت ہیں اور ذرائع قابلِ اعتماد نہیں، تو یہ امکان قرآن کریم میں بھی ہوسکتا ہے، تو پھر قرآن کریم کو بھی -نعوذ باللہ- من گھڑت کہنا لازم آتا ہے، لہٰذا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح قرآن کریم اب تک محفوظ

چلا آرہا ہے، اسی طرح احادیث بھی محفوظ چلی آرہی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کا بے نظیر انتظام فرمایا ہے، جس کی تفصیل تدوینِ حدیث کی تاریخ سے معلوم ہوسکتی ہے، لہٰذا احادیث کو انسانوں کی من گھڑت کہانیاں قرار دینا صریح گمراہی اور موجبِ کفر ہے۔

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: ''حجیتِ حدیث'' مصنفہ مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم، ''کتابتِ حدیث عہدِ رسالت وعہدِ صحابہ میں'' مصنفہ مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم، ''حفاظت وحجیتِ حدیث'' مصنفہ مولانا فہیم عثمانی صاحب۔

۳:...... مسلمانوں کو چاہئے کہ جو شخص یا تنظیم ایسے عقائد کی حامل ہو اس سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں، اور ان کے لٹریچر اور کیسٹ وغیرہ سے مکمل احتراز کریں، خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی بچانے کی کوشش کریں، اور اربابِ حکومت کو بھی ایسی تنظیم کی طرف توجہ دلائیں تاکہ ان پر پابندی لگائی جاسکے۔

۴:...... جو شخص مذکورہ عقائد کو بغیر کسی مناسب تأویل کے مانتا ہے وہ شخص مرتد اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے، اس کی مسلمان بیوی اس کے نکاح سے نکل گئی، اب اس کے عقد میں کوئی مسلمان عورت نہیں رہ سکتی، اور نہ کسی مسلمان عورت کا اس سے نکاح ہوسکتا ہے۔

مذکورہ بالا شخص کے عقائد قرآن وسنت، اجماعِ امت اور اکابر علمائے اہلِ سنت والجماعت کی تصریحات کے خلاف ہیں، اس کے لئے درج ذیل تصریحات ملاحظہ ہوں:

''فی شرح العقائد ص: ۲۱۷: وللّٰہ تعالیٰ کتب انزلھا علی انبیاءہ وبین فیھا امرہ ونھیہ ووعدہ ووعیدہ وکلھا کلام اللہ تعالیٰ ..... وقد نسخت بالقرآن تلاوتھا وکتابتھا بعض احکامھا. وفی الحاشیۃ قولہ "وللّٰہ کتب" رکن من ارکان ما یجب بہ الایمان مما نطقت النصوص القرآنیۃ والاخبار النبویۃ.''

ترجمہ:...... ''شرح عقائد ص:۲۱۷ میں ہے کہ: اللہ تعالیٰ کی (قرآن کے علاوہ) کئی کتابیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے

انبیاء پر نازل فرمایا اور ان کتابوں میں امر و نہی، وعدہ و وعید کو بیان فرمایا اور یہ تمام کتابیں کلامِ الٰہی ہیں ......اور قرآن مجید کے نازل ہونے پر ان سابقہ کتب کی تلاوت اور کتابت اور ان کے بعض احکام کو منسوخ کیا گیا۔ اور حاشیہ میں ہے: قولہ ”وللّٰہ کتب“ یعنی ایمان کے ارکان میں سے ایک رکن یہ بھی ہے کہ ان سابقہ کتب پر ایمان لایا جائے جن کے بارے میں نصوصِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ شہادت دیتی ہیں۔“

”وفیه ص:٤٥: والرسول انسان بعثه اللّٰه تعالیٰ الی الخلق لتبلیغ الاحکام.“

ترجمہ:......”اور شرح عقائد ص:۴۵ میں ہے: اور رسول وہ انسان ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ مخلوق کی طرف تبلیغِ احکام کے لئے مبعوث فرماتے ہیں۔“

”وفی شرح المقاصد ج: ٥ ص: ٥: النبی انسان بعثه اللّٰه تعالیٰ لتبلیغ ما اوحی الیه و کذا الرسول.“

ترجمہ:......”اور شرح مقاصد ج:۵ ص:۵ میں ہے کہ: نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ ان احکام کی تبلیغ کے لئے بھیجتے ہیں جو ان کی طرف وحی فرماتے ہیں اور رسول کی تعریف بھی یہی ہے۔“

”وفی شرح العقیدة الطحاویة لابن ابی العز ص: ٢٩٧: قوله: ونؤمن بالملٰئکة والنبیین والکتب المنزلة علی المرسلین نشهد انهم کانوا علی الحق المبین. هذه الامور من ارکان الایمان، قال تعالیٰ: ”اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ، لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ.“(البقرة:٢٨٥)

وقال تعالیٰ: ”لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ۔“ (البقرة:۱۷۷)

فجعل الله سبحانه وتعالیٰ الایمان هو الایمان بهذه الجملة وسمی من آمن بهذه الجملة مؤمنین، کما جعل الکافرین من کفر بهذه الجملة بقوله: وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا۔“ (النساء:۱۳۷)

ترجمہ:......”اور ابن ابوالعزؒ کی شرح عقیدۂ طحاویہ کے ص:۲۹۷ میں ہے کہ: ہم ایمان لاتے ہیں ملائکہ پر، نبیوں پر اور ان پر نازل ہونے والی تمام کتابوں پر اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ وہ (رسول) سب کے سب حق پر تھے۔ اور یہ تمام امور ارکانِ ایمان میں سے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اور مؤمنین بھی سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ، اور اس کے فرشتوں کے ساتھ، اور اس کی کتابوں کے ساتھ، اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ، اور اس کے پیغمبروں میں سے کسی سے تفریق نہیں کرتے۔“ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”کچھ سارا کمال اس میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو، لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر، اور فرشتوں پر اور کتب پر اور پیغمبروں پر۔“

(ان دلائل سے معلوم ہوا کہ) اللہ تعالیٰ نے ایمان ہی اس چیز کو قرار دیا ہے کہ ان تمام چیزوں پر ایمان ہو اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ”مؤمنین“ نام ہی ان لوگوں کا رکھا ہے جو ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں، جیسا کہ ”کافرین“ ان لوگوں کو کہا گیا

ہے جو ان تمام چیزوں کا انکار کرتے ہیں، جیسے کہ ارشادِ الٰہی ہے:
''اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا انکار کرے، اور اس کے فرشتوں کا، اور اس کی کتابوں کا، اور اس کے رسولوں کا، اور روزِ قیامت کا، تو وہ شخص گمراہی میں بڑی دور جا پڑا۔''

''وقال فی الحدیث المتفق علی صحته، حدیث جبریل، وسواله للنبی صلی الله علیه وسلم عن الایمان فقال: ان تؤمن بالله وملٰئکته وکتبه ورسله .... الخ. فهذه الاصول التی اتفقت علیها الانبیاء والرسل صلوات الله علیهم وسلامه، ولم یؤمن بها حقیقة الایمان الا اتباع الرسل.''

ترجمہ:...... ''اور حدیثِ جبریلؑ (جس کی صحت پر بخاری و مسلم متفق ہیں) میں ہے کہ: حضرت جبریلؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی تمام کتابوں پر، اور تمام رسولوں پر.....'' پس یہ وہ اصول ہیں جن پر تمام پیغمبروں اور رسولوں کا اتفاق ہے، اور اس پر صحیح معنی میں کوئی ایمان نہیں لایا مگر وہ جو انبیاء و رسل کے متبعین ہیں۔''

''وفیه ص: ۳۱۱: واما الانبیاء والمرسلون فعلینا الایمان بمن سمی الله تعالیٰ فی کتابه من رسله، والایمان بان الله تعالیٰ ارسل رسلا سواهم وانبیاء لا یعلم اسماءهم وعددهم الا الله تعالیٰ الذی ارسلهم ..... وعلینا الایمان بانهم بلغوا جمیع ما ارسلوا به علی ما امرهم الله به وانهم بینوه بیانا لا یسع احدا ممن

ارسلوا الیه جهله ولا یحل خلافه .... الخ.

..... واما الایمان بالکتب المنزلة علی المرسلین فنؤمن بما سمی اللہ تعالیٰ منها فی کتابه من التوراة والانجیل والزبور، ونؤمن بان اللہ تعالیٰ سوی ذالک کتبا انزلها علی انبیاءه لا یعرف اسمائها وعددها الا اللہ تعالیٰ۔"

ترجمہ:......"اور اسی کتاب کے ص:۳۱۱ پر ہے: رہے انبیاء اور رسول! پس ہمارے ذمہ واجب ہے کہ ان میں سے ان تمام نبیوں پر ایمان لائیں جن کا قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے، (اسی طرح) اس پر بھی ایمان لائیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے علاوہ دوسرے انبیاء اور رسول بھی بھیجے کہ جن کے نام اور تعداد اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، یعنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا......اور ہم پر لازم ہے کہ ہم اس بات پر ایمان لائیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء کو جن احکام کے پہنچانے کا حکم دیا تھا، ان انبیاء نے وہ تمام احکام پہنچادیئے، اور انبیاء نے ان احکام کو اتنا کھول کھول کر بیان کردیا کہ امت میں سے ناواقف سے ناواقف آدمی کو بھی کوئی اشکال نہ رہا، اور ان کے خلاف کرنا حلال نہ رہا......اور رہا ان کتابوں پر ایمان لانا جن کو رسولوں پر نازل کیا گیا، سو ہم ان تمام کتابوں پر ایمان لاتے ہیں، جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نام لیا ہے، یعنی تورات، انجیل اور زبور، اور ہم ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان مذکورہ کتابوں کے علاوہ اور کتابیں بھی اپنے انبیاء پر نازل فرمائیں، جن کا نام اور ان کی تعداد سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔"

"وفی شرح العقیدة الطحاویة للمیدانی ص: ۱۰۴:

والایمان المطلوب من المکلف ھو الایمان باللہ وملٰئکتہ وکتبہ بانھا کلام اللہ تعالیٰ الازلی القدیم المنزہ عن الحروف والاصوات وبانہ تعالیٰ انزلھا علیٰ بعض رسلہ بالفاظ حادثۃ فی الواح او علیٰ لسان ملک وبان جمیع ما تضمنتہ حق وصدق، ورسلہ بانہ ارسلھم الی الخلق لھدایتھم وتکمیل معاشھم معادھم وایدھم بالمعجزات الدالۃ علیٰ صدقھم فبلغوا عنہ رسالتہ .....الخ.“

ترجمہ:......”اور میدانی کی شرح عقیدۂ طحاویہ ص:۱۰۴ پر ہے: مکلّف (یعنی جن وانس) سے جو ایمان مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ: اللہ پر ایمان لانا، اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی تمام کتابوں پر، اس طرح ایمان لانا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام، کلامِ ازلی اور قدیم ہے، جو حروف اور آواز سے پاک ہے، اور نیز اللہ تعالیٰ نے اس کلام کو اپنے بعض رسولوں پر تختیوں میں حادث الفاظ کی صورت میں نازل کیا، یا فرشتہ کی زبان پر اتارا۔ اور نیز وہ تمام کا تمام کلام جس پر کتاب مشتمل ہے حق اور سچ ہے۔ اور اللہ کے رسول جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی طرف ان کی ہدایت، اور ان کی تکمیل معاش و معاد کے لئے بھیجا، اور ان انبیاء کی ایسے معجزات سے تائید کی جو ان انبیاء کی سچائی پر دلالت کرتے ہیں۔ ان انبیاء نے اللہ کے پیغام کو پہنچایا۔“

”قال القاضی عیاض فی شرح الشفاء ص: ۳۳۵:

واعلم ان من استخف بالقرآن او المصحف او بشیء منہ او سبہ او جحدہ او حرف منہ او آیۃ او کذب بہ او بشیء مما صرح بہ فیہ من حکم او خبر او اثبت ما نفاہ او نفی ما اثبتہ علیٰ علم منہ بذالک او شک فی شیء من ذالک

فھو کافر عند اھل العلم باجماع."

ترجمہ:...... ''علامہ قاضی عیاضؒ شرح شفاء ص:۳۳۵ میں لکھتے ہیں: جان لیجئے کہ جس نے قرآن یا کسی مصحف، یا قرآن کی کسی چیز کو ہلکا جانا یا قرآن کو گالی دی یا اس کے کسی حصہ کا انکار کیا یا کسی حرف کا انکار کیا یا قرآن کو جھٹلایا، یا قرآن کے کسی ایسے حصہ کا انکار کیا جس میں کسی حکم یا خبر کی صراحت ہو، یا کسی ایسے حکم یا خبر کو ثابت کیا جس کی قرآن نفی کر رہا ہے، یا کسی ایسی چیز کی جان بوجھ کر نفی کی جس کو قرآن نے ثابت کیا ہے، یا قرآن کی کسی چیز میں شک کیا ہے، تو ایسا آدمی بالاجماع، اہل علم کے نزدیک کافر ہے۔''

"وفی شرح العقائد ص: ۲۱۵ : وافضل الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم، لقولہ تعالیٰ: ''کنتم خیر امۃ.'' ولا شک ان خیریۃ الامۃ بحسب کمالھم فی الدین وذالک تابع لکمال نبیھم الذی یتبعونہ."

ترجمہ:...... ''شرح عقائد ص:۲۱۵ میں ہے کہ: انبیاء میں سے سب سے افضل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وجہ سے کہ: ''تم بہترین امت ہو!'' اور اس میں کوئی شک نہیں کہ امت کا بہترین ہونا دین میں ان کے کمال کے اعتبار سے ہے، اور امت کا دین میں کامل ہونا یہ تابع ہے ان کے اس نبی کے کمال کے، جس کی وہ اتباع کر رہے ہیں۔''

"وفی المشکوٰۃ: عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم: انا سید ولد آدم یوم القیامۃ واول من ینشق عنہ القبر واول شافع واول مشفع." (رواہ مسلم)

ترجمہ:...... ”اور مشکوٰۃ شریف میں ہے: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ: رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں قیامت کے دن اولادِ آدم کا سردار ہوں گا، میں پہلا وہ شخص ہوں گا جس کی قبر کھلے گی، اور میں سب سے پہلے سفارش کرنے والا ہوں گا، اور سب سے پہلے میری سفارش قبول کی جائے گی۔“

”وفی المرقاۃ ج: ۷ ص: ۱۰: فی شرح مسلم للنووی ..... وفی الحدیث دلیل علیٰ فضلہ علیٰ کل الخلق لان مذہب اہل السنۃ ان الآدمی افضل من الملٰئکۃ وہو افضل الآدمیین بہذا الحدیث۔“

ترجمہ:...... ”اور مرقاۃ ج:۷ ص:۱۰ میں ہے کہ: یہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام مخلوق پر فضیلت کی دلیل ہے، کیونکہ اہلِ سنت کا مذہب ہے کہ آدمی ملائکہ سے افضل ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث کی بنا پر تمام آدمیوں سے افضل ہیں (تو گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام مخلوقات سے افضل ہوئے)۔“

الغرض یہ شخص ضال و مضل اور مرتد و زندیق ہے، اسلام اور قرآن کے نام پر مسلمانوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈال رہا ہے، اور سیدھے سادے مسلمانوں کو نبیٔ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ رحمت سے کاٹ کر اپنے پیچھے لگانا چاہتا ہے۔

حکومتِ پاکستان کا فرض ہے کہ فوراً اس فتنہ کا سدباب کرے، اور اس بے دین کی سرگرمیوں پر پابندی لگائی جائے اور اسے ایسی عبرتناک سزا دی جائے کہ اس کی آئندہ آنے والی نسلیں یاد رکھیں، اور کوئی بدبخت آئندہ ایسی جرأت نہ کرسکے۔

نیز اس کا بھی کھوج لگایا جائے اور اس کی تحقیق کی جائے کہ کن قوتوں کے اشارہ پر یہ لوگ پاکستان میں اور مسلمانوں میں اضطراب اور بے چینی کی فضاء پیدا کر رہے ہیں؟

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر عذابِ الٰہی روکنے کا ذریعہ ہے

س……السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! اِن شاء اللہ بخیریت ہوں گے۔ ''بینات'' کی ترسیل جاری ہے، بروقت پرچہ ملنے پر خوشی کا اظہار کر رہا ہوں۔ خدا کرے ''بینات'' اُمتِ مسلمہ کی اُمنگوں کا آئینہ دار بن جائے۔ ایک عرض ہے کہ یہ دینی رسالہ خالص دینی ہونا چاہئے، کسی پر اعتراض و تشنیع مجھے پسند نہیں، اس سے نفرت کا جذبہ اُبھرتا ہے، صدر ضیاء الحق کے بیانات پر اعتراض یقیناً عوام میں نفرت پھیلنے کا ذریعہ بنتا ہے جس سے مملکت کی بنیادیں کھوکھلی پڑ جانے کا خطرہ ضرور ہے، ویسے بھی ملک اندرونی اور بیرونی خطرات سے دوچار ہے، کہیں بھارت آنکھیں دِکھا رہا ہے، تو کہیں کارمل انتظامیہ کی شہ پر رُوس کی آواز سنی جاتی ہے، کہیں خمینی کے اسلامی انقلاب کی آمد آمد کی خبریں سننے میں آجاتی ہیں، کہیں ملک کے اندر ہتھوڑا گروپ، کلہاڑا گروپ وغیرہ کی صدائیں سننے میں آرہی ہیں۔ غرض ایسے حالات میں ذراسی چنگاری بھی پورے پاکستان کا شیرازہ بکھیر سکتی ہے، اس صورت میں پھر یہ ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟ اس بارے میں اگر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے تو نوازش ہوگی۔

ج……آپ کا یہ ارشاد تو بجا ہے کہ وطنِ عزیز بہت سے اندرونی و بیرونی خطرات میں گھرا ہوا ہے، اور یہ بات بھی بالکل صحیح ہے کہ ان حالات میں حکومت سے بے اعتمادی پیدا کرنا قرینِ عقل و دانش نہیں، لیکن آنجناب کو معلوم ہے کہ ''بینات'' میں یا راقم الحروف کی کسی اور تحریر میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کے کسی سیاسی فیصلے کے بارے میں کبھی لب کشائی اور حرف زنی نہیں کی گئی:

کارِ مملکت خسرواں دانند

لیکن جہاں تک دینی غلطیوں کا تعلق ہے اس پر ٹوکنا نہ صرف یہ کہ اہلِ علم کا فرض ہے (اور مجھے افسوس اور ندامت کے ساتھ اعتراف ہے کہ ہم یہ فرض ایک فیصد بھی ادا نہیں کر پا رہے) بلکہ یہ خود صدرِ محترم کے حق میں خیر کا باعث ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو امیر المؤمنین حضرت معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہما کا واقعہ سناتا ہوں، جو حضرت مولانا محمد

فہرست

یوسف دہلوی قدس سرہٗ نے ”حیاۃ الصحابہ“ میں نقل کیا ہے:

”وأخرج الطبرانی وأبو یعلیٰ عن أبی قنیل[1] عن معاویة بن أبی سفیان رضی الله عنهما أنه صعد المنبر یوم القمامة فقال عند خطبة: انما المال مالنا، والفیٔ فیئنا، فمن شئنا أعطیناه، فمن شئنا منعناه. فلم یجبه أحد، فلما کان فی الجمعة الثانیة قال مثل ذالک، فلم یجبه أحد، فلما کان فی الجمعة الثالثة قال مثل مقالته فقام الیه رجل ممن حضر المسجد فقال: کلا! انما المال مالنا والفیٔ فیئنا فمن حال بیننا وبینه حکمناه الی الله بأسیافنا. فنزل معاویة رضی الله عنه فأرسل الی الرجل فادخله، فقال القوم: هلک الرجل، ثم دخل الناس فوجدوا الرجل معه علی السریر، فقال معاویة رضی الله عنه للناس: ان هٰذا أحیانی أحیاه الله! سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: سیکون بعد أمراء یقولون ولا یردّ علیهم یتقاحمون فی النار کما تتقاحم القردة. وان تکلمت أوّل جمعة فلم یرد علیّ أحد، فخشیت أن أکون منهم، ثم تکلمت فی الجمعة الثانیة فلم یرد علیّ أحد، فقلت فی نفسی: انی من القوم، ثم تکلمت فی الجمعة الثالثة فقام هٰذا الرجل، فردّ علیّ فأحیانی، أحیاه الله!“

(قال الهیثمی (ج:۵ ص:۲۳۶) رواه الطبرانی فی الکبیر والأوسط وأبویعلیٰ ورجاله ثقات، انتهیٰ. حیاۃ الصحابہ ج:۲ ص:۶۸)

---

(۱) کذا فی الأصل (یعنی مجمع الزوائد) والظاهر ”أبی قبیل“ اسمه حی بن هانی المعافری وهو ثقة، کذا فی کتاب الجرح والتعدیل لابن أبی حاتم الرازی (ج:۱ ص:۲۷۵)۔

فہرست

ترجمہ:...... ''حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما قمامہ کے دن منبر پر تشریف لے گئے، اور اپنے خطبہ میں فرمایا کہ: مال ہمارا ہے اور فئے (غنیمت) ہماری ہے، ہم جسے چاہیں دیں اور جسے چاہیں نہ دیں۔ ان کی یہ بات سن کر کسی نے جواب نہیں دیا۔ دُوسرا جمعہ آیا تو حضرت معاویہؓ نے اپنے خطبہ میں پھر یہی بات کہی، اب کے بھی انہیں کسی نے نہیں ٹوکا، تیسرا جمعہ آیا تو پھر یہی بات کہی، اس پر حاضرینِ مسجد میں سے ایک شخص کھڑا ہوگیا اور کہا: ہرگز نہیں! یہ مال ہمارا ہے، اور غنیمت ہماری ہے، جو شخص اس کے اور ہمارے درمیان آڑے آئے گا ہم اپنی تلوار کے ذریعہ اس کا فیصلہ اللہ کی بارگاہ میں پیش کریں گے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ منبر سے اُترے تو اس شخص کو بلا بھیجا، اور اسے اپنے ساتھ اندر لے گئے، لوگوں نے کہا کہ: یہ شخص تو مارا گیا، پھر لوگ اندر گئے تو دیکھا کہ وہ شخص حضرت معاویہؓ کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہے، حضرت معاویہؓ نے لوگوں سے فرمایا کہ: اس شخص نے مجھے زندہ کردیا، اللہ تعالیٰ اسے زندہ رکھے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ: ''میرے بعد کچھ حکام ہوں گے جو (خلافِ شریعت) باتیں کریں گے، لیکن کوئی ان کو ٹوکے گا نہیں، یہ لوگ دوزخ میں ایسے گھسیں گے جیسے بندر گھستے ہیں۔'' میں نے پہلے جمعہ کو ایک بات کہی، اس پر مجھے کسی نے نہیں ٹوکا، تو مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میں بھی انہیں لوگوں میں سے نہ ہوں، پھر میں نے دُوسرے جمعہ کو یہ بات دُہرائی، اس بار بھی کسی نے میری تردید نہیں کی تو میں نے اپنے جی میں سوچا کہ میں انہی میں سے ہوں، پھر میں نے تیسرے جمعہ یہی بات کہی تو اس شخص نے مجھے ٹوک دیا، پس اس نے مجھے زندہ کردیا، اللہ تعالیٰ اس کو زندہ رکھے۔''

اور یہ نہ صرف صدرِ محترم کے حق میں خیر و برکت کی چیز ہے، بلکہ اُمت کی صلاح وفلاح بھی اسی پر منحصر ہے، چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"والذی نفسی بیدہ! لتأمرنّ بالمعروف ولتنھون عن المنکر أو لیوشکن اللہ أن یبعث علیکم عذابًا من عندہ ثم لتدعنہ ولا یستجاب لکم."

(رواہ الترمذی، مشکوٰۃ ص:۴۳۶)

ترجمہ:......"اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے! تمہیں معروف کا حکم کرنا ہوگا اور بُرائی سے روکنا ہوگا، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب نازل کردے، پھر تم اس سے دُعائیں کرو، اور تمہاری دُعائیں بھی نہ سنی جائیں۔"

ارشاداتِ نبویہ کی روشنی میں راقم الحروف کا احساس یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمل عذابِ الٰہی کو روکنے کا ذریعہ ہے۔ آج اُمت پر جو طرح طرح کے مصائب ٹوٹ رہے ہیں، اور ہم گوناگوں خطرات میں گھرے ہوئے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کی "احتسابی حس" کمزور اور "نہی عن المنکر" کی آواز بہت دھیمی ہوگئی ہے۔ جس دن یہ آواز بالکل خاموش ہوجائے گی اس دن ہمیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ ہمیں اس روزِ بد سے محفوظ رکھیں۔

ٹی وی...ایک اصلاحی ذریعہ

س...... اس مرتبہ ۲۰/ربیع الثانی ۱۴۱۴ھ بمطابق ۸/اکتوبر ۱۹۹۳ء کا اخبار پڑھنے کے دوران "مسبوق کی نماز" کے متعلق سوالوں کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ: "ٹی وی ایک لعنت ہے"۔

اس ضمن میں میری گزارشات کو اگر آپ تھوڑی سی توجہ عطا فرمائیں اور مجھے اجازت ہو کہ میں گزارشات پیش کرسکوں، تاکہ میری عقلِ ناقص میں جو خیالات اُمڈ رہے

ہیں ان کی تسلی وتشفی ہوسکے۔ میں اسلامی شعائر کی پابندی کی کوشش کرنے والا ایک حقیر انسان ہوں، مجھے یہ خیال آرہا ہے کہ ادائیگیٔ حج کے دوران حج ادا کرنے کے طریقے ٹی وی سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے، ٹی وی کی مدد سے خانۂ کعبہ کی زیارت زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کونصیب ہوتی ہے، ٹی وی کی مدد سے قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے قاری صاحبان الفاظ کی ادائیگی اور ساتھ الفاظ کی شناخت کراتے ہیں جس کے باعث عام ٹی وی دیکھنے والوں کو اپنی تلاوت میں غلطیوں کی تصحیح کرنے میں مدد ملتی ہے، ٹی وی کی مدد سے عام لوگوں کونماز پڑھنے اور نماز میں کھڑا ہونے، تکبیر کے بعد ہاتھ اُٹھانے اور پھر ہاتھ باندھ کے صحیح کھڑے ہونے کا طریقہ سکھایا جاتا ہے، رُکوع، قومہ، قعدہ، سجدہ اور تشہد میں بیٹھنے کا طریقہ بار بار لوگوں کے ذہن نشین کرایا جاسکتا ہے، لوگ نماز میں کھڑے اکثر ہاتھ ہلاتے اور خشوع وخضوع توڑنے کی حرکتیں کرتے ہیں، ان کو سمعی اور بصری طریقہ ہائے بیان سے سمجھایا جاسکتا ہے۔ ایک وقت میں ایک عالمِ دین ٹی وی پر تقریر کرلے تو سمعی، بصری قوّتیں ناظر و سامع کو وہ کچھ جاننے میں آسانی پیدا کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ لہٰذا معلوم یہ ہوا کہ ٹی وی کو اگر تبلیغِ دینِ اسلام کے لئے استعمال کیا جائے تو یہ ایک انتہائی مؤثر ذریعۂ تبلیغ بن سکتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ پروگرام ترتیب دینے کی کوشش میں ہوں کہ ایک عالمِ اسلام کی مرکزی ٹی وی نشریات ہوں جس کے ذریعہ بین الاقوامی زبانوں میں قرآن پاک اور احادیثِ مبارکہ کی تعلیمات سمعی وبصری ذریعے سے لوگوں تک دُنیا کے کونے کونے میں پھیلائی جائیں۔ مکۃ المکرّمہ میں بین الاقوامی اسلامی مرکزِ نشریات ہو، اور اس سے مسلم دُنیا اور غیرمسلم دُنیا میں اسلامی نشریات پہنچیں اور تبلیغ کا کام بجائے محدود رکھنے کے عام کیا جائے۔ اسی طرح اسلام کا تبلیغی مرکز تعلیماتِ اسلام کا انسائیکلوپیڈیا تیار کرے، بین الاقوامی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو اور ٹی وی تعلیماتِ اسلامی کے عام کرنے میں استعمال کیا جائے۔ آج ڈش انٹینا کی مدد سے لوگوں کے گھروں میں بین الاقوامی اداروں کے فحش لٹریچر اور اخلاق سوز پروگرام لوگ دیکھتے ہیں، اگر اسلامی بین الاقوامی ٹی وی نیٹ ورک سے اسلامی پاور فل چینل کی مدد سے اسلامی اخلاقیات عام کی جائیں، اخلاقِ اسلامی پر تیار معاشرے کی عملی تصویریں پیش کی جائیں

فہرست

تا کہ لوگوں کے دِلوں میں اس سکونِ قلب کے حصول کی جانب کشش ہو، وہ لچر اور اخلاق سوز پروگرام دیکھنے کی بجائے اسلامی بین الاقوامی نشریاتی ادارے کی مبنی بر اخلاقیات عملی زندگی کے نمونے دیکھیں اور اسلام کا پیغام جو صرف سمعی ذریعے سے پھیلایا جارہا ہے، بصری ذریعے سے پھیلے مؤثر انداز میں۔ اس اہم ذریعۂ پیغام رسانی سے اسلام کا پیغام عام ہو لہٰذا مندرجہ بالا اُمور ٹی وی کو اور اس کے استعمال کو باعثِ برکت و رحمت بنا سکتے ہیں۔

ج...... آپ کے خیالات تو لائقِ قدر ہیں، مگر یہ نکتہ آپ کے ذہن میں رہنا چاہئے کہ دینِ اسلام، دینِ ہدایت ہے، جس کی دعوت و تبلیغ کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضراتِ صحابہ کرامؓ نے، حضراتِ تابعینؒ نے، ائمہ دینؒ نے، بزرگانِ دینؒ نے، علمائے اُمتؒ نے اس فریضے کو ہمیشہ انجام دیا۔ ہدایت پھیلانے کا کام انہی حضرات کے نقشِ قدم پر چل کر ہوسکتا ہے، ان کے راستے سے ہٹ کر نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج بھی دین کی دعوت کا کام اسی منہاج پر ہورہا ہے۔ تبلیغِ دین کے لئے ایسے ذرائع اختیار کرنے کی اجازت ہے جو بذاتِ خود مباح اور جائز ہوں، حرام اور ناجائز ذرائع اختیار کرکے ہدایت پھیلانے کا کام نہیں ہوسکتا، کیونکہ ناجائز ذرائع خود شر ہیں، شر کے ذریعہ شر تو پھیل سکتا ہے، شر کے ذریعہ خیر اور ہدایت کو پھیلانے کا تصوّر ہی غلط ہے۔ ٹی وی کا مدار تصویر پر ہے اور ہماری شریعت نے تصویر سازی کو حرام قرار دیا ہے، اب جو چیز کہ شرعاً حرام ہو اس کو ہدایت پھیلانے کا ذریعہ کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ اس سے شر و گمراہی کو تو فروغ ہوسکتا ہے لیکن اگر آپ چاہیں کہ اس کے ذریعہ لوگوں کے دِلوں میں ایمان اور ہدایت اُتار دیں تو یہ خیال محض خیال ہے۔ ہزاروں لوگ ٹی وی پر ''دینی پروگرام'' دیکھتے ہیں، لیکن ان میں سے ایک آدمی بھی نہیں ملے گا جس نے ٹی وی دیکھ کر ایمان سیکھ لیا ہو، اور اس نے گناہوں سے توبہ کرکے نیک اور پاک زندگی اختیار کرلی ہو۔ ہاں! بے شمار لوگ ایسے ہیں جو ٹی وی دیکھ کر گمراہ ہوگئے اور ان کے اندر ایمان کی جو رمق باقی تھی اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ آپ نے جتنی بھی مثالیں دی ہیں وہ صحیح ہیں، لیکن ٹی وی کی مثال غلط ہے، کیونکہ میں بتاچکا ہوں کہ ٹی وی تصویر کی وجہ سے

فہرست

نجس العین ہے، اس لئے آپ کا یہ کہنا کہ ''ٹی وی بُرا نہیں'' غلط ہے۔ خنزیر کا آپ اچھا استعمال کریں یا بُرا، وہ ہر حال میں نجس العین ہے، اس کے اچھے استعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

''غرض یہ کہ'' کہہ کر آپ نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ بھی غلط ہے، کیونکہ آپ کا یہ نظریہ کہ ''کوئی چیز بھی بذاتِ خود اچھی یا بُری نہیں'' غلط ہے، میرا کہنا یہ ہے کہ جس چیز کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، وہ بذاتِ خود بُری ہے، اس کو کسی اچھائی کے لئے استعمال کرنا اس سے زیادہ بُرا ہے۔ آپ نے یہ اُصول مقرّر کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھی ہے کہ ہمارے دین نے دُنیا کی کسی چیز کو نہ بذاتِ خود اچھا قرار دیا ہے اور نہ کسی چیز کو بذاتِ خود بُرا قرار دیا ہے، حالانکہ یہ بات صریحاً غلط ہے۔ شریعت نے تمام چیزوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، کچھ چیزیں بذاتِ خود اچھی ہیں، کچھ چیزیں بذاتِ خود بُری ہیں، اور کچھ چیزیں نہ بذاتِ خود اچھی ہیں نہ بُری، آپ کا یہ اُصول تیسری قسم میں تو جاری ہوتا ہے کہ ایسی چیز کا استعمال اچھا ہو تو اچھی ہیں، بُرا ہو تو بُری ہیں۔ لیکن جو چیزیں کہ بذاتِ خود بُری ہیں، نجس العین ہیں، حرام ہیں، ان کی اچھائی بُرائی ان کے استعمال پر موقوف نہیں، ان کا بُرا استعمال ہو تب بھی بُری ہیں، اور اگر بفرضِ محال اچھا استعمال ہو تب بھی بُری ہیں، ٹی وی نجس العین ہے، اس کا بُرا استعمال بھی بُرا ہے، اور اچھا استعمال بھی بُرا ہے، بلکہ بدتر ہے کہ دین کو اس گندگی کے ساتھ ملوّث کرنا بجائے خود ایک جرم ہے۔

سنت کے مطابق بال رکھنے کا طریقہ

س……۱: بال رکھنے کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح کے بال رکھے تھے؟ پٹے رکھے تو کتنے بڑے رکھے تھے؟ اگر چھوٹے بال تھے تو کتنے چھوٹے تھے؟ آج کل انگریزی بال بنائے جاتے ہیں، اس طرح کے بال دین دار اور عام لوگ دونوں رکھتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟

ج……آج کل جو بال رکھنے کا فیشن ہے یہ تو سنت کے خلاف ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سرمبارک پر بال رکھتے تھے، اور وہ عام طور سے کانوں کی لوتک ہوتے تھے، کبھی اصلاح

کرنے میں دیر ہوجاتی تو اس سے بڑھ بھی جاتے تھے، لیکن آج کل جو نوجوان سر پر بال رکھتے ہیں یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں بلکہ غیر قوموں کی نقل ہے۔

س……۲: فجر کی نماز ایک مسجد میں پڑھی، پھر کسی کام سے مسجد سے باہر جانا ہوا، اِشراق کی نماز دُوسری مسجد میں یا گھر پر پڑھ سکتے ہیں یا کہ اسی مسجد میں بیٹھے رہیں؟

ج……اگر کسی ضرورت سے جانا پڑے تو دُوسری جگہ بھی اِشراق کی نماز پڑھ سکتے ہیں، خواہ گھر پر پڑھیں یا کسی اور مسجد میں، البتہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھے اور پھر اپنی جگہ بیٹھا رہے یہاں تک کہ اِشراق کا وقت ہوجائے اور پھر اُٹھ کر دو رکعتیں یا چار رکعتیں اِشراق کی نماز پڑھے تو اس کو ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب ملتا ہے۔

دین پر عمل کرنے کی راہ میں رُکاوٹیں

س……ہم لوگ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ زندگی اچھی گزر رہی ہے، لیکن دُنیا کی نظروں میں تو ظاہر ہے کہ ہم غریب ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ ہم الحمدللہ پردہ کو اپنائے ہوئے ہیں، اور آپ تو جانتے ہیں کہ آج کے معاشرے میں غریب لڑکیوں اور خاص کر با پردہ لڑکیوں کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے، جیسے وہ کسی اور دُنیا کی مخلوق ہوں۔ خیر! ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں، اللہ ہم پر رحم فرمائے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ماں باپ ہمارے رشتوں کی طرف سے بہت پریشان ہیں، پہلے تین بہنوں کے رشتے آتے ہی نہیں تھے اور جو آتے تھے وہ بہت آزاد خیال لوگوں کے، آخر کار تھک ہار کر جب بہنوں کی عمریں نکلنے لگیں تو ایسے گھرانوں میں ہی رشتے طے کردیئے گئے کہ جن کے یہاں بس دِکھاوے کو خدا کا نام لیا جاتا ہے، لیکن والد صاحب نے رشتہ طے کرتے وقت شرط رکھی تھی کہ میری بیٹیاں پردہ نہیں توڑیں گی، جو انہوں نے قبول کرلیں اور بالآخر شادیاں ہوگئیں، لیکن آپ خود سوچئے جب گھر کے ماحول میں اس قدر آزادی ہو کہ کوئی لڑکی چادر تک نہ اوڑھتی ہو ایسے ماحول میں پردہ قائم رکھنا کتنا مشکل کام ہے؟ بہرحال اللہ میری بہنوں کو ہمت دے۔ اس ساری کہانی

سنانے کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے بہت سے جاننے والے ایسے ہیں جو بہت نیک ہیں، اس قدر نیک کہ ان کے یہاں اتنا سخت پردہ ہے کہ عورتوں کو کوئی برقع میں بھی آزادانہ پھرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، اور شریعت کے تمام قوانین کی پابندی ہوتی ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب بہت امیر لوگ ہیں، اس لئے وہ لوگ جب اپنے بیٹوں کی شادیاں کرتے ہیں تو امیروں کی بیٹیوں سے ہی کرتے ہیں۔ برائے کرم مولانا صاحب! مجھے بتایئے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ غریبوں کی بیٹیاں صرف اپنی غربت کے باعث ایسے گھرانوں میں بیاہی جانے پر مجبور ہوں جہاں وہ اللہ کے دین کی پابندی نہ کرپائیں جبکہ صاحبِ حیثیت لوگ صرف صاحبِ حیثیت لوگوں سے ہی رشتہ جوڑتے چلے جائیں جبکہ ان کے سامنے ہی ایسے گھرانے موجود ہوں جہاں نیک، شریف، باپردہ لڑکیاں موجود ہوں، کیا ہمیں یہ حق نہیں کہ ہم بھی تمام عمر اللہ کے دین پر قائم رہ سکیں؟ لیکن ہمیں ایک وقت پر مجبوراً ایسی جگہ جانا پڑتا ہے جہاں ہماری توقع سے بہت مختلف ماحول ملتا ہے، جہاں کوشش کے باوجود دین پر قائم رہنا مشکل ہوجاتا ہے، آخر اس میں کس کا قصور ہے؟ ہم کس سے انصاف مانگیں؟

ج...... آپ کی یہ تحریر تمام دین دار لوگوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے۔ بہرحال اپنے معیار کے شریف اور دین دار گھرانوں کو تلاش کرکے رشتے کئے جائیں، بلکہ اگر کوئی غریب مگر شریف اور دین دار رشتہ مل جائے تو اس کو بڑے پیٹ والے لوگوں پر ترجیح دی جائے۔ اس نوعیت کے مسائل تقریباً تمام والدین کو پیش آتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں دین داری کی یہ قیمت بہت معمولی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ ایسے تمام والدین کی خصوصی مدد فرمائیں، آمین!

غیبت اور حقیقتِ واقعہ

س...... عرض ہے کہ غیبت کے بارے میں مسئلہ بتادیجئے، مثلاً: ایک مولانا نے مسئلہ بیان کیا کہ ایک عورت حضرت عائشہؓ کے پاس آئی جس کا قد چھوٹا تھا، اس کے جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ: حضور! اس عورت کا قد

فہرست

چھوٹا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عائشہ! یہ بات غیبت ہوئی۔ حضرت عائشہؓ نے کہا کہ: حضور! یہ بات اس میں تھی، وہی میں نے کہی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہی تو غیبت ہے، اگر اس میں یہ بات نہ ہوتی تو یہ بہتان ہو جاتا۔

مثلاً: میں نے ایک صاحب سے پیسے لینے ہیں، اگر وہ پیسے نہیں دے رہا ہے، میں نے اس کے بھائی سے کہا کہ آپ اس کو کہئے کہ وہ پیسے دے، تو کیا یہ بھی غیبت ہوئی؟ دُوسرا مسئلہ میرا بھانجا مسقط گیا ہوا تھا، واپسی پر میرے گھر میں نہیں ٹھہرا سیدھا لاہور چلا گیا، میں نے اپنی بہن سے اس کی شکایت کی، کیا یہ بھی غیبت ہوئی؟

ج...... یہ غیبت نہیں، واللہ اعلم!

''السلام علیکم پاکستان'' کہنا

س...... آج کل ایک مقامی ریڈیو چینل ہے، نشریات مغربی تہذیب اور کلچر کی تقلید کرتے ہوئے ۲۴ گھنٹے مسلسل شروع کی گئی ہیں۔ مخلوط ٹیلیفون کالز کے ذریعہ نہ صرف فحاشی کو فروغ دیا جارہا ہے بلکہ دُوسری طرف مال کا اسراف بھی کیا جاتا ہے۔

پوری پوری رات عورتیں، مرد کمپیئر سے فون پر اپنے دِل کا راز و نیاز بیان کرتی ہیں اور جواباً مرد کمپیئر اظہار اشعار اور گانوں کے ذریعہ کرتا ہے۔ اس پروگرام میں ہر فون کرنے والا پہلے ''السلام علیکم پاکستان'' کہتا ہے، جواب میں بھی اسے ''السلام علیکم پاکستان'' کہا جاتا ہے، یعنی جنت کا کلام ''السلام علیکم'' کی بھی بے ادبی کی جاتی ہے، اور بعض ٹی وی پروگرام میں پنجابی تہذیب کو اُجاگر کرتے ہوئے دیہات کا ماحول پیش کیا جاتا ہے جس میں آنے والے مہمان کو میزبان کہتا ہے: ''بسملیاں! بسملیاں!'' مندرجہ بالا گزارشات کے بعد میرے ذہن میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱:...... کیا ''السلام علیکم'' کے ساتھ اور کوئی لفظ ملا کر کہنا یعنی ''السلام علیکم پاکستان'' کہنا جائز ہے؟

۲:...... کیا عورتیں ٹیلیفون پر غیرمحرَم سے بے تکلف ہوکر باتیں کرسکتی ہیں؟

۳:...... بسم اللہ کے بجائے جو لوگ (نعوذ باللہ) ''بسملیاں'' کہتے ہیں، اس کا کیا

مطلب ہے؟ اور جو لوگ قرآن کی آیتوں کو توڑ مروڑ کر اس طرح پڑھتے ہیں ان کے بارے میں قرآن و حدیث کا کیا فیصلہ ہے؟

ج...... جو لوگ پاکستان میں فحاشی اور عریانی پھیلاتے ہیں، مرنے کے بعد عذابِ قبر میں مبتلا ہوں گے اور ان کے ساتھ ان کے حکمران بھی پکڑے جائیں گے، اس لئے کہ یہ ملک فحاشی کا اڈّا بنانے کے لئے نہیں بنایا گیا تھا، بلکہ یہاں قرآن و سنت کی حکمرانی جاری کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔

۱:...... ''السلام علیکم'' مسلمانوں کا شعار ہے، لیکن اس کا اس طرح استعمال اس شعار کی بے حرمتی ہے۔

۲:......عورتوں کا نامحرم مردوں سے بے تکلف گفتگو کرنا حرام اور ناجائز ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی آواز کو بھی پردہ بنایا ہے اور قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: ''فلا تخضعن بالقول'' یعنی بات کرتے وقت تمہاری زبان میں لوچ نہیں آنا چاہئے، اس لئے یہ مرد اور عورتیں گنہگار ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے اِستغفار کرنا چاہئے اور اپنے رویے سے باز آجانا چاہئے، ورنہ مرنے کے بعد ان کو اتنا سخت عذاب ہوگا کہ دیکھنے والوں کو بھی ترس آئے گا۔

۳:...... یہ ''بسملیاں'' مہمل لفظ ہے اور یہ پنجابی تہذیب نہیں بلکہ ایسا کرنے والوں کا قلبی روگ ہے۔

بدامنی اور فسادات...عذابِ الٰہی کی ایک شکل

س...... آج کے اس پُرمصائب دور میں جبکہ ہم مسلمانوں کے ایمان غالباً تیسرے درجے سے گزر رہے ہیں اور فرقہ واریت اور لسانی بندشوں کا شکار ہیں اس دور میں قتل و غارت، ڈکیتیاں، بدامنی، بدکاری غرضیکہ تمام سماجی بُرائیاں (سوشل لیول) جمگھٹا ڈالے ہوئے ہیں، اگر ہم اللہ تعالیٰ پر مکمل ایمان رکھتے ہیں، ان کے کہنے پر (قرآن و حدیث پر) عمل کرتے ہیں تو بلاشبہ بہت سے مسائل کا حل ملتا ہے، لیکن آزمائشیں بہت ہیں اور صحیح ہیں، گو کہ ہر مسلمان مؤمن نہیں ہوتا، اس لئے آزمائش پر پورا نہیں اُترتا۔ میرا مدعا یہ ہے کہ انسان جو ایک دُوسرے کا خون بہا دیتا ہے چاہے وہ اپنی حفاظت میں یا دُوسرے کی دُشمنی میں، یہ

کہاں تک دُرست ہے؟ مطلب یہ کہ کوئی شخص اپنے جان و مال کی حفاظت میں اگر دُوسرے مسلمان کا خون بہادیتا ہے یا اپنی زَن (عورت) چاہے ماں، بہن یا بیوی ہو، اس کی خاطر خون بہادیتا ہے، اگرچہ ہمیں ایسا لگتا ہے کہ وہ حق پر ہے، لیکن اللہ پر ایمان مکمل ہونے کے بعد اللہ ہمارے جان و مال کی حفاظت کرتا ہے تو ہم کسی صورت میں ہتھیار اُٹھاسکتے ہیں اور اپنے مسلمان بھائی کا خون بہاسکتے ہیں؟ کیونکہ عدل و انصاف اس معاشرے میں تقریباً ختم ہوچکا ہے۔

ج……جس بدامنی اور فساد کا آپ نے ذکر کیا ہے، یہ عذابِ الٰہی ہے، جو ہماری شامتِ اعمال کی وجہ سے ہم پر مسلط ہوا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سچی توبہ کریں، تمام ظاہری و باطنی گناہوں کو چھوڑنے کا عہد کریں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے تمام اجتماعی وانفرادی گناہوں اور بدعملیوں کی معافی مانگیں۔ کسی بے گناہ مسلمان کو قتل کرنا کفرو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے، جس کی سزا قرآنِ کریم نے جہنم میں بتائی ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، ہر وہ شخص جس کے دِل میں ایمان کا کوئی ذرّہ موجود ہو، اور جو آخرت کی جزاوسزا کا قائل ہو اس کو اس سے سو بار توبہ کرنی چاہئے کہ اس کے ہاتھ کسی مسلمان کے خون سے رنگین ہوں۔ جو مسلمان ان ہنگاموں میں بے گناہ مارا گیا کہ اس کا کسی کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں تھا وہ شہید ہے، اور جو گروہ ایک دُوسرے کو قتل کرنے کے درپے تھے ان میں قاتل اور مقتول دونوں جہنم کا ایندھن ہیں۔ اگر کسی مسلمان پر ناحق حملہ کیا اور اس نے اپنا دفاع کرتے ہوئے حملہ آور کو ماردیا تو وہ گناہ سے بَری ہے اور حملہ آور جو قتل ہوا وہ سیدھا جہنم میں گیا۔ اسی طرح اگر کسی کے بیوی بچوں پر حملہ کیا اور اس شخص کے ہاتھ سے حملہ آور مارا گیا، یہ بھی گناہ سے بَری ہے اور حملہ آور سیدھا جہنم میں پہنچا۔

خیالاتِ فاسدہ اور نظرِ بد کا علاج

س……مجھ میں ایک مرض یہ ہے کہ جب کسی کو گناہ میں مشغول دیکھتا ہوں تو اس میں دِل کو نکیر ہوتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے، اس کی اور گناہ کی حقارت بھی ہوتی ہے، لیکن جب خود سے گناہ کا ارتکاب ہوتا ہے تو نہ خوف، نہ حقارت، نہ نفرت، نہ انکار، نہ حیا کچھ بھی نہیں ہوتا،

ہاں مخلوق کا خوف ہوتا ہے کہ کسی کو پتہ نہ لگ جائے، ذِلت ہوگی، اس کے باوجود گناہ سے اجتناب نہیں ہوتا۔

ج…… گناہ اور گناہ گار سے کبیدگی تو علامتِ ایمان ہے، تاہم یہ احتمال کہ یہ شخص مجھ سے حالاً و مآلاً اچھا ہو، بس اس کا استحضار کافی ہے، اس سے زیادہ کا انسان مکلّف نہیں ہے۔

س…… خیالاتِ فاسدہ، گندے غلیظ وساوس، نظرِ بد جیسے جرائم کا ارتکاب ہوتا رہتا ہے، کبھی کبھی فوراً ندامت پشیمانی ہوتی ہے اور کبھی ندامت پاس سے بھی نہیں گزرتی، داڑھی منڈوانے سے، راگ ناچ گانا اس طرح کے ہر گندے فعل سے نفرت ہے، اس کے مرتکبین سے نفرت ہے، لیکن مجھے بے لذّت گناہوں کی خواہشات کا غلبہ رہتا ہے۔

ج…… خیالاتِ فاسدہ، وساوس وغیرہ جن کو آپ مرض سمجھ رہے ہیں یہ مرض نہیں، بلکہ غیراختیاری اُمور ہیں، جن پر مؤاخذہ نہیں، بلکہ مجاہدہ ہے۔ آپ کسی فارغ وقت میں "مراقبۂ دُعائیہ" کیا کریں، باوضو قبلہ رُخ بیٹھ کر آنکھیں اور زبان بند کرکے اپنی حالت اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کردیں اور دِل میں اللہ تعالیٰ سے عرض کریں کہ: یااللہ! میری حالت تو آپ کے سامنے ہے، آپ قادرِ مطلق ہیں، میری حالت اچھی کردیجئے اور مجھے آخرت میں رُسوا نہ کیجئے۔

س…… آج کل زیبائش، عریانی عام ہے، جب کبھی ضرورت کے لئے نکلتا ہوں تو غیرمحرَم پر نظرِ بد کے جرم کا ارتکاب ہوجاتا ہے، نظرِ بد سے بچنا میرے جیسے کے لئے تو بہت ہی مشکل ہے۔

ج…… فوراً نظر ہٹالی جائے، خیالات کا ہجوم غیراختیاری ہو تو مضر نہیں، بلکہ ہجومِ خیالات کے باوجود بالقصد دوبارہ نہ دیکھنا مجاہدہ ہے، اور اِن شاء اللہ اس پر اَجر ملے گا، اسی کے ساتھ اِستغفار کرلیا جائے، اِن شاء اللہ غلط خیالات کے اثرات قلب سے دُھل جائیں گے۔

والدہ کی قبر معلوم نہ ہو تو دُعائے مغفرت کیسے کروں؟

س…… میری والدہ مرحومہ کراچی میں دفن ہیں، میں اکثر ان کی مغفرت کی دُعائیں کرتا رہتا ہوں، اب یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں کبھی ان کی قبر پر نہیں گیا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ قبر پر جانا ضروری ہے یا نہیں؟ اور قبر پر نہ جانے سے گھر ہی پر دُعائیں کرنا بیکار تو نہیں؟ دُوسرے یہ کہ

قبرستان اگر جاؤں بھی تو والدہ کی قبر کا پتہ نہیں، تو قبرستان میں جاکر والدہ کے لئے کہاں کھڑا ہوکر دُعا کروں اور کیا کیا دُعا کروں؟ کیا وہاں کچھ پڑھنا ہوگا یا ایسے ہی دُعائے مغفرت کروں؟

ج...... اگر آپ کو والدہ کی قبر کا پتا ہی نہیں تو آپ کو جانے کا مشورہ کیسے دُوں؟ البتہ آپ کو نشانی رکھنا چاہئے تھی یا اگر کوئی آدمی جاننے والا ہے تو آپ اس سے پتا کرلیجئے، قبر پر جانے سے میّت کو اتنی خوشی ہوتی ہے کہ جتنا ماں کو اپنے بیٹے سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ بہرحال ان کو پڑھ کر بخشتے رہنا چاہئے یہ بھی بیکار نہیں ہے۔

وہم کا علاج کیا ہے؟

س...... میں بی اے کی طالبہ ہوں، ہمارا گھر تھوڑا بہت مذہبی ہے، نماز تقریباً سب ہی لوگ پڑھتے ہیں، لیکن جب سے میں نے نماز شروع کی ہے، آہستہ آہستہ آج ایسی ہوگئی ہوں کہ اگر کسی کا پاؤں لگ جائے تو دھونے بیٹھ جاتی ہوں، اگر جھاڑو کسی کپڑے کو لگ جائے تو فوراً دھوتی ہوں، اگر گیلا پونچھا کمرے میں لگتا ہے تو میں اس سے بچتی ہوں، چھینٹوں سے تو اس طرح بچتی ہوں جیسے انسان آگ سے بچتا ہے، اگر پانی زمین پر گرا اور میرے کپڑوں پر **چھینٹیں** آگئیں تو پائنچے دھوتی ہوں کہ ہر وقت میرے پائنچے گیلے رہتے ہیں، کیونکہ ہمارا چھوٹا سا گھر ہے، آخر کب تک کمرے میں رہا جاسکتا ہے؟ بس میری یہ ہی کیفیت ہے جس کی وجہ سے اب گھر والے مجھے نفسیاتی مریضہ، ذہنی مریضہ اور وہمن کے نام سے پکارتے ہیں، جس پر مجھے دِلی دُکھ ہوتا ہے اور پھر میں یہ سوچتی ہوں کہ اب ایسا نہ کروں گی، لیکن پھر ایسا نہیں کرپاتی۔ خیال آتا ہے کہ اگر کپڑے ناپاک ہوگئے تو نماز نہ ہوگی۔ گھر والے مجھے ہر وقت پانی میں گھسے رہنے سے منع کرتے ہیں، جس کی وجہ سے مجھے اب ایگزیما بھی ہوگیا ہے، لیکن میں کہتی ہوں کہ میرے اُوپر کسی قسم کی چھینٹ نہ آئے۔ گھر والے کہتے ہیں کہ ہمارے گھر میں کوئی بچہ نہیں ہے کہ جس کے پیشاب وغیرہ کی چھینٹ سے تیرے کپڑے ناپاک ہوجائیں گے۔ کبھی کبھی جب مجھے اس بات پر ڈانٹ پڑتی ہے تو میرا دِل چاہتا ہے کہ نماز ہی چھوڑ دُوں تاکہ میں ان چیزوں سے نجات پاسکوں، لیکن دِل نہیں مانتا اور نماز کسی

فہرست

حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ میرے سوال کا جلد از جلد جواب دے کر ذہنی اذیت سے نجات دِلا سکتے ہیں۔

ج…… بیٹی! ایک بات سمجھ لو، اگر پاکی ناپاکی کا مسئلہ اتنا ہی مشکل ہوتا، جتنی مشکل کہ آپ نے اپنے اُوپر ڈال رکھی ہے، تو دُنیا کا کارخانہ ہی بند ہوجاتا۔ آپ کی طرح ہر شخص بس پائینچے دھونے ہی میں لگا رہتا۔ یہ تمہیں وہم کا مرض ہے اور اس کا علاج بہت آسان ہے۔ وہ یہ کہ جن چیزوں کی وجہ سے آپ کو ناپاکی کی فکر لگی رہتی ہے ان کی ذرا بھی پروا نہ کرو، اور جب تمہارا شیطان یوں کہے کہ یہ چھینٹے ناپاک تھے، فلاں چیز ناپاک تھی تو شیطان سے کہا کہ: تو غلط کہتا ہے، میں تیری بات نہیں مانوں گی۔ اگر ایک مہینے تک آپ نے میرے کہنے پر عمل کرلیا تو اِن شاء اللہ تعالیٰ اس وہم کے مرض سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔

حقوقِ والدین یا اطاعتِ امیر؟

س…… میرا بڑا بیٹا بچپن سے ہی والد کے ساتھ مسجد جاتا رہا، مسجد ہی سے ایک دینی جماعت کے پروگرام سنتا رہا، ہم نے اسے ہمیشہ اچھے ماحول میں رہنے کی تعلیم دی۔ گانے ناچ اور دیگر فضولیات سے دُور رکھا۔ اس لئے وہ دینی جماعت کے بچوں کے رسائل لاتا رہا، ان کے ساتھ اچھے معلوماتی مقابلوں میں حصہ لیتا رہا۔ جب میٹرک کلاس میں گیا تو ہم نے کہا کہ اسکول کا کام پورا کیا کرو، تعلیم پر توجہ دو، مگر وہ کہتا کہ ہمارے ناظم نے فلاں وقت بلایا ہے، فلاں کام ہے۔ باپ صبح کے گئے رات کو آتے، اس نے تعلیم پر توجہ کم دی، نتیجہ یہ نکلا کہ بہت خراب نمبر سے پاس ہوا، مجبوراً ٹیکنیکل تعلیم دِلوائی، وہاں نوکری بھی لگ گئی، لیکن پروگراموں کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ زیادہ سمجھاتی تو کہتا کہ امیر کی اطاعت لازمی ہے، امیر کی اطاعت خدا کے رسولؐ کی اطاعت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نوکری جاتی رہی، تعلیم بھی ختم ہوگئی۔ گھر سے تعلق کا صرف اتنا حال ہے کہ بہن، بوڑھا باپ کام کرتے ہیں، میں سلائی کرتی ہوں، وہ آتا ہے، ہوٹل کی طرح کھا کر چلا جاتا ہے، بہن بھائیوں پر حکم چلاتا ہے، اسے غرض نہیں کہ کوئی بیمار ہے تو کون ہسپتال لے جارہا ہے؟ کس طرح خرچ چل رہا ہے؟ یہی دُھن دماغ میں ہے کہ جماعت سے نکلنا کفر ہے، امیر کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔

اس کے ساتھی بہت تعریف کرتے ہیں کہ ہر کام میں آگے آگے رہتا ہے، ہر پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے، لیکن حقیقت کوئی ہمارے دِل سے پوچھے، اس بگڑے ہوئے ماحول میں بچیوں سے سودے منگوانے پڑتے ہیں، خود بازار سے سامان اُٹھا کر لانا پڑتا ہے، ایک بچہ ہے وہ زیادہ تر کام کرتا ہے، پڑھنے کے ساتھ ساتھ کام کرکے ہمارے حوالے کردیتا ہے، خدا کے فضل سے نماز روزے کا پابند ہے، یہ آتے ہی اس پر حکم چلاتا ہے، اگر کسی کام کو کہا جائے تو کہتا ہے اس سے کراوٴ۔

چھوٹی بچیوں نے، ماں باپ نے رو رو کر دُعائیں مانگیں تو ایک عارضی نوکری ملی ہے، اس میں بھی یہی حال ہے، دس دن پروگراموں کی نظر ہیں، اب کسی کا استقبال ہے، اب کسی جگہ مظاہرہ ہے، کہیں کے لئے فنڈ اکٹھا کرنا ہے، کسی کو کتابیں دینی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

یہ صرف ایک بچے کا حال نہیں، اس میں بی اے، ایم اے اور دیگر تعلیم یافتہ بچے بھی شامل ہیں جو ذہنی مریض بن چکے ہیں، والدین اور امیر کی اطاعت کے درمیان ان کے ذہن اُلجھ کر رہ گئے ہیں، کبھی کبھی ان پر ترس بھی آتا ہے اور غصہ بھی۔

مولانا صاحب! آپ بتایئے کہ ہم جیسے سفید پوش لوگ جن کی جمع پونجی ایک مکان ہوتی ہے کیا وہ وراثت میں اس طرح کی اولاد کو حق دار بناسکتے ہیں؟ کیا شریعت میں ایسا کوئی قانون ہے کہ ہم اپنی زندگی میں ان کو مکان کی ملکیت سے عاق کرسکیں؟ کیونکہ جب ہماری زندگی میں ان کا رویہ ایسا ہے تو بعد میں تو چھوٹے بہن بھائیوں کا حق مار کر اپنی من مانی کرسکتے ہیں۔ کیا اسلام میں ایسا کوئی تصوّر موجود ہے کہ معاش کی جدوجہد نہ کرے، والدین اور عزیز و اقارب کے حقوق پورے نہ کرے، صرف امیر کی اطاعت کرے؟ اگر ایسا ہے تو ہم ضرور صبر کریں گے، اگر ایسے بچے وراثت کے حق دار ہیں تو ہم خدا کے رسول کی نافرمانی ہرگز نہ کریں گے۔

ج...... نوجوانوں کے مزاج میں جوشِ عمل ہوتا ہے، تجربہ محدود، ذہن ناپختہ، طبیعت میں شاخِ تازہ کی طرح لچک، ان کو کسی اچھے یا بُرے کام میں لگادینا بڑا آسان ہوتا ہے، اور جب ان کے ذہن میں کسی تحریک کی اچھائی بیٹھ جاتی ہے یا بٹھادی جاتی ہے تو وہ اس میں

نتائج وعواقب سے بے نیاز ہوکر منہمک ہوجاتے ہیں، اس کے خلاف نہ وہ والدین کی پروا کرتے ہیں، نہ کسی کی نصیحت پر کان دھرتے ہیں۔ اس لئے عام طور سے تمام تحریکوں کا نتیجہ شورشرابے کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ بہت سے نوجوان ان تحریکی سرگرمیوں کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں، بہت سے روزگار سے جاتے رہتے ہیں، بہت سے والدین سے باغی ہوکر اپنے عزیز واقارب اور والدین کے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ جوانی بھی جنون اور دیوانگی کا ایک شعبہ ہے۔ جب تک یہ نوجوان تحریکاتی جماعتوں کے سرگرم کارکن رہتے ہیں اس وقت تک ان پر دیوانگی کا دورہ رہتا ہے اور جب جنونِ شباب کا دور ختم ہوتا ہے اور عمر میں پختگی آتی ہے تب انہیں پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ ایسے نوجوان دورِ شباب ختم ہونے کے بعد ہمیشہ احساسِ محرومی کا شکار رہتے ہیں، ماں باپ کی بددُعائیں ہمیشہ کے لئے ان کے گلے کا ہار بن جاتی ہیں، اس طرح ان کی دُنیا بھی تباہ ہوجاتی ہے اور آخرت بھی برباد ہوجاتی ہے۔ میں سیاسی قائدین سے اِلتجا کرتا ہوں کہ وہ بھولے بھالے ناتجربہ کار نوجوانوں کو تحریکات کے الاؤ کا ایندھن نہ بنائیں۔ اور ان نوجوانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ والدین سے بغاوت کا راستہ اختیار کرکے کسی کا بُرا نہیں کرتے بلکہ خود اپنا مستقبل تاریک کرتے ہیں۔ ان کی دیوانہ وار تحریکی مصروفیات سے نہ ان کو کچھ ملتا ہے نہ ان کے والدین، اور نہ معاشرے کو۔ آج وطنِ عزیز میں جیسی بدامنی اور شر وفساد ہے، یہ انہی تحریکات کا ثمرۂ تلخ ہے۔ ہمارے جن نوجوانوں کو "کنتم خیر أمّة" کا تاج سر پر رکھ کر نوعِ انسانی کی بھلائی، امن وآشتی اور اسلامی اخوت ومحبت کے مبلغ ہونا چاہئے تھا، وہ ان تحریکات کے نتیجے میں گروہی عصبیت، نفرت وعداوت اور قتل وغارت کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائیں اور اپنے نبیٔ اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ہمارے نوجوانوں کو دینِ قیم پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائیں۔

آپ نے جو پوچھا ہے کہ کیا ان صاحبزادے کو عاق کردیں؟ میرا مشورہ یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہ کریں، کیونکہ اولاد کو جائیداد سے محروم کرنا شرعاً جائز نہیں۔ علاوہ ازیں کسی شخص کو اس سے بڑھ کر کیا سزا دی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے والدین کا نافرمان ہو، (اللہ تعالیٰ ہر

شخص کو اس سزا سے محفوظ رکھیں)، پھر اولاد خواہ کیسی بھی ہو والدین کو اس کے لئے خیر ہی مانگنی چاہئے۔ دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے صاحبزادے کو عقل و ایمان نصیب فرمائیں، اللہ تعالیٰ نے والدین کی شکل میں جو نعمت ان کو عطا فرمائی ہے اس کی قدر کرنے کی توفیق سے نوازیں۔

ہوائی جہاز کے عملے کے لئے سحری و اِفطاری کے اَحکام

س…… ہوائی جہاز کے عملے کے لئے ماہِ رمضان کے روزوں سے متعلق چند سوالات ہیں جن کی وضاحت مطلوب ہے۔ جس طرح ایک مضبوط عمارت کے لئے مضبوط بنیاد ضروری ہے اسی طرح ایمان کے لئے صحیح عقائد اور ان پر عمل ضروری ہے۔ اس ضمن میں علمائے راسخ ہی صحیح نمائندگی کرسکتے ہیں، آپ سے گزارش ہے کہ ان سوالات کے تفصیلی جوابات شریعت اور حنفی علمِ فقہ کی روشنی میں عنایت فرماکر مشکور کریں۔

ہوائی جہاز کے عملے کی مختلف قسم کی ڈیوٹی ہوتی ہے، ایک قسم کی ڈیوٹی کی نوعیت اس طرح کی ہے کہ وہ گھر پر ہی Stand by Duty رہتا ہے، اور اسی صورت میں ڈیوٹی پر چلا جاتا ہے، جبکہ دُوسرا عملہ جو ڈیوٹی پر جارہا تھا Operating Gew عین وقت پر بیمار ہوجائے یا اور کسی وجہ سے اپنی ڈیوٹی پر جانے سے قاصر ہے، ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اور زیادہ تر اس قسم کی ڈیوٹی والا Stand by Duty گھر ہی پر رہتا ہے، اس شکل میں اگر عملہ روزہ رکھنا چاہے تو وہ دیر سے دیر کب تک روزہ کی نیت کرسکتا ہے؟

ج…… رمضان کے روزے کی نیت نصف النہار شرعی سے پہلے کرلی جائے تو روزہ صحیح ہے، ورنہ صحیح نہیں۔ ابتدائے صبحِ صادق سے غروب تک کا وقت، اگر برابر دو حصوں میں تقسیم کردیا جائے تو اس کا عین وسط یعنی درمیانی حصہ "نصف النہار شرعی" کہلاتا ہے، اور یہ زوال سے قریباً پون گھنٹہ پہلے شروع ہوتا ہے۔ اگر روزہ رکھنا ہو تو روزہ کی نیت اس سے پہلے کرلینا ضروری ہے، اگر عین نصف النہار شرعی کے وقت نیت کی یا اس کے بعد نیت کی تو روزہ نہیں ہوگا۔

س…… نیت کرنے کے بعد اگر فلائیٹ پر جانا پڑے اور عملے نے روزہ توڑ دیا تو اس کا کیا کفارہ ادا کرنا ہوگا؟

ج…… کفارہ صرف اس صورت میں لازم آتا ہے جبکہ روزہ کی نیت رات میں یعنی صبحِ صادق سے پہلے کی ہو، اگر صبحِ صادق کے بعد اور نصف النہار شرعی سے پہلے روزے کی نیت کی تھی اور پھر روزہ توڑ دیا تو کفارہ لازم نہیں ہوگا۔ (درمختار، شامی)

س…… دو قسم کی فلائٹ ہوتی ہیں، ایک چھوٹی فلائٹ ہوتی ہے مثلاً کراچی سے لاہور یا اسلام آباد وغیرہ، اور واپسی کراچی، صبح جاکر دوپہر تک واپسی یا دوپہر جاکر رات میں واپسی۔ اور دُوسری فلائٹ لمبے دوران کی ہوتی ہے جو ملک سے باہر جاتی ہے، اس صورت میں عملے کو روزہ رکھنا مستحب ہے یا نہ رکھنا؟ زیادہ تر عملہ چھوٹی فلائٹ پر روزہ رکھنا چاہتا ہے۔

ج…… سفر کے دوران روزہ رکھنے سے اگر کوئی مشقت نہ ہو تو مسافر کے لئے روزہ رکھنا افضل ہے، اور اگر اپنی ذات کو یا اپنے رفقاء کو مشقت لاحق ہونے کا اندیشہ ہو تو روزہ نہ رکھنا افضل ہے۔

س…… ہوائی جہاز کا عملہ دو قسم کے مسافروں میں آتا ہے، دونوں قسم کا عملہ ڈیوٹی پر شمار ہوتا ہے، ایک قسم کا وہ عملہ ہے جس پر جہاز یا مسافروں کی ذمہ داری نہیں ہوتی، وہ سفر اس لئے کر رہا ہے کہ اسے آدھے راستے یا دو تہائی راستے پر اُتر کر ایک دو دن آرام کے بعد پھر جہاز آگے کی منزل کی طرف لے جانا ہے۔ دُوسری قسم کا عملہ وہ ہوتا ہے جس پر جہاز اور مسافروں کی ساری ذمہ داری ہوتی ہے، ان دو قسم کے عملے پر روزے کے کیا اَحکام ہیں؟

ج…… جس عملے پر جہاز اور اس کے مسافروں کی ذمہ داری ہے، اگر ان کو یہ اندیشہ ہو کہ روزہ رکھنے کی صورت میں ان سے اپنی ذمہ داری کے نبھانے میں خلل آئے گا تو ان کو روزہ نہیں رکھنا چاہئے، بلکہ دُوسرے وقت قضا رکھنی چاہئے، خصوصاً اگر روزہ کی وجہ سے جہاز اور اس کے مسافروں کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو تو ان کے لئے روزہ رکھنا ممنوع ہوگا۔ مثلاً: جہاز کے کپتان نے روزہ رکھا ہو اور اس کی وجہ سے جہاز کو کنٹرول کرنا مشکل ہوجائے۔

س…… سفر دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک سفر مغرب سے مشرق کی طرف، جس میں دن بہت چھوٹا ہے، جبکہ دُوسرے سفر میں جو مشرق سے مغرب کی طرف ہے اس میں دن بہت لمبا ہوجاتا ہے، سورج تقریباً جہاز کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور روزہ بیس بائیس گھنٹے کا ہوجاتا ہے، اس صورت میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ روزہ گھنٹوں کے حساب سے کھول لیتے ہیں، مثلاً پاکستان کے

حساب سے روزہ رکھا تھا اور پاکستان میں جب روزہ کھلا اسی حساب سے انہوں نے بھی روزہ کھول لیا۔ اس صورت میں بعض مرتبہ سورج بالکل اُوپر ہوتا ہے اور جس مقام سے جہاز گزر رہا ہوتا ہے وہاں ظہر کا وقت ہی ہوتا ہے، کیا اس طرح سے روزہ کھول لینا صحیح ہے؟

ج...... گھنٹوں کے حساب سے روزہ کھولنے کی جو صورت آپ نے لکھی ہے یہ صحیح نہیں ہے۔ اِفطار کے وقت روزہ دار جہاں موجود ہو وہاں کا غروب معتبر ہے، جو لوگ پاکستان سے روزہ رکھ کر چلیں ان کو پاکستان کے غروب کے مطابق روزہ کھولنے کی اجازت نہیں، جن لوگوں نے ایسا کیا ہے ان کے وہ روزے ٹوٹ گئے اور ان کے ذمہ ان کی قضا لازم ہے۔

س...... اُوپر کے استواء (Higher Latitudes) میں جہاں سورج ۲۰-۲۲ گھنٹے تک رہتا ہے یا اور اُوپر جانے سے چھ ماہ تک سورج غروب نہیں ہوتا اور اگلے چھ ماہ جہاں اندھیرا رہتا ہے وہاں کے لئے کیا اَحکامات ہیں نماز اور روزے کے بارے میں؟ اکثر لوگ ان جگہوں پر مدینہ منوّرہ یا مکہ معظّمہ کے اوقات کا اعتبار کرتے ہوئے نماز اور روزہ اختیار کرتے ہیں، کیا اس طرح کرنا دُرست ہے؟

ج...... مدینہ منوّرہ یا مکہ معظّمہ کے اوقات کا اعتبار کرنا تو بالکل غلط ہے۔ جن مقامات پر طلوع وغروب تو ہوتا ہے لیکن دن بہت لمبا اور رات بہت چھوٹی ہوتی ہے ان کو اپنے ملک کے صبحِ صادق سے غروبِ آفتاب تک روزہ رکھنا لازم ہے۔ البتہ ان میں جو لوگ ضعف کی وجہ سے اتنے طویل روزے کو برداشت نہیں کرسکتے وہ معتدل موسم میں قضا رکھ سکتے ہیں۔ ان علاقوں میں نماز کے اوقات بھی معمول کے مطابق ہوں گے۔ اور جن علاقوں میں طلوع و غروب ہی نہیں ہوتا، وہاں دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ وہ چوبیس گھنٹے میں گھڑی کے حساب سے نماز کے اوقات کا تعین کرلیا کریں اور اسی کے مطابق روزوں میں سحر اور اِفطار کا تعین کرلیا کریں۔ دُوسری صورت یہ ہے کہ وہاں سے قریب تر شہر جس میں طلوع وغروب معمول کے مطابق ہوتا ہے، اس کے اوقاتِ نماز اور اوقاتِ سحر و اِفطار پر عمل کیا کریں۔

س...... بعض حضرات درمیانی استواء (Mid Letitudes) میں بھی اپنی نمازیں اور روزہ مدینہ منوّرہ کی نمازوں اور روزہ کے اوقات کے ساتھ ادا کرتے ہیں، یہ کہاں تک دُرست ہے؟

ج……اُوپر معلوم ہوچکا ہے کہ ہر شہر کے لئے اس کے طلوع وغروب کا اعتبار ہے، نماز کے اوقات میں بھی اور روزہ کے لئے بھی۔ مدینہ منوّرہ کے اوقات پر نماز روزہ کرنا بالکل غلط ہے اور یہ نمازیں اور روزے ادا نہیں ہوئے۔

س……کراچی سے لاہور/اسلام آباد جاتے ہوئے گوکہ لاہور/اسلام آباد میں سورج غروب ہوچکا ہوتا ہے اور روزہ کھولا جارہا ہوتا ہے، مگر جہاز میں اُونچائی کی وجہ سے سورج نظر آتا رہتا ہے، اس صورت میں روزہ زمین کے وقت کے مطابق کھولا جائے یا کہ سورج جب تک جہاز سے غروب ہوتا ہوا نہ دیکھا جائے تب تک ملتوی کیا جائے؟

ج……پرواز کے دوران جہاز سے طلوع وغروب کے نظر آنے کا اعتبار ہے، پس اگر زمین پر سورج غروب ہوچکا ہو مگر جہاز کے اُفق سے غروب نہ ہوا ہو تو جہاز والوں کو روزہ کھولنے یا مغرب کی نماز پڑھنے کی اجازت نہ ہوگی، بلکہ جب جہاز کے اُفق سے غروب ہوگا تب اجازت ہوگی۔

س……دُوسری صورت میں جب عین روزہ کھلتے ہی اگر سفر شروع ہو تو جہاز کے کچھ اُونچائی پر جانے کے بعد پھر سے سورج نظر آنے لگتا ہے اور مسافروں میں بے چینی پیدا ہوجاتی ہے کہ روزہ گڑبڑ ہوگیا یا مکروہ ہوگیا، اس کے متعلق کیا اَحکام ہیں؟

ج……اگر زمین پر روزہ کھل جانے کے بعد پرواز شروع ہوئی اور بلندی پر جاکر سورج نظر آنے لگا تو روزہ مکمل ہوگیا۔ روزہ مکمل ہونے کے بعد سورج نظر آنے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص تیس روزے پورے کرکے اور عید کی نماز پڑھ کر پاکستان آیا تو دیکھا کہ یہاں رمضان ختم نہیں ہوا، اس کے ذمہ یہاں آکر روزہ رکھنا فرض نہیں ہوگا۔

س……اگر عملے نے سفر کے دوران یہ محسوس کیا کہ روزہ رکھنے سے ڈیوٹی میں خلل پڑ رہا ہے اور روزہ توڑ دیا تو اس کا کیا کفارہ ادا کرنا ہوگا؟

ج……اگر روزہ سے صحت متأثر ہو رہی ہو اور ڈیوٹی میں خلل آنے اور جہاز کے یا مسافروں کے متأثر ہونے کا اندیشہ ہو تو روزہ توڑ دیا جائے، اس کی صرف قضا لازم ہوگی، کفارہ لازم نہیں ہوگا، واللہ اعلم!

فہرست

تبلیغی جماعت پر اعتراضات کی حقیقت

س……امید ہے کہ آنجناب بعافیت ہوں گے، اور شب و روز دین کی عالی محنت میں ساعی و کوشاں ہوں گے، اللہ تعالیٰ اس پر تاحیات ثابت قدم رہنے کی توفیق عنایت فرمائیں۔(آمین)

یہ بات بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ آپ کی تصنیف و تحریر سے بندہ کے دل میں آنجناب کا جتنا احترام سمایا ہوا ہے شاید اتنا قدر و احترام اپنے والد کا بھی میرے دل میں نہیں ہوگا۔ میرا تعلق چونکہ تبلیغی جماعت کے ساتھ ہے اور تبلیغی جماعت کے بارے میں آپ کی آراء کئی دفعہ نظروں سے گزری ہے، جس میں آپ نے تبلیغی جماعت کی تائید بہت عقیدت مندی اور زبردست ولولے کے ساتھ کی تھی۔ چونکہ یہ کام ہمارا ایک مقصدی فریضہ ہے اگرچہ ہمیں اس کام کو شرحِ صدر کے ساتھ کرنا چاہئے محض تقلیدی طریقہ پر نہیں، لیکن پھر بھی علماء حضرات کی تائید اس پُرفتن دور میں بہت ضروری ہے اور بار بار ضروری ہے۔

اس سلسلے میں آپ سے استدعا یہ ہے کہ آج کل ایک جماعت پھرتی ہے، جن کی اچھی خاصی داڑھی بھی ہوتی ہے، یہ جماعت مختلف شہروں میں آکر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ نماز و روزہ اور اس قسم کے اچھے اعمال کی آواز لگاتے ہیں، مثلاً: جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، وغیرہ وغیرہ، اور ساتھ ہی رسالے بھی تقسیم کرتے ہیں، جس کا نام ''ضربِ حق'' رکھا ہے اور مصنف کا نام عتیق الرحمٰن گیلانی لکھا ہے۔ اس دفعہ یہ جماعت ہمارے شہر ضلع پشین کوئٹہ میں آئی تھی، اور ساتھ ہی بہت سے رسالے بھی لائے تھے، جلدی جلدی کچھ آوازیں لگاکر رسالے تقسیم کرکے فوراً شہر سے نکل گئے۔

ان رسالوں میں عجیب قسم کی خرافات اور بکواس لکھی ہوئی تھی، رسالے کے اکثر صفحوں پر بڑی بڑی سرخیاں قائم کرکے تبلیغی جماعت پر الزام لگائے تھے، ایک صفحے پر جس کی نقل آپ کے پاس بھیج رہا ہوں آپ کی کتاب ''عصرِ حاضر'' کا سہارا لے کر لکھا تھا کہ مفتی محمد یوسف لدھیانوی نے اس جماعت کو عالمگیر فتنہ قرار دیا ہے، اب تبلیغی جماعت کے اپنے اکابرین نے اس جماعت کو فتنہ قرار دینا شروع کردیا۔

گزارش یہ ہے کہ آپ کے بارے میں میرا سینہ بالکل صاف ہے، لیکن اُمت

کے سادہ لوح انسانوں کا اس فتنے میں پھنسنے کا شدید خطرہ ہے، اس لئے اخبار کے ذریعے اس جماعت کا دجل آشکارا کریں، اور ایک بار پھر تبلیغی جماعت کو اپنے زرّیں خیالات سے نوازنے کی زحمت فرماکر باطل فرقوں کی حوصلہ شکنی کریں، تاکہ ہمارے علاقے کے بلکہ پورے پاکستان کے سادہ لوح باشندے اس فتنے سے بچ جائیں۔

جواب جلد از جلد پوری تفصیل کے ساتھ مطلوب ہے۔

ج......مکرم و محترم! زید مجدہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ نے عتیق الرحمٰن گیلانی نام کے کسی شخص کا ذکر کیا ہے کہ اس نے تبلیغی جماعت کے خلاف پمفلٹ لکھے ہیں، اور ان میں کہا گیا ہے کہ اکابرین نے اس جماعت کو فتنہ قرار دیا ہے، اور یہ کہ اس کے معتقدین تبلیغی جماعت کو بدنام کرنے کے لئے مستقل مہم چلا رہے ہیں، اور بہت سے سادہ لوح لوگ ان سے متأثر ہو رہے ہیں، اس سلسلے میں چند امور لکھتا ہوں، بہت غور سے ان کو پڑھیں:

ا:......تبلیغ والوں کا جس مسجد میں گشت یا بیان ہوتا ہے، اس سے پہلے ان الفاظ میں اس کا اعلان کیا جاتا ہے:

> ''حضرات! ہماری اور سارے انسانوں کی کامیابی اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک طریقوں پر چلنے میں ہے، اس کے لئے ایک محنت کی ضرورت ہے، اس محنت کے سلسلے میں نماز کے بعد بات ہوگی، آپ سب حضرات تشریف رکھیں، اِن شاءاللہ بڑا نفع ہوگا۔''

یہ ہے دعوت و تبلیغ کی وہ ''محنت'' جو تبلیغی جماعت کا موضوع ہے، اور جس کا اعلان ہر مسجد میں ہوتا ہے۔

۲:......اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلانا یہ وہ پاک مقصد ہے جس کے لئے حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا، اور ان حضرات نے بغیر کسی اجر کے محض رضائے الٰہی کے لئے دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دیا، اس راستے میں ان کے سامنے

فہرست

مصائب ومشکلات کے پہاڑ آئے، انہیں ایذائیں دی گئیں، ان کی تحقیر کی گئی، انہیں ستایا گیا، ان کو گالیاں دی گئیں، انہیں دھمکایا اور ڈرایا گیا، لیکن ان کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی، بلکہ تمام تر مصائب ومشکلات کو ان حضرات نے محض رضائے الٰہی کے لئے برداشت کیا، اور اس کے لئے جان ومال اور عزت وآبرو کی کسی قربانی سے دریغ نہیں فرمایا۔ حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام کے جو حالات قرآن کریم اور احادیثِ شریفہ میں بیان فرمائے گئے ہیں، ان میں جہاں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ یہ حضرات ایمان ویقین، صبر واستقامت اور بلند ہمتی کے کتنے بلند مقام پر فائز تھے، وہاں یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ دعوت الی اللہ کا مقصد کس قدر عظیم الشان اور عالی مقصد ہے کہ اس مقصد کے لئے حضراتِ انبیاء کرام علیہم السلام نے فوق العادت قربانیاں پیش کیں۔

۳:...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت ختم کردیا گیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو نبوت ورسالت کے منصبِ رفیع پر فائز نہیں کیا جائے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے طفیل میں دعوت الی اللہ کا یہ کام، جس کے لئے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو کھڑا کیا گیا تھا، اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے سپرد کردیا گیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.“ (آل عمران:۱۰۴)

ترجمہ:...... ”اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کرنے کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے کامیاب ہوں گے۔“ (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

نیز ارشاد ہے:

”كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ

بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ.“

(آل عمران:۱۱۰)

ترجمہ:......”تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے، تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو۔“

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

ان آیاتِ شریفہ میں دعوت الی اللہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام امتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات) کے سپرد کر کے اسے ”خیرِ امت“ کا لقب دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کا ”خیرِ امت“ ہونا اسی مبارک کام کی وجہ سے ہے۔

۴:......ان آیاتِ شریفہ میں دعوت الی اللہ کا جو فریضہ امت کے سپرد کیا گیا ہے، الحمدللہ! کہ یہ امت اس فریضہ سے کبھی غافل نہیں ہوئی، بلکہ حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر آج تک اکابرِ امت اس مقدس خدمت کو بجالاتے رہے ہیں، اور دعوت الی اللہ کے خاص خاص شعبوں کے لئے افراد اور جماعتیں میدان میں آتی رہی ہیں، کبھی قتال و جہاد کے ذریعہ، کبھی وعظ و ارشاد کی شکل میں، کبھی درس و تدریس کی صورت میں، کبھی تصنیف و تالیف کے ذریعہ، کبھی مدارس اور خانقاہوں کے قیام کے طریقہ سے، کبھی اصلاح و ارشاد کے راستہ سے، کبھی قضا و افتا کے ذریعہ سے، کبھی باطل اور گمراہ فرقوں کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ کے ذریعہ، کبھی انفرادی طور پر، کبھی اجتماعی طور پر تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ، یہ سب کی سب دعوت الی اللہ ہی کی مختلف شکلیں اور اس کے مختلف شعبے ہیں۔ الحمدللہ! دعوت الی اللہ کا کوئی میدان ایسا نہیں جس کو امت نے خالی چھوڑ دیا ہو، اور کوئی شعبہ ایسا نہیں، جس میں کام کرنے والی ایک معتد بہ جماعت موجود نہ ہو، **فالحمدللہ علی ذالک!**

۵:......تبلیغی جماعت جس طرز پر دعوت الی اللہ کا کام کر رہی ہے، یہ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور طریقۂ سلف صالحینؒ کے عین مطابق ہے۔

حضرت اقدس مولانا شاہ محمد الیاس کاندھلوی ثم دہلویؒ، حضرت قطب الارشاد

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خادم، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنیؒ کے خلیفہ اور اپنے دور کے تمام اکابرِ امت کے معتمد اور منظورِ نظر تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ایک عمل سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، وہ ایمان واخلاص، زہد وتوکل، ایثار وہمدردی، صبر واستقامت، بلند نظری وبلند ہمتی اور اخلاق واوصاف میں فائق الاقران تھے، حق تعالیٰ شانہ نے ان سے دین کی دعوت وتبلیغ کا تجدیدی کام لیا، اور اللہ تعالیٰ نے مادّیت کے جدید طوفان کے مقابلے میں ان پر ''عمومی دعوت'' کا طریقہ منکشف فرمایا، اور انہوں نے ایک عام سے عام آدمی کو بھی دین کی دعوت کے کام میں لگایا، حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے وقت سے آج تک ''تبلیغی جماعت'' اسی نہج اور اسی نقشہ پر دعوت الی اللہ کا کام کر رہی ہے، اور الحمدللہ ثم الحمدللہ اس کے ذریعہ کروڑوں افراد کو حق تعالیٰ نے فسق وفجور کی تاریکیوں سے نکال کر شریعتِ مطہرہ کی پابندی اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق زندگی ڈھالنے کا جذبہ عطا فرمادیا ہے۔

۶:...... تبلیغی جماعت کے اس مبارک کام پر لوگوں کی طرف سے ناواقفی کی وجہ سے نکتہ چینیاں بھی ہوئیں، اس کے کام میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی، اور ان کو بدنام کرنے کے لئے افسانے بھی گھڑے گئے، لیکن یہ اللہ کا کام ہے، الحمدللہ! کہ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں سے اپنے دین کی دعوت کا کام لے رہا ہے، اور حق تعالیٰ شانہ کی رحمت وعنایت سے قوی امید ہے کہ وہ اپنے بندوں کو اس کام کے لئے کھڑا کرتے رہیں گے۔

۷:...... اس ناکارہ کو ایک عرصہ تک تبلیغی اسفار میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، اور اکابرِ تبلیغ کی نجی سے نجی محفلوں میں بیٹھنے اور ان کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے، حق تعالیٰ شانہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس ناکارہ کو اس سلسلے میں جس قدر قریب سے قریب ہونے کا موقع ملا ہے، اسی قدر اس کام کی افادیت اور اس کام میں لگنے والے حضرات کی حقانیت اس ناکارہ پر کھلتی گئی ہے، اس لئے یہ ناکارہ کامل انشراح اور پوری بصیرت کے ساتھ یہ اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ تبلیغی جماعت کا کام نہایت مبارک ہے،

اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات) کی نشأۃ ثانیہ کا ذریعہ ہے، اور تمام مسلمان بھائیوں کا اس بابرکت کام میں لگنا دنیا و آخرت کی سعادتوں کا ذریعہ ہے، حق تعالیٰ شانہٗ ہمیں اپنی رضا و محبت نصیب فرمائیں اور دنیا و آخرت میں اپنے مقبول بندوں کی رفاقت و معیت نصیب فرمائیں۔

کیا رُؤیتِ ہلال میں فلکیات پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟

س...... ''رُؤیتِ ہلال کا مسئلہ'' کے عنوان سے مولانا محمد جعفر پھلواری کا ایک مضمون اپریل ۱۹۶۷ء کے ماہنامہ ''ثقافت'' لاہور میں چھپا تھا، جسے اب ابتدائی تعارفی نوٹ کے اضافے کے ساتھ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور، نے کتابچے کی شکل میں ''رُؤیتِ ہلال'' کے نام سے شائع کیا ہے۔ کیا آنجناب کے نزدیک پھلواری صاحب کی تحقیق لائقِ اعتماد ہے؟ نیز یہ کہ رُؤیتِ ہلال کے بارے میں ان کے موقف سے اتفاق کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ مدلل تحریر کریں۔

ج...... مولانا موصوف کے رُؤیتِ ہلال کے موقف اور ان کے استدلال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آپ کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔

موصوف کے اس کتابچے کا موضوع یہ بتانا ہے کہ ''رُؤیتِ ہلال کا حکم فنِ فلکیات پر اعتماد کرنے سے بھی پورا ہوسکتا ہے۔''

موصوف نے اپنی بحث کا آغاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی سے کیا ہے:

''صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته فان غم عليكم فاقدروا له.'' (رواه الستة الا الترمذی)

ترجمہ:...... ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر اِفطار (عید) کرو، اگر مطلع غبار آلود ہو تو اس کا اندازہ کرلو۔''

موصوف کا خیال ہے کہ ''یہاں اگر ''رُؤیت'' کے معنی کی وضاحت ہوجائے تو مسئلہ بڑی حد تک صاف ہوسکتا ہے۔'' چنانچہ وہ المنجد، اقرب الموارد، البستان، القاموس،

لسان العرب، منتہی الارب اور مفرداتِ راغب وغیرہ کے حوالوں سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

''اس میں شک نہیں کہ رُؤیت کے حقیقی معنی چشمِ سر ہی سے دیکھنے کے ہیں، لیکن دُوسرے مجازی معنوں میں بھی اس کا استعمال کثرت سے ہوا ہے ..... اس لئے گویا رُؤیت کے معنی ہیں ''علم ہوجانا''، چنانچہ کوئی تیس چالیس جگہ قرآن میں بھی لفظِ رُؤیت کا استعمال حقیقی معنی کے علاوہ مجازی معنوں میں ہوا ہے۔''

اس لئے فاضل مؤلف کے نزدیک ''رُؤیتِ ہلال کو چشمِ سر کے ساتھ مخصوص کردینے کی کوئی معقول وجہ معلوم نہیں ہوتی'' بلکہ ان کی رائے میں: ''فنِ فلکیات پر اعتماد کرکے بھی وہ اپنا ایمان بالکل محفوظ کرسکتے ہیں۔''

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر رُؤیتِ ہلال کو چشمِ سر کے ساتھ مخصوص کردینا موصوف کے نزدیک ''غیرمعقول'' ہے، تو کیا یہ طرزِ فکر معقول کہلائے گا کہ ایک شخص لغت کی کتابیں کھول کر بیٹھ جائے اور یہ دعویٰ کرے کہ چونکہ فلاں لفظ حقیقی معنی کے علاوہ متعدّد مجازی معنوں کے لئے بھی آتا ہے اس لئے عرفاً و شرعاً اس کے جو حقیقی معنی مراد لئے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں بلکہ ''غیرمعقول'' ہیں، مثلاً: ''ضرب'' کا لفظ لغت کے مطابق کوئی پچاس ساٹھ معنوں کے لئے آتا ہے، اس لئے ''ضرب زید عمروا'' کے جملے سے عرفِ عام میں جو معنی لئے جاتے ہیں (یعنی زید نے عمرو کو مارا) وہ غیرمعقول اور غلط ہیں۔ کیا اسے صحت مندانہ استدلال کہا جاسکتا ہے؟ اور کیا یہ اندازِ فکر اور طرزِ استدلال اہم ترین مسائل کے صحیح حل کی طرف راہ نمائی کرسکتا ہے؟ اس بات سے کس کو انکار ہے کہ رُؤیت کا لفظ حقیقی معنی کے علاوہ مختلف قرائن کی مدد سے، دُوسرے مجازی معنوں میں بھی کبھی بولا جاتا ہے، مگر رُؤیتِ ہلال کی احادیث میں یہ لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ اس کے لئے لغت کی کتابوں کا بوجھ لادنے کے بجائے سب سے پہلے تو اس سلسلے کی تمام احادیث کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنا چاہئے تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کس سیاق میں؟ کس معنی کے لئے استعمال فرمایا ہے؟ پھر یہ دیکھنا تھا کہ صحابہؓ، تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ نے اس سے کون

فہرست

سے معنی سمجھے ہیں؟ اُمتِ اسلامیہ نے قرناً بعد قرنٍ اس سے کیا مراد لی ہے؟ اور عرفِ عام میں ''چاند دیکھنے'' کے کیا معنی سمجھے جاتے ہیں؟

لغت سے استفادہ کوئی شجرۂ ممنوعہ نہیں، بلکہ بڑی اچھی بات ہے، کسی زبان کی مشکلات میں لغت ہی سے مدد لی جاتی ہے، اور کسی غیر معروف لفظ کی تحقیق کے لئے ہر شخص کو ہر وقت ڈکشنری کھولنے کا حق حاصل ہے، لیکن جو الفاظ ہر عام و خاص کی زبان پر ہوں، ان کے معنی عامی سے عامی شخص بھی جانتا ہو، اور روزمرّہ کی بول چال میں لوگ سینکڑوں بار انہیں استعمال کرتے ہوں، ان کے لئے ڈکشنری کے حوالے تلاش کرنا کوئی مفید کام نہیں بلکہ شاید اہلِ عقل کے نزدیک اسے بے معنی مشغلہ، بے سود کاوش اور ایک لغو حرکت کا نام دیا جائے، اور اگر کوئی دانشمند لغت بینی کے شوق میں لغت کے مجازی معنوں کی منطق سے شرعی اور عرفی معنوں کو غیر معقول قرار دینے لگے تو ایسے شخص کے لئے بھی ڈکشنری میں جو لفظ وضع کیا گیا ہے اس سے بھی سب واقف ہیں۔

تاہم اگر رُؤیت جیسے معروف اور بدیہی لفظ کے لئے ''کتاب کھولنے'' کی ضرورت و افادیت کو تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس کی کیا توجیہ کی جاسکتی ہے کہ رُؤیت کا ''ست'' نکالتے وقت فاضل مؤلف نے لغت سے بھی صحیح استفادہ نہیں کیا، نہ ان قواعد کو ملحوظ رکھنا ضروری سمجھا جو ائمۂ لغت نے ''رُؤیت'' کے مواقعِ استعمال کے سلسلے میں ذکر کئے ہیں۔ کیونکہ موصوف نے لغت کی مدد سے رُؤیت کا ست یہ نکالا ہے کہ: ''گویا رُؤیت کے معنی ہیں علم ہوجانا۔'' گویا اہلِ لغت نے اس کے معانی اور ان کے مواقعِ استعمال کے تفصیلی بیان کی جو سردردی مول لی ہے وہ سب فضلہ ہے۔ خلاصہ، مغز اور ''ست'' صرف اتنا برآمد ہوا ہے کہ: ''رُؤیت کے معنی ہیں علم ہوجانا'' جبکہ وہ ان ہی کتابوں میں موجود ہیں جن کا حوالہ موصوف نے دیا ہے، مثلاً: لفظِ ''رُؤیت'' مفعولِ واحد کی طرف متعدی ہو تو وہاں عینی رُؤیت یعنی سر کی آنکھوں سے دیکھنا مراد ہوتا ہے، اور جب دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو تو اس کے معنی ہوں گے جاننا، معلوم کرنا۔ چنانچہ صحاحِ جوہری، تاج العروس اور لسان العرب میں ہے:

''الرؤية بالعين تتعدى الى مفعول واحد

وبمعنی العلم تتعدی الٰی مفعولین.“

(الصحاح للجوهری ج:٦ ص:٢٣٤٨، تاج العروس للزبیدی ج:١٠ ص:١٣٩، لسان العرب لابن منظور الأفریقی مادّة: رای)

ترجمہ:...... ”اگر رُؤیت سے مراد رُؤیت بالعین ہو تو رُؤیت ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے، اور اگر رُؤیت بمعنی علم کے ہو تو وہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا۔“

اسی طرح منتہی الارب میں ہے:

”رُؤیت: دیدن بچشم، واین متعدی بیک مفعول است، ودانستن، واین متعدی بدو مفعول۔“

(منتہی الارب ص:٦٢٤، عبدالرحیم بن عبدالکریم صفی پوری)

صراح میں ہے:

”رای رؤیة: دیدن بچشم متعدالیٰ مفعول ودانستن متعدالیٰ مفعولین۔“ (الصراح من الصحاح ص:٥٥٩)

یا یہ کہ رُؤیت کا متعلق کوئی محسوس اور مشاہد چیز ہو تو وہاں حسی رُؤیت مراد ہوگی، یعنی بچشمِ سر دیکھنا، اور جب اس کا متعلق کوئی سامنے کی چیز نہ ہو تو وہاں وہمی، خیالی یا عقلی رُؤیت مراد ہوگی، چنانچہ امام راغب اصفہانیؒ کی ”المفردات فی غریب القراٰن“ میں ہے:

”ذٰلک الضرب بحسب قوی النفس الاولی بالحاسة وما یجری مجراها .... الخ.“

عجیب اتفاق ہے کہ یہ عبارت فاضل مؤلف نے بھی نقل کی ہے، مگر شاید عجلت میں اسے سمجھنے یا اس تفصیل کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

یا یہ کہ ”رای“ کے مادّہ سے مصدر جب ”رؤیة“ آئے تو اس کے معنی ہوں گے: ”آنکھوں سے دیکھنا“، اور اگر ”رای“ آئے تو اس کے معنی ہوں گے: ”دِل سے دیکھنا اور جاننا“۔ اور اگر ”رؤیـــا“ آئے تو عموماً اس کے معنی ہوں گے: ”خواب میں دیکھنا“ اور کبھی

''بیداری کی آنکھوں سے دیکھنا'' چنانچہ اساس البلاغہ میں ہے:

"رای رایتہ یعنی رؤیة، ورایتہ فی المنام رؤیا، ورایتہ رای العین، فارایتہ اراءة ورایت الھلال، فترائینا الھلال .... ومن المجاز فلان یری الفلان رایا."

(اساس البلاغہ ص:۳۱۱، لجار اللہ ابوالقاسم محمود بن عمر الزمخشری)

ترجمہ:......''رای، رایتہ کے معنی دیکھنے کے آتے ہیں جیسے (ورئیتہ فی المنام رؤیا) میں نے اس کو نیند میں دیکھا، اور (رایتہ رای العین) میں نے اس کو آنکھ سے دیکھا، اور (فارایتہ اراءة) میں نے اس کو دِکھلایا دِکھلانا، (ورایت الھلال) اور میں نے چاند کو دیکھا، (فترایینا الھلال) ہم نے دُوسرے کو چاند دِکھلایا۔ اور مجازاً کہا جاتا ہے کہ: فلاں نے فلاں کو خواب میں دیکھا۔''

ممکن ہے مواقعِ استعمال کے یہ قواعد کلیہ نہ ہوں، لیکن عربیت کا صحیح ذوق شاہد ہے کہ یہ اکثر و بیشتر صحیح ہیں۔ یوں بھی فنی قواعد عموماً کلی نہیں، اکثری ہی ہوتے ہیں۔ ان تینوں قواعد کے مطابق ''رُؤیتِ ہلال'' کے معنی سر کی آنکھوں سے چاند دیکھنا بنتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جن ائمۂ لغت نے حقیقی اور مجازی معنوں کو الگ الگ ذکر کرنے کا التزام کیا ہے انہوں نے رُؤیتِ ہلال کو حقیقی معنی یعنی چشمِ سر سے دیکھنے کے تحت درج کیا ہے۔

اسی طرح جن حضرات نے ''فروقِ الفاظ'' کا اہتمام کیا ہے انہوں نے تصریح کی ہے کہ ''رُؤیتِ ہلال'' اور ''تبصر'' کے معنی ہیں چاند دیکھنے کے لئے اُفقِ ہلال کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنا، جیسا کہ فقہ اللغہ میں ہے:

"فان نظر الٰی أفق الھلال للیلة لیراہ قیل مبصر." (فقه اللغة ص:۱۰۴، للامام ابو منصور عبدالملک بن محمد الثعالبی)

ترجمہ:......''اگر کوئی آدمی رات کو اُفقِ ہلال کی طرف چاند دیکھنے کے لئے نظر اُٹھا کر دیکھے تو بھی کہا جاتا ہے کہ وہ آدمی چاند کو دیکھنے والا ہے۔''

فاضل مؤلف کے علم و تفقہ کے پیشِ نظر ان کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں کی جاسکتی کہ یہ تمام اُمور ان کی نظر سے نہیں گزرے ہوں گے، یا یہ کہ وہ ائمہٴ لغت کی صحیح مراد سمجھنے سے قاصر رہے ہوں گے، مگر حیرت ہے کہ موصوف ان تمام چیزوں سے آنکھیں بند کرکے اس ادھوری بات کو لے اُڑے کہ ''رُویت کا لفظ چونکہ متعدّد معانی کے لئے آتا ہے، لہٰذا رُویتِ ہلال کو چشمِ سر سے مخصوص کردینا غیرمعقول ہے''۔ جو حضرات کسی موضوع پر تحقیق کے لئے قلم اُٹھائیں اور اتنے بڑے پندار کے ساتھ کہ ''ہم کسی رائے کو، خواہ وہ اپنی ہو یا قدمائے اہلِ علم کی، حرفِ آخر نہیں سمجھتے'' ان کی طرف سے کم نظری، تساہل پسندی یا پھر مطلب پرستی کا یہ مظاہرہ بڑا ہی افسوس ناک اور تکلیف دہ ہے، جب ''رُویت'' جیسے بدیہی اور ''چشم دید'' اُمور میں ہمارے نئے محققین کا یہ حال ہو تو عملی، نظری اور پیچیدہ مباحث میں ان سے دقیقہ رسی، بالغ نظری اور اصابتِ رائے کی توقع ہی عبث ہے۔

یہ تو خیر ائمہٴ لغت کی تصریحات تھیں، دِلچسپ بات یہ ہے کہ خود ماہرینِ فلکیات، جن کے قول پر اعتماد کرنا فاضل مؤلف کے نزدیک حفاظتِ ایمان کا ذریعہ ہے، ان کے یہاں بھی رُویتِ ہلال کے معنی سر کی آنکھوں سے دیکھنا ہی آتے ہیں، مزید یہ کہ ان کے یہاں اس رُویت کے دو درجے ہیں، ۱:- طبعی، ۲:- ارادی۔ اگر ہلال، اُفق سے اتنی بلندی پر ہو کہ وہ بلاتکلف دیکھا جاسکے اسے وہ ''طبعی رُویت'' قرار دیتے ہیں، اور اگر اتنی بلندی پر نہ ہو بلکہ اتنا نیچے اور باریک ہو کہ اعلیٰ قسم کی دُوربینوں کے بغیر اس کا دیکھنا ممکن نہ ہو اسے ''رُویتِ ارادی'' کا نام دیا جاتا ہے، فلکیات کی تصریح کے مطابق قابلِ اعتبار طبعی رُویت ہے نہ کہ ارادی، مجلّہ اسلامیہ بہاول پور میں ہے:

> ''مراد از رُویت طبعی است، نہ ارادہ کہ بتوسط منظارہائے جیدہ بہ بیند، چہ دریں حالت ہلال قبل از انکہ بحد رُویت رسیدہ باشد، دیدہ مے شود۔'' (زیچ بہادر خانی باب ہفتم در رُویتِ ہلال ص:۵۵۶، طبع بنارس ۱۸۵۸ء بحوالہ سہ ماہی مجلّہ جامعہ اسلامیہ بہاول پوری، اپریل ۱۹۶۸ء ص:۵۱، مقالہ مولانا عبدالرشید نعمانی، و ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ مارچ ۱۹۶۳ء ص:۱۸۸)

ترجمہ:...... ''رُؤیتِ ہلال سے مراد طبعی رُؤیت ہے نہ کہ رُؤیتِ ارادی کہ اعلیٰ قسم کی دُوربینوں کے ذریعہ ہلال کو دیکھا جائے کیونکہ اس حالت میں تو ہلال کو اس کے حدِ رُؤیت پر پہنچنے سے قبل بھی دیکھا جاسکتا ہے۔''

اور حضراتِ فقہائے کرامؒ جو شریعتِ اسلامیہ کے حقیقی ترجمان ہیں، وہ بھی اسی پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: ''صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته'' میں رُؤیتِ حسی یعنی سر کی آنکھوں سے دیکھنا ہی مراد ہے، ''بداية المجتهد'' میں ہے:

''فان النبی صلی الله عليه وسلم قد أوجب الصوم والفطر للرؤية، والرؤية انما يكون بالحس، ولو لا الاجماع على الصيام بالخبر على الرؤية لبعد وجوب الصوم بالخبر بظاهر هٰذا الحديث.''

(بداية المجتهد لابن رشد ص:۲۸۵)

ترجمہ:...... ''حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صوم اور فطر کو رُؤیت کے ساتھ خاص کیا ہے اور رُؤیت صرف آنکھ ہی کے ذریعہ سے ہوسکتی ہے، اور اگر روزوں کے لئے رُؤیت پر حدیث پاک کے ساتھ ساتھ اُمت کا اجماع ثابت نہ ہوتا تو صرف خبر کے ساتھ روزوں کو واجب کرنا (اس حدیث کے ظاہر کی بنیاد پر) مشکل ہوتا۔''

اور اسی پر تمام مسلمانوں کا اجماع و اتفاق ہے، جیسا کہ ''اَحکام القرآن'' میں ہے:

''قال أبوبكر: قول رسول الله صلى الله عليه وسلم: ''صوموا لرؤيته'' موافق لقوله تعالٰى: ''يسئلونک عن الأهلة، قل هی مواقيت للناس والحج'' واتفق المسلمون علٰى أن معنى الأية والخبر فی اعتبار رؤية الهلال فی صوم رمضان، فدل ذٰلک علٰى أن رؤية الهلال هی شهود الشهر.''

(احکام القرآن لابی بکر الجصاص ج:۱ ص:۲۰۱ طبع ۱۳۳۵ھ

ترجمہ:...... ''ابوبکر کہتے ہیں کہ: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ: "صوموا لرؤیته" یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول: "یسئلونک عن الأهلة قل هی مواقیت للناس والحج" کے موافق ہے، اور مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آیت اور حدیث رمضان کے روزوں سے رُؤیتِ ہلال کے متعلق ہے، تو یہ قول بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رُؤیتِ ہلال سے مراد مہینے کا موجود ہونا ہے۔''

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ''رُؤیتِ ہلال'' کے معنی سر کی آنکھوں سے دیکھنا، قطعی طور پر متعین ہیں، اس میں کسی قسم کے شک و شبہ اور تردّد کی گنجائش نہیں، یہی معنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد سے آج تک لئے جاتے رہے ہیں، یہی ائمۂ لغت کی تصریحات سے میل کھاتے ہیں، یہی فلکیات کی اصطلاح کے مطابق ہیں، یہی معنی مزاج شناسانِ نبوّت - فقہائے کرامؒ - نے حدیث سے سمجھے ہیں، اور چودہ صدیوں کی اُمتِ مسلمہ بھی اسی پر متفق ہے۔ مگر فاضل مؤلف کے کمال کی داد دیجئے کہ وہ ڈکشنری کی ناقص، ادھوری اور ہلکی پھونک سے آسمان و زمین کی ہر چیز کو اُڑا دینا چاہتے ہیں۔ کاش! فاضل مؤلف سے یہ عرض کیا جاسکتا، طنز و تشنیع کے طور پر نہیں بلکہ محض دینی خیرخواہی، اسلامی اخوت اور اِخلاص کے طور پر، کہ آپ نے اس مقام پر جو آسان راستہ اختیار کیا ہے، یعنی لغت کھول کر کسی لفظ کے متعدّد معانی نکالو، اور پھر بلاتکلف اس لفظ کے شرعی معنی کو مشکوک کر ڈالو، یہ راستہ جتنا آسان اور مختصر ہے، اس سے کہیں زیادہ پُرخطر بھی ہے، کیونکہ یہ تحقیق و اِجتہاد کی طرف نہیں بلکہ - گستاخی معاف - سیدھا تلبیس و اِلحاد کی طرف جاتا ہے۔ اُمتِ مسلمہ میں خدانہ کردہ اسی کی چلت ہوجائے تو ملاحدہ کی جماعت اسی غلط منطق سے صوم و صلوٰۃ، حج، زکوٰۃ اور تمام اصطلاحاتِ شرعیہ کو مسخ کرسکتی ہے، کہا جاسکتا ہے کہ ''صلوٰۃ'' کے معنی لغت میں یہ یہ آتے ہیں، لہٰذا ارکانِ مخصوصہ کے ساتھ اسے خاص کردینا غیرمعقول ہے، وقس علیٰ ہٰذا، اس سے ظاہر ہے کہ اس کا انجام دُنیا میں امن و اصلاح نہیں، انتشار اور فساد ہوگا، اور آخرت میں دارالقرار نہیں، دارالبوار ہوگا، اللہ تعالیٰ اہلیت دیں تو اِجتہاد ضرور کیجئے!

مگر خدا کے لئے پہلے اِجتہاد اور اِلحاد کے درمیان اچھی طرح سے فرق کرلیجئے! تحقیق نئی ہو یا پُرانی، اس کا حق مُسلَّم! لیکن، خدارا تحقیق اور تلبیس دونوں کے حدود کو جدا جدا رکھئے۔

رُؤیتِ ہلال کی احادیث حضرات عمر، علی، ابنِ مسعود، عائشہ، ابوہریرہ، جابر بن عبداللہ، براء بن عازب، حذیفہ بن الیمان، سمرۃ بن جندب، ابوبکرہ، طلق بن علی، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، رافع بن خدیج وغیرہم صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی روایت سے حدیث کے مستند مجموعوں میں موجود ہیں، جنھیں اس مسئلے میں کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے کے لئے پیشِ نظر رکھنا ضروری تھا، مگر موصوف نے اپنے خاص مقصد کا پردہ رکھنے کے لئے ان سے استفادہ کی ضرورت نہیں سمجھی، صرف ایک روایت کے جس کے آخری جملے میں قدرے اجمال پایا جاتا ہے، نقل کرکے فوراً لغت کا رُخ کرلیا۔ آیئے! چند روایات پر نظر ڈالیں اور پھر دیکھیں کہ صحابہؓ و تابعینؒ اور فقہائے مجتہدینؒ نے ان سے کیا سمجھا ہے؟ صحیحین میں ہے:

۱:...... ”عن عبدالله بن عمر (رضی الله عنهما) ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الشهر تسع وعشرون ليلة، فلا تصوموا حتى تروه، فان غم عليكم فأكملوا العدة ثلاثين.“ (متفق علیہ، مشکوٰۃ ص:۱۷۴)

ترجمہ:...... ”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مہینہ اُنتیس کا بھی ہوتا ہے، مگر تم ”چاند دیکھے بغیر“ روزہ نہ رکھا کرو، اور اگر (اُنتیس کا) چاند اَبر یا غبار کی وجہ سے نظر نہ آئے تو تیس کی گنتی پوری کرلیا کرو۔“

۲:...... ”عن عبدالله بن عمر رضی الله عنهما ان رسول الله صلى الله عليه وسلم ذكر رمضان، فقال: لا تصوموا حتى تروا الهلال، ولا تفطروا حتى تروه، فان غم عليكم فاقدروا له.“ (متفق علیہ مشکوٰۃ ص:۱۷۴)

ترجمہ:...... ”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت

ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا: (اُنتیس کا) چاند دیکھے بغیر نہ روزے رکھنا شروع کرو اور نہ چاند دیکھے بغیر روزے موقوف کرو، اور اَبر یا غبار کی وجہ سے نظر نہ آئے تو اس کے لئے (تیس دن کا) اندازہ رکھو۔“

۳:......”**كتب عمر بن عبدالعزيز (رضى الله عنه) الٰى أهل البصرة بلغنا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ..... نحو حديث ابن عمر عن النبى صلى الله عليه وسلم زاد: وان أحسن ما يقدر لهٗ اذ رأينا هلال شعبان لكذا و كذا فالصوم ان شاء الله لكذا و كذا الا ان يروا الهلال قبل ذٰلك.**“ (ابوداؤد ص:۳۱۸)

ترجمہ:......”خلیفۂ راشد عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اہلِ بصرہ کو خط لکھا کہ: ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پہنچی ہے۔ یہاں اسی مذکورہ بالا حدیثِ ابنِ عمرؓ کا مضمون ذکر کیا اور اتنا اضافہ کیا: اور بہترین اندازہ یہ ہے کہ ہم نے شعبان کا چاند فلاں دن دیکھا تھا، اس لئے (تیس تاریخ کے حساب سے) روزہ اِن شاء اللہ فلاں دن ہوگا، ہاں! چاند اس سے پہلے (اُنتیس کو) نظر آجائے تو دُوسری بات ہے۔“

۴:......”**حدثنا حسين بن الحارث الجدلى ..... ان أمير مكة خطب ثم قال: عهد الينا رسول الله صلى الله عليه وسلم ان ننسك الرؤية فان لم نره وشهد شاهدا عدل نسكنا بشهادتها ..... ان فيكم من هو أعلم بالله ورسوله منّى، وشهد هٰذا من رسول الله صلى الله عليه وسلم واومأ بيده الٰى رجل قال الحسين: فقلت لشيخ الٰى جنبى: من هٰذا الذى اومأ اليه الأمير؟ قال: هٰذا**

فہرست

عبدالله بن عمر وصدق كان أعلم بالله منه، فقال: بذٰلك أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم.“ (ابوداؤد ج:۱ ص:۳۱۹)

ترجمہ:...... ”حسین بن حارث جدلی فرماتے ہیں: امیرِ مکہ نے خطبہ دیا، پھر فرمایا کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تاکیداً یہ حکم دیا تھا کہ ہم عید، بقرعید صرف چاند دیکھ کر کیا کریں، اور اگر (اَبر یا غبار کی وجہ سے) ہم نہ دیکھ سکیں (یعنی رُؤیتِ عامہ نہ ہو) مگر دو معتبر اور عادل گواہ رُؤیت کی شہادت دیں، تو ہم ان کی شہادت پر عید، بقرعید کرلیا کریں، اور ایک صاحب جو حاضرِ مجلس تھے، ان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: آپ کی اس مجلس میں یہ صاحب موجود ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اَحکام مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکمِ الٰہی میں نے ذکر کیا ہے یہ اس کے گواہ ہیں۔ حارث کہتے ہیں: میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک بزرگ سے دریافت کیا کہ: یہ کون صاحب ہیں جن کی طرف امیر صاحب نے اشارہ کیا؟ کہا کہ: یہ عبداللہ بن عمرؓ ہیں، اور امیر صاحب نے صحیح کہا تھا، یہ واقعی خدا و رسول کے اَحکام کے بڑے عالم تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اسی کا حکم فرمایا ہے۔“

۵:...... **”عن ابن عمر رضى الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: جعل الله الأهلة مواقيت للناس، فصوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته فان غم عليكم فعدوا ثلاثين يوما.“** (رواه الطبرانى كما فى تفسير ابن كثير ج:۱ ص:۳۲۵، دار احياء الكتب العربية مصر، وأخرجه الحاكم فى المستدرك بمعناه وقال: صحيح الاسناد، وأقره عليه الذهبى)

ترجمہ:...... ”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے

فہرست

روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہلالوں (نئے چاند) کو لوگوں کے لئے اوقات کی تعیین کا ذریعہ بنایا ہے، پس چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر اِفطار کرو، اور اگر مطلع اَبر آلود ہو تو تیس دن شمار کرلو۔“

۶:...... ”عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته فان حال بينكم وبين منظره سحاب أو قترة فعدوا ثلاثين.“ (احکام القرآن للجصاص ج:۱ ص:۲۰۱)

ترجمہ:...... ”حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی اِفطار کرو، اور اگر تمہارے اور اس کے نظر آنے کے درمیان اَبر یا سیاہی حائل ہو جائے تو تیس دن شمار کرلو۔“

۷:...... ”عن ابن عباس رضی الله عنهما ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: صوموا رمضان لرؤيته فان حال بينكم غمامة أو ضبابة فأكملوا عدة شهر شعبان ثلاثين ولا تستقبلوا رمضان بصوم يوم من شعبان.“ (احکام القرآن ج:۱ ص:۲۰۲)

ترجمہ:...... ”حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رمضان کا روزہ چاند دیکھ کر رکھا کرو، پھر اگر تمہارے درمیان اَبر یا دُھند حائل ہو جائے تو ماہ شعبان کی گنتی تیس دن پوری کرلو، اور رمضان کے استقبال میں شعبان ہی کے دن کا روزہ شروع نہ کردیا کرو۔“

۸:...... ”عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تصوموا قبل

رمضان، صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فان حالت دونهٔ غيابة فأكملوا ثلاثين يوما.'' (ترمذی ج:۱ ص:۸۷)

ترجمہ:...... ''حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رمضان سے پہلے ہی روزہ شروع نہ کردیا کرو، بلکہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو، اور چاند دیکھ کر روزہ اِفطار کرو، اور اگر اس کے دیکھنے میں اَبر حائل ہوجائے تو تیس دن پورے کرلیا کرو۔''

۹:...... ''عن أبى البخترى قال: خرجنا للعمرة فلما نزلنا ببطن نخلة ترآئينا الهلال فقال بعض القوم: هو ابن ثلاث، وقال بعض القوم: هو ابن ليلتين، فلقينا ابن عباس (رضى الله عنهما) فقلنا: انا رآئينا الهلال فقال بعض القوم: هو ابن ثلاث، وقال بعض القوم: هو ابن ليلتين. فقال: أى ليلة رأيتموه؟ قلنا: ليلة كذا وكذا، فقال: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم مده للرؤية فهو لليلة رأيتموه. وفى رواية عنه: قال: أهللنا رمضان ونحن بذات عرق فأرسلنا رجلًا الى ابن عباس يسأله، فقال ابن عباس (رضى الله عنهما): قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان الله تعالىٰ قد امده لرؤيته فان اغمى عليكم فأكملوا العدة.''

(مسلم ج:۱ ص:۳۴۸، مشکوٰۃ ص:۱۷۴،۱۷۵)

ترجمہ:...... ''ابوالبختری کہتے ہیں کہ: ہم عمرہ کے لئے نکلے، بطنِ نخلہ پہنچے تو چاند دیکھنے لگے، کسی نے کہا: تیسری رات کا ہے، اور کسی نے کہا: دُوسری رات کا ہے، بعد ازاں جب ہماری ملاقات ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ہوئی تو ہم نے ان سے عرض کیا کہ: ہم نے چاند دیکھا تھا، مگر بعض کی رائے تھی کہ دُوسری رات کا

ہے اور بعض کا خیال تھا کہ تیسری رات کا ہے۔ فرمایا: تم نے کس رات دیکھا؟ ہم نے عرض کیا: فلاں رات! فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہینے کی مدّت کا مدار رُؤیت پر رکھا ہے، لہٰذا یہ چاند اسی رات کا تھا جس رات تم نے دیکھا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ہم نے رمضان کا چاند ذاتِ عرق میں دیکھا (اور ہمارے درمیان اختلافِ رائے ہوا کہ کس تاریخ کا ہے؟) چنانچہ ہم نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ایک آدمی اس کی تحقیق کے لئے بھیجا، ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا مدار رُؤیت پر رکھا ہے، پس اگر نظر نہ آسکے تو گنتی پوری کرلی جائے۔"

۱۰:...... عن أبی هریرة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: صوموا لرؤیته وأفطروا لرؤیته فان غم علیکم فأکملوا العدة ثلاثین."

(متفق علیہ، مشکوٰۃ ص:۱۷۴)

ترجمہ:...... "حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر اِفطار کرو، پھر اگر وہ اَبر و غبار کی وجہ سے نظر نہ آئے تو تیس دن کی گنتی پوری کرو۔"

۱۱:...... "عن ابن عمر رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: انا اُمّة اُمّیّة لا نکتب ولا نحسب، الشهر هٰکذا وهٰکذا وعقد الابهام فی الثالثة. ثم قال: الشهر هٰکذا وهٰکذا وهٰکذا یعنی تمام الثلاثین یعنی مرة تسعًا وعشرین ومرة ثلاثین." (متفق علیہ، مشکوٰۃ ص:۱۷۴)

ترجمہ:...... "حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہم تو اُمتِ اُمیہ ہیں،

ہمیں اوقات کی تعیین کے لئے حساب کتاب کی ضرورت نہیں، بس (اتنا جان لو کہ) مہینہ کبھی اتنا، اتنا ہوتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اشارہ فرمایا، اور تیسری مرتبہ ایک اُنگلی بند فرمائی (یعنی اُنتیس کا)، اور کبھی اتنا، اتنا، اتنا ہوتا ہے، یعنی پورے تیس کا، کبھی اُنتیس کا اور کبھی تیس کا۔“

۱۲:...... ”عن جابر بن عبدالله رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: اذا رأیتم الهلال فصوموا واذا رأیتموه فأفطروا فان غم علیکم فعدوا ثلاثین یوما.“ (الفتح الربانی تبویب مسندِ احمد ج:۹ ص:۲۴۸)

ترجمہ:...... ”حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب چاند دیکھ لو تب اِفطار کرو، پھر اگر مطلع اَبر آلود ہو تو تیس دن گن لو۔“

۱۳:...... ”عن قیس بن طلق عن أبیه رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان الله عزّ وجلّ جعل هٰذه الأهلة مواقیت للناس، صوموا لرؤیته وأفطروا لرؤیته فان غم علیکم فاتموا العدة.“

(الفتح الربانی ج:۹ ص:۲۴۷)

ترجمہ:...... ”طلق بن علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان ہلالوں (نئے چاند) کو لوگوں کے لئے تعیینِ اوقات کا ذریعہ بنایا ہے، پس چاند دیکھ کر روزہ رکھا کرو، اور چاند دیکھ کر اِفطار کیا کرو، پھر اگر مطلع اَبر آلود ہونے کی بنا پر وہ نظر نہ آئے تو (تیس دن کی) گنتی پوری کرلو۔“

۱۴:...... ”عن عائشة رضی الله عنها تقول: کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یتحفظ من شعبان ما لا

يتحفظ من غيره ثم يصوم لرؤية رمضان، فان غم عليه عد ثلاثين يوما ثم صام.“ (ابوداوٗد ص:۳۱۸)

ترجمہ:...... ”اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جتنا شعبان کے چاند کا اہتمام فرماتے تھے اتنا کسی دُوسرے ماہ کا نہیں فرماتے تھے، پھر چاند دیکھ کر رمضان کا روزہ رکھا کرتے تھے، لیکن مطلع غبارآلود ہونے (اور کہیں سے رُؤیت کی اطلاع نہ ملنے) کی صورت میں (شعبان کے) تیس دن پورے کیا کرتے تھے۔“

۱۵:...... **”عن أبی هريرة رضی الله عنه قال: قال النبی صلی الله عليه وسلم: لا تقدموا الشهر بيوم ولا بيومين الا أن يوافق ذٰلک صوما كان يصوم أحدكم. صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته فان غم عليكم فعدوا ثلاثين ثم أفطروا.“** (رواه الترمذی وقال حديث أبی هريرة حسن صحيح والعمل علٰی هٰذا عند أهل العلم. ترمذی ج:۱ ص:۱۴۷)

ترجمہ:...... ”حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مہینے کی آمد سے ایک دو دن پہلے ہی روزہ شروع نہ کردیا کرو، البتہ اس دن کا روزہ رکھنے کی کسی کو عادت ہو تو دُوسری بات ہے، بلکہ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر اِفطار کرو، اور اگر مطلع غبارآلود ہونے کی وجہ سے وہ نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرکے پھر اِفطار کرو۔“

۱۶:...... **”عن حذيفة رضی الله عنه قال: قال رسول الله صلی الله عليه وسلم: لا تقدموا الشهر حتی تروا الهلال أو تكملوا العدة، ثم صوموا حتی تروا الهلال أو تكملوا العدة.“** (ابوداوٗد ص:۳۱۸)

ترجمہ:...... ”حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مہینے کی آمد سے پہلے ہی روزہ شروع نہ کردیا کرو جب تک کہ چاند نہ دیکھ لو یا گنتی پوری نہ کرلو، پھر برابر روزے رکھتے رہو، جب تک کہ چاند نہ دیکھ لو یا گنتی پوری نہ کرلو۔“

۱۷:...... ”عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تقدموا الشھر بصیام یوم ولا یومین الا أن یکون شیء یصومه أحدکم، ولا تصوموا حتی تروہ ثم صوموا حتی تروہ، فان حال دونه غمامة فأتموا العدة ثلاثین ثم أفطروا، والشھر تسع وعشرون.“ (ابوداوٗد ص:۳۱۸)

ترجمہ:...... ”حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رمضان سے ایک دو دن پہلے ہی روزہ شروع نہ کردیا کرو، اِلَّا یہ کہ اس دن روزہ رکھنے کی کسی کی عادت ہو (مثلاً: دوشنبہ یا پنجشنبہ کا دن ہو)، بہرحال چاند دیکھے بغیر روزہ نہ رکھو، پھر چاند نظر آنے تک برابر روزے رکھتے رہو، اور اگر اس کے ورے بادل حائل ہوں تو تیس کی گنتی پوری کرلو، تب اِفطار کرو، ویسے مہینے اُنتیس کا بھی ہوتا ہے۔“

۱۸:...... ”عن عبدالرحمٰن بن زید بن الخطاب یقول: انا صحبنا أصحاب النبی صلی اللہ علیه وسلم وتعلمنا منھم وانھم حدثونا أن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم قال: صوموا لرؤیته وأفطروا لرؤیته، فان أغمی علیکم فعدوا ثلاثین، فان شھد ذوا عدل، فصوموا وأفطروا وأنسکوا.“ (سننِ دارقطنی ج:۲ ص:۱۶۸)

ترجمہ:...... ”حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن خطابؒ فرماتے

ہیں: ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت میں رہے ہیں، اور ان ہی سے علم سیکھا ہے، انہوں نے ہمیں بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر اِفطار کرو، اور اگر اَبر و غبار کی وجہ سے نظر نہ آئے تو تیس دن شمار کرلو، لیکن اگر اس حالت میں دو معتبر اور عادل شخص رُؤیت کی شہادت دیں، تب بھی روزہ، عید اور قربانی کرو۔"

ان تمام احادیث کا مضمون مشترک ہے، مگر ہر حدیث کسی نئے افادے پر مشتمل ہے، اس لئے سب کا سامنے رکھنا ضروری ہے، ان احادیث سے حسبِ ذیل اُمور اوّل نظر میں واضح طور پر مستفاد ہوتے ہیں:

۱:...... اسلامی اَحکام میں قمری مہینوں اور سالوں کا اعتبار ہوگا۔

۲:...... قمری مہینہ کبھی اُنتیس کا ہوتا ہے، کبھی تیس کا۔

۳:...... رُؤیتِ ہلال میں سر کی آنکھوں سے چاند دیکھنے کا مفہوم قطعی طور پر متعین ہے، ان احادیث میں کسی دُوسرے معنی کے احتمال کی گنجائش نہیں، چنانچہ "بدایة المجتهد" لابن رشد القرطبیؒ میں ہے:

"فان العلماء أجمعوا أن الشهر العربی یکون تسعًا وعشرین، ویکون ثلاثین، وعلی أن الاعتبار فی تحدید شهر رمضان انما هو الرؤیة، لقوله علیه الصلٰوة والسلام: "صوموا لرؤیته وأفطروا لرؤیته" وعنی بالرؤیة أول ظهور القمر بعد السؤال."

(بدایة المجتهد لابن الرشد القرطبیؒ ج:۱ ص:۲۰)

ترجمہ:...... "علماء کا اس پر اجماع ہے کہ عربی مہینہ اُنتیس کا بھی ہوتا ہے اور تیس کا بھی، اور اس پر بھی اجماع ہے کہ رمضان کے مہینے کی تحدید صرف رُؤیت سے ہوتی ہے اس لئے کہ حضورِ اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''چاند کو دیکھ کر تم روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ہی روزہ اِفطار کرو'' اور (سائل کے) سوال پر رُؤیت سے چاند کا اوّل ظہور ہی مراد ہے۔''

۴:......قمری مہینوں کی تبدیلی کا مدار چاند نظر آنے یا تیس دن پورے ہونے پر ہے، اگر اُنتیس کا چاند نظر آجائے تو نیا مہینہ شروع ہوجائے گا، ورنہ سابقہ ماہ کے تیس دن شمار کرنا لازم ہوگا۔

اَحکام القرآن، ابوبکر جصاص رازیؒ میں ہے:

"وقوله صلى الله عليه وسلم: "صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته، فان غم عليكم فأكملوا العدة ثلاثين" هو أصل فى اعتبار الشهر ثلاثين، الا أن يرى قبل ذٰلك الهلال، فان كان شهر غم علينا هلاله فعلينا أن نعده ثلاثين، هٰذا فى سائر الشهور التى تتعلق بها الأحكام، وانما يصير الى أقل من ثلاثين برؤية الهلال." (ج:۱ ص:۲۰۲)

ترجمہ:......''حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ: ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو، اور چاند دیکھ کر اِفطار کرو، اور اگر (بادلوں کی وجہ سے) چاند نظر نہ آئے تو تیس دن کی گنتی مکمل کیا کرو۔'' یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مہینہ تیس دن کا ہوتا ہے، اِلَّا یہ کہ اس سے پہلے چاند نظر آجائے۔ اگر کوئی مہینہ ایسا ہے کہ اس میں بادلوں کی وجہ سے چاند نہ نظر آئے تو ہم پر لازم ہے کہ ہم اس کو تیس کا شمار کریں، اور یہ اُصول ان تمام مہینوں کے بارے میں ہے جن کے ساتھ اَحکام متعلق ہوتے ہیں اور مہینے کے تیس سے کم ہونے کا اعتبار صرف چاند دیکھنے پر ہوگا۔''

۵:......اگر اُفق پر اَبر، غبار، سیاہی یا اور کوئی چیز مانعِ رُؤیت نہ ہو تو اُنتیس کے چاند کا ثبوت ''رُؤیتِ عامہ'' سے ہوگا، جب پورے علاقے یا ملک کے لوگ چاند دیکھنے میں

کوشاں ہوں، اوراس کے باوجود عام رُؤیت نہ ہوسکے، تو علاقے اور ملک کے صرف دو چار افراد کے دعوے سے ''رُؤیت'' کا ثبوت نہیں ہوگا۔ چنانچہ ان احادیثِ طیبہ میں انفرادی شہادت قبول کرنے کا حکم مطلع اَبر آلود ہونے کی صورت میں دیا گیا ہے، اور مطلع صاف ہونے کی صورت میں انفرادی شہادت کی بجائے: ''اذا رأیتم'' (جب تم دیکھ لو) فرماکر ''رُؤیتِ عامہ'' پر ثبوتِ ہلال کا مدار رکھا گیا ہے، اور عقلاً بھی یہ بات بدیہی ہے کہ جب مطلع صاف ہو، سب لوگ سراپا اشتیاق بن کر اُفق پر ٹکٹکی باندھے ہوئے ہوں، اور کوئی چیز مانعِ رُؤیت نہ ہو، اس کے باوجود رُؤیتِ عامہ نہ ہوسکے، تو ایسی صورت میں ایک دو افراد کا یہ دعویٰ کہ: ''ہم نے چاند دیکھا ہے'' پوری قوم کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کے مترادف ہے، ظاہر ہے کہ پوری قوم کو اندھا یا ضعیف البصر قرار نہیں دیا جاسکتا ہے، بلکہ اس کی بجائے اس انفرادی بیان ہی کو غلط ماننا ہوگا، بالخصوص جبکہ بلند و بالا چوٹیوں پر دُوربینوں کی مدد سے بھی چاند نظر نہ آئے تو ان لوگوں کی غلطی یا غلط بیانی اور بھی واضح ہوجائے گی۔

اَحکام القرآن، ابوبکر جصاص رازیؒ میں ہے:

''قال أبوبکر: انما اعتبر أصحابنا اذا لم یکن بالسماء علة شهادة الجمع الکثیر الذین یقع العلم بخبرهم، لأن ذٰلک فرض قد عمت الحاجة الیه، والناس مأمورون بطلب الهلال فغیر جائز أن یطلبه الجمع الکثیر ولا علة بالسماء مع توافی هممهم وحرصهم علٰی رؤیته ثم یراه النفر الیسیر منهم دون کافتهم، علمنا أنهم غالطون غیر مصیبین، فاما أن یکونوا راؤا خیالا فظنوه هلالا، أو تعمدوا الکذب، وجواز ذٰلک غیر ممتنع، وهٰذا أصل صحیح تقضی العقول بصحته، وعلیه مبنٰی أمر الشریعة. والخطاء فیه یعظم ضرره ویتوصل الملحدون الٰی ادخال الشبهة علی الاغمار والحشو وعلٰی من لم یتیقن ما ذکرنا من

الأصل.“ (أحکام القرآن ج:۱ ص:۲۰۲،طبع ۱۳۳۵ھ)

ترجمہ:...... ”امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں: جب آسمان پر کوئی بادل وغیرہ نہ ہوتو ہلالِ رمضان کی رُویت کے لئے ایک ایسی کثیر جماعت کی شہادت ضروری ہے جس کی خبر سے یہ یقین حاصل ہوجائے کہ انہوں نے چاند دیکھا ہے، اس لئے کہ روزوں کی فرضیت کی وجہ سے چاند کا دیکھنا فرض ہے اور تمام لوگوں کی ضرورت اس سے متعلق ہے اور لوگ چاند دیکھنے کے لئے مأمور ہیں، پس یہ ممکن نہیں کہ سب لوگ اپنی بھرپور کوشش، ہمت اور رُویت کی حرص کے باوجود چاند نہ دیکھ سکیں، لیکن ان میں سے ایک قلیل جماعت کو چاند نظر آجائے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ تھوڑی سی جماعت غلطی پر ہے، بہت ممکن ہے کہ اس جماعتِ قلیل نے کوئی خیالی چیز دیکھی ہو اور اس کو انہوں نے چاند خیال کرلیا ہو، یا جان بوجھ کر جھوٹ بول رہے ہوں، اور یہ اُصول اپنی جگہ ایک صحیح اُصول ہے جس کی صحت کا عقلِ سلیم بھی تقاضا کرتی ہے، اور اس پر شریعت کا اُصول وضع ہوا ہے اور اس میں غلطی کرنا بہت بڑے نقصان کا سبب ہوسکتا ہے، اور اس سے ملحدین، اسلام میں شبہات اور قطع برید پیدا کرسکتے ہیں۔“

۶:...... مطلع غبار آلود ہوتو جیسا کہ احادیثِ بالا میں تصریح ہے، ہلالِ عید کا ثبوت کم از کم دو معتبر عادل اور دیانت دار گواہوں کی چشم دید شہادت سے ہوگا (اور دو عینی شاہدوں کی گواہی پر دو معتبر اشخاص کی گواہی جسے ”شہادت علی الشہادت“ کہا جاتا ہے، اسی طرح قاضی کے فیصلے پر دو عادلوں کی گواہی (شہادت علیٰ قضاء القاضی) کا حکم بھی یہی ہے، کیونکہ یہ دونوں بھی ”حجتِ ملزمہ“ ہیں، کما صرح بہ القوم)، صرف ایک شخص کی شہادت یا محض افواہی خبروں کا اعتبار نہ ہوگا۔ جو حضرات اختلافِ مطالع کے قائل نہیں (اور ہمارے فاضل مؤلف ان ہی کے مؤید ہیں) ان کے نزدیک مندرجہ ذیل حدیث کا محمل بھی یہی ہے:

"عن كريب أن أمّ الفضل بنت الحارث بعثته الى معاوية بالشام قال: فقدمت الشام، فقضيت حاجتها واستهل عليّ هلال رمضان وأنا بالشام فرأينا الهلال ليلة الجمعة، ثم قدمت المدينة فى آخر الشهر فسألنى ابن عباس ثم ذكر الهلال، فقال: متى رأيتم الهلال؟ فقلت: رأيناه ليلة الجمعة. فقال: أنت رأيته ليلة الجمعة؟ فقلت: راٰه الناس وصاموا وصام معاوية. فقال: لٰكن رأيناه ليلة السبت، فلا نزال نصوم حتى نكمل ثلاثين يوما أو نراهٗ. فقلت: الا تكتفى برؤية معاوية وصيامه؟ قال: لا! هٰكذا أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم." (ابوداوٗد ص:۳۱۹، ترمذی ج:۱ ص:۸۷)

ترجمہ:...... "حضرت کریب فرماتے ہیں: اُمّ الفضلؓ بنت حارث (والدہ ابنِ عباسؓ) نے انہیں حضرت معاویہؓ کے پاس شام بھیجا، میں شام گیا اور اپنے کام سے فارغ ہوا تو رمضان کا چاند مجھے شام ہی میں ہوا، چنانچہ ہم نے جمعہ کی رات کو چاند دیکھا، پھر رمضان مبارک کے آخر میں، میں مدینہ طیبہ واپس آیا، حضرت ابنِ عباسؓ نے مجھ سے حال احوال دریافت کئے، پھر چاند کا ذکر آیا تو دریافت فرمایا: تم نے چاند کب دیکھا تھا؟ میں نے کہا: ہم نے جمعہ کی رات کو دیکھا۔ فرمایا: تو نے جمعہ کی رات کو خود دیکھا تھا؟ میں نے کہا: لوگوں نے چاند دیکھ کر روزہ رکھا اور حضرت معاویہؓ نے بھی روزہ رکھا۔ فرمایا: لیکن ہم نے سنیچر کی رات کو دیکھا ہے، اس لئے ہم تو اپنے حساب سے تیس روزے پورے کریں گے، اِلَّا یہ کہ خود اُنتیس کا چاند دیکھ لیں۔ میں نے کہا: کیا آپ حضرت معاویہؓ کی رُوٴیت اور روزہ رکھنے (کے فیصلے کو) کافی نہیں سمجھتے؟ فرمایا: نہیں! (کیونکہ ہمیں وہاں کی رُوٴیت کا

ثبوت دو ثقہ گواہوں کی شہادت سے نہیں ملا، صرف تمہاری ایک آدمی کی اطلاع ہمارے اِفطار کے لئے حجت نہیں) ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح حکم فرمایا ہے۔“

اور جن حضرات کے نزدیک مطالع کا اختلاف معتبر ہے، وہ اس کی توجیہ یہ کریں گے کہ چونکہ ہر علاقے کا مطلع الگ ہے اس لئے ایک مطلع کی رُؤیت دُوسرے علاقے والوں کے لئے کافی نہیں، خواہ اس کا ثبوت صحیح شہادت سے بھی ہوجائے۔

اور مطلع غبار آلود ہونے کی صورت میں ہلالِ رمضان کے لئے، دُوسری احادیث کے مطابق صرف ایک مسلمان عادل یا مستور الحال کی خبر بھی کافی ہوگی، جیسا کہ ابوداوٴد میں ہے:

۱:...... ”عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: جاء أعرابی الی النبی صلی الله علیه وسلم فقال: انی رأیت الهلال یعنی هلال رمضان، فقال: أتشهد أن لا اله الا الله؟ قال: نعم! قال: أتشهد أن محمدًا رسول الله؟ قال: نعم! قال: یا بلال! أذّن فی الناس أن یصوموا غدًا.“

(رواه ابو داؤد والترمذی والنسائی وابن ماجة والدارمی، مشکوٰة ص:۱۷۴)

ترجمہ:...... ”حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ: ایک دیہاتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور کہا: میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے (عام رُؤیت نہیں ہوئی تھی)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اللہ کی توحید کے قائل ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں! فرمایا: کیا تم میری رسالت کو مانتے ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں! فرمایا: بلال! لوگوں میں اعلان کردو کہ کل روزہ رکھیں۔“

۲:...... ”وعن ابن عمر رضی الله عنهما قال: تراء الناس الهلال، فأخبرت رسول الله صلی الله علیه وسلم انی رأیته، فصام وأمر الناس بصیامه.“

(رواه ابو داؤد والدارمی والروایتان فی المشکوٰة ص:۱۷۴)

ترجمہ:...... حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:
لوگ چاند دیکھ رہے تھے (مگر اَبر کی وجہ سے عام لوگوں کو نظر نہیں آیا)، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ میں نے دیکھ لیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری خبر پر خود بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔''

۷:...... ان احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ارشادفرمودہ ہدایات پر نظر ڈالئے تو واضح ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثبوتِ ہلال کے لئے ایک قطعی اُصول اور ضابطہ مقرّر فرمایا، یعنی اُنتیس کو مطلع صاف ہونے کی صورت میں رُؤیتِ عامہ کا اعتبار ہوگا اور مطلع کے غبار آلود ہونے کی صورت میں شہادت کا اعتبار کیا جائے گا، اور دونوں مفقود ہوں تو تیس دن پورے کئے جائیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود اپنا عمل اسی ضابطے پر تھا، صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین اسی اُصول کے پابند تھے، اور اُمتِ مسلمہ کو اسی قاعدے کی پابندی کا بار بار تاکیدی حکم فرمایا۔ اور الحمدللہ! اُمتِ مسلمہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے بموجب اس کا خوب خوب التزام بھی کیا۔ لیکن کسی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ادنیٰ سے ادنیٰ اور ہلکے سے ہلکا اشارہ اس طرف نہیں فرمایا کہ اس اُصول کو چھوڑ کر اُمت کسی مرحلے میں، کسی دُوسرے طریقے پر بھی اعتماد کرسکتی ہے، کسی حسابی فن سے بھی اس سلسلے میں مدد لے سکتی ہے، یا روزہ و اِفطار کے اوقات متعین کرنے کے لئے کسی دُوسرے اُصول کی طرف بھی رُجوع کرسکتی ہے۔ اب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وضع فرمودہ اُصولِ رُؤیت کو چھوڑ کر کسی فن پر اعتماد کرنے اور اس کے ماہرین کی طرف رُجوع کرنے سے بھی منشائے نبوّت پورا ہوسکتا تھا، جیسا کہ فاضل مؤلف اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سرتھوپنا چاہتے ہیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ہمیں اس کا کوئی معمولی اشارہ تو ملنا چاہئے تھا؟ یا کم از کم صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ ہدیٰ کی طرف اس اُصولِ نبویؐ سے ہٹ کر کسی دُوسری راہ کو اختیار کرنے کی گنجائش کا کہیں سراغ ملتا؟

دورِ حاضر کی کم سوادی اور ستم ظریفی کا ایک مظہر یہ بھی ہے، کہ جو چیز اپنے ذہن

عالی میں آئے اسے کھینچ تان کر بڑوں کی طرف منسوب کرو، اور جو چیز بڑوں سے صراحتاً ثابت ہو، اس سے صاف مکر جاؤ، اور اگر اس طرح نہ بن آتی ہے تو اسے تأویل کے خراد پر چڑھاؤ۔ ''خاندانی منصوبہ بندی'' سے لے کر ''سوشل ازم'' تک جو بات کسی کے ذہن نے اچھی سمجھی، فٹ سے اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرڈالا۔ صحابہ کرامؓ کا حال یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات انہوں نے ایک دو بار نہیں، بیسیوں بار اپنے کانوں سے سنے ہوتے تھے، ان کی روایت میں بھی حد درجہ محتاط تھے، مگر ہمارے یہاں اپنے ذہنی وساوس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُصولِ رُؤیت کو اپنانے اور اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے کہیں: ''لا نکتب ولا نحسب'' (ہم حساب کتاب نہیں کیا کرتے) کہہ کر اوقات کی تعیین کے باب میں حسابی تخمینوں کی حوصلہ شکنی فرمائی، کہیں دونوں ہاتھوں کے اشارے سے: ''الشھر ھٰکذا وھٰکذا وھٰکذا'' (مہینہ اتنا، اتنا اور اتنا ہوتا ہے) کہہ کر ماہ وسال کے سلسلے میں حساب پر بالکلیہ بے اعتمادی کا اظہار فرمایا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس مضمون کو سمجھانے کے لئے کہ مہینہ کبھی ۲۹ کا ہوتا ہے، کبھی ۳۰ کا، دونوں ہاتھوں کو چھ دفعہ اُٹھانے اور ''ھٰکذا'' کا لفظ چھ دفعہ دُہرانے کی بہ نسبت ۲۹، ۳۰ کا عدد مختصر بھی تھا اور واضح بھی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب ان دو ہندسوں سے ناآشنا بھی نہ تھے۔

چنانچہ صحیح مسلم کی شرح ''اکمال اکمال المعلم'' المعروف ''شرح اُبیّ'' میں ہے:

''وفی أحادیث الاشارۃ ھٰذہ الارشاد الٰی تقریب الأشیاء بالتمثیل وھو الذی قصدہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یصنع ذٰلک لأجل ما وصفھم بہ من الأمیۃ: ''لا یحسبون لا یکتبون'' لأنھم لا یجھلون الثلاثین والتسع وعشرین، مع ان التعبیر عنھما باللفظ أخف من الاشارۃ المکررۃ وانما وصفھم بذٰلک سدًّا لباب الاعتداد بحساب المنجمین الذی تعتمدہ العجم فی صومھا،

فہرست

وفطرها، وفصولها.“ (ج:۳ ص:۲۲۳ طبع مصر ۱۳۲۷ھ)

ترجمہ:...... ”اور جن احادیث میں اشارے سے مہینے کے تیس اور اُنتیس کے ہونے کی مقدار سمجھائی گئی ہے، اس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ مثالوں کے ذریعہ سے بات کو سمجھنا آسان ہوتا ہے، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کے اشارے سے یہ بات سمجھائی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ (اشارے سے سمجھانے کا طریقہ) اس لئے نہیں اپنایا کہ وہ لوگ وصفِ اُمیّت سے موصوف تھے اور حساب و کتاب کرنا نہیں جانتے تھے، کیونکہ وہ لوگ تیس اور اُنتیس کے لفظ سے جاہل نہیں تھے، حالانکہ بار بار کے اشارے کی بجائے تیس اور اُنتیس کے لفظ سے تعبیر کرنا آسان تھا، لیکن اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارے سے بات سمجھائی، اس لئے کہ منجم لوگوں کے حساب کی لوگوں میں عادت پڑ چکی تھی اور اسی پر عجمی لوگ اپنے روزہ اور اِفطار کرنے، اور سالوں کی گنتی کا اعتماد کرتے تھے، اس سے ان کے حساب وغیرہ کا دروازہ بند کرنا مقصود تھا۔“

اسی طرح کہیں: ”فلا تصوموا حتی تروه ولا تفطروا حتی تروه“ (روزہ نہ رکھو جب تک چاند نہ دیکھ لو، اور اِفطار نہ کرو جب تک چاند نہ دیکھ لو) فرماکر رُؤیت کے بغیر کسی نوع کے حسابی تخمینے پر اعتماد کرتے ہوئے روزہ و اِفطار کرنے سے اُمت کو صاف صاف منع فرمایا۔ اور کہیں چاند دیکھ کر: ”دُوسری تاریخ کا ہے“ کا نعرہ لگانے کو قربِ قیامت کی علامت بتلاکر، حسابی طریقوں پر اعتماد سے نفرت دِلائی، اور اسے ذہنی انحطاط اور دینی تنزل کا مظہر قرار دیا، جیسا کہ ”کنز العمال“ میں ہے:

”عن ابن مسعود رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم: من اقتراب الساعة أن یری الهلال قبلا فیقال: للیلتین، وأن تتخذ المساجد طرقا، وأن یظهر موت الفجاءة.“ (رواه الطبرانی فی الأوسط، کنز العمال ج:۷ ص:۱۷۶)

فہرست

ترجمہ:...... ''حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: من جملہ قربِ قیامت کی علامات کے یہ ہے کہ چاند کو سامنے دیکھ کر کہا جائے گا: ''یہ تو دُوسری رات کا ہے''، اور مساجد کو گزرگاہ بنالیا جائے گا اور اچانک موتیں عام ہوں گی۔''

اور کہیں بلا استثناء اہلِ نجوم کی تصدیق کو ''کفر'' سے تعبیر فرمایا، مگر کسی موقع پر بھی یہ تصریح نہیں فرمائی کہ اہلِ نجوم کی تقویم پر اعتبار کرتے ہوئے بھی چاند کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے، چنانچہ ابوداؤد کی شرح ''المنهل العذب المورود'' میں ہے:

''وحسبک فی ابطال العمل بالحساب والتنجیم قوله تعالٰی: ''قل لا يعلم من فی السمٰوٰت والأرض الغيب اِلَّا الله''، وقوله صلى الله عليه وسلم: ''من أتى عرافا أو كاهنا فصدقه بما يقول، فقد كفر بما أنزل علٰى محمد صلى الله عليه وسلم.'' (احمد والحاکم)

ومن أحاديث المصابيح: من اقتبس علمًا من النجوم اقتبس شعبة من السحر.'' (ج:۱۰ ص:۳۷)

ترجمہ:...... ''تیرے لئے علمِ اعداد اور علمِ نجوم کے باطل ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہی قول کافی ہے کہ: ''آپ فرمادیجئے آسمان اور زمین میں غیب سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا۔'' اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ: ''جو آدمی علمِ نجوم جاننے والے یا کاہن کے پاس گیا اور جو کچھ اس نے کہا اور اس نے اس کی تصدیق کی، تو اس نے کفر کیا اس دین کا جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتارا گیا ہے۔''

اور مصابیح کی احادیث میں ہے کہ: جس نے علومِ نجوم سے کچھ سیکھا، اس نے جادُو کے ایک حصے کو حاصل کیا۔''

ادھر قرآنِ حکیم نے شرعی اُصولِ اوقات کو چھوڑ کر کسی خودساختہ اصطلاح سے ماہ و سال کی اَدل بدل کو، جو جاہلیتِ اُولیٰ کا شعار تھا: ”زیادة فی الکفر“ اور زینۂ گمراہی قرار دیا۔ (التوبہ:۲)

ان تمام اُمور کو سامنے رکھ کر ہر شخص جس کی چشمِ انصاف بند نہ ہوگئی ہو، آسانی سے فیصلہ کرسکتا ہے کہ ثبوتِ ہلال کے شرعی اُصول اور نبوی ضابطے کو چھوڑ کر صرف جنتری کے بھروسے پر روزہ اِفطار کرنا مزاجِ نبوّت سے کہاں تک میل کھاتا ہے؟ منشائے نبوّت کو کہاں تک پورا کرتا ہے؟ اور فاضل مؤلف کے بقول اسے ”رُؤیت کی ترقی یافتہ تعبیر“ کہنا اور اس بدعت کو ”حفاظتِ ایمان“ کا ذریعہ بتلاکر اس کا پرچار کرنا کہاں تک بجا ہے...؟

علامہ ابنِ عربیؒ شرحِ ترمذی میں اُصولِ رُؤیت کو چھوڑنے اور حسابی طریقوں سے رُؤیت کو ثابت کرنے کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اوه یا ابن شریح، أین مسألتک الشریحیة؟ وأین صوارمک السریحیة؟ تسلک هٰذا المضیق فی غیر الطریق، وتخرج الی الجهل عن العلم والتحقیق، ما لمحمد والنجوم؟ .... وکأنک لم تقرأ قوله: ”أما نحن أُمّة أُمّیة لا نحسب ولا نکتب، الشهر هٰکذا وهٰکذا وهٰکذا“ وأشار بیدیه الکریمتین ثلاث اشارات وخنس بأبهامه فی الثالثة، فاذا کان یتبرأ من الحساب الأقل بالعقد المصطلح علیه مبینا بالیدین تنبیها علی التبری عن أکثر منهٗ فما ظنک بمن یدعی علیه بعد ذٰلک أن یحیل علٰی حساب النیرین، وینزلهما علٰی درجات فی أفلاک غائبا ویقرنهما باجتماع واستقبال حتی یعلم بذٰلک استهلال.“ (ج:۳ ص:۲۰۸)

ترجمہ:...... ”اے ابنِ شریح! کہاں ہے تیرا مسئلہ شرعیہ؟ تو کشادہ راستہ چھوڑ کر ان تنگ راستوں پر جاتا ہے اور تو علم اور تحقیق

سے نکل کر جہالت کی طرف جاتا ہے..... حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور نجوم کی آپس میں کیا نسبت ہے؟ گویا تو نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں پڑھا کہ: ''ہم اُمی اُمت ہیں، ہم حساب و کتاب کو نہیں جانتے، مہینہ اتنے، اتنے، اتنے کا ہوتا ہے'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ مبارک سے تین بار اشارہ کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بار اپنے انگوٹھے کو بند کرلیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصطلاحی گنتی اور حساب کا مختصر طریقہ چھوڑ کر ہاتھوں کے اشارے سے یہ بات بیان فرمادی تو اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اس سے زیادہ کو چھوڑ دیا جائے۔ آپ کا کیا گمان ہے اس آدمی کے بارے میں جو اس کے بعد بھی دعویٰ کرتا ہے کہ یہ چیز علمِ نجوم کے حوالے کی جائے اور وہ ان دونوں کو آسمان کے پوشیدہ درجات پر لاتا ہے اور ان دونوں کو جوڑتا ہے اجتماع اور استقبال کے ساتھ تاکہ اس طریقے سے چاند کو جان سکے۔''

ان احادیث میں صحابہ و تابعین (رضی اللہ عنہم اجمعین) کے طرزِ عمل کی وضاحت بھی موجود ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ ''اُصولِ رُؤیت'' پر سختی سے کاربند تھے، اور وہ بار بار خطبوں میں، خطوط میں اور نجی مجلسوں میں: ''عهد الينا رسول الله صلى الله عليه وسلم''، ''هٰكذا أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم'' کہہ کر اُمت کو اسی اُصول پر کاربند رہنے کی تلقین فرماتے تھے۔ چنانچہ پورا ذخیرۂ حدیث و سیر، چھان جایئے، مگر آپ کو کسی صحابی کے بارے میں یہ نہیں ملے گا کہ انہوں نے اُصولِ رُؤیت کو چھوڑ کر کسی حسابی تخمینے پر اعتماد کرنے کا فتویٰ دیا ہو، یہی وجہ ہے کہ باتفاقِ اُمت، شریعتِ اسلامیہ نے ثبوتِ ہلال کے باب میں اہلِ حساب و فلکیات کی رائے کا اعتبار نہیں کیا، بلکہ ان کی تحقیق کو سرے سے کالعدم اور لغو قرار دیا ہے۔ مثلاً: ماہرینِ فلکیات کی رائے ہو کہ فلاں تاریخ کو چاند ہوگا، لیکن رُؤیتِ شرعیہ نہ ہوسکے تو باجماعِ اُمت اس رُؤیت پر اَحکامِ ہلال جاری نہیں

ہوں گے اور ماہرینِ فلکیات کی رائے لغو ہوگی۔

چنانچہ حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ "فتح الباری" ج:۴ ص:۹۸، "عمدة القاری" للعینیؒ ج:۵ ص:۱۸۲، ج:۵ ص:۱۹۹، "زرقانی علی المؤطا" ج:۲ ص:۱۵۴، ردالمحتار لابن عابدین الشامیؒ ج:۲ ص:۱۰۰، أحکام القراٰن للجصاصؒ وغیرہ وغیرہ حضرات اکابرؒ کا موقف بھی یہی ہے، یہاں سب کا نام دینا بھی ممکن نہیں، چہ جائیکہ ان کی تصریحات نقل کی جائیں، البتہ امام جصاص رازیؒ کی تصریح تو سن ہی لیجئے! فرماتے ہیں:

> "فالقائل باعتبار منازل القمر وحساب المنجمین خارج عن حکم الشریعة ولیس هٰذا القول مما یسوغ الاجتهاد فیه، لدلالته الکتاب ونص السنة واجماع الفقهاء بخلافه." (ج:۱ ص:۲۰۲)
>
> ترجمہ:...... "منازلِ قمر اور فلکیات کے حساب پر اعتماد کرنا حکمِ شریعت سے خارج ہے، اور یہ ایسی چیز نہیں جس میں اجتہاد کی گنجائش ہو، کیونکہ کتاب اللہ، سنتِ نبویہ اور اجماعِ فقہاء کے دلائل اس کے خلاف ہیں۔"

رہا یہ سوال کہ شریعت نے اَحکامِ ہلال کا مدار رُؤیت پر کیوں رکھا؟ فلکیاتی تحقیقات پر کیوں نہیں رکھا؟ ہمارے نزدیک یہ سوال ہی بے محل ہے، بحیثیت مسلمان ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اچھی طرح یہ تحقیق کریں کہ فلاں باب میں شارع نے کیا حکم دیا ہے؟ یہ معلوم ہوجانے کے بعد ہمیں شارع سے یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ: "یہ حکم آپ نے کیوں دیا ہے؟" کیونکہ ہمارے مسلمان ہونے کا پہلا نتیجہ اس بات کا قطعی یقین ہے کہ شارع کی طرف سے جو حکم بھی دیا جاتا ہے، اس سے خود شارع کی کوئی غرض وابستہ نہیں، بلکہ وہ سراسر بندوں ہی کی مصلحت کے پیشِ نظر دیا گیا ہے، کبھی اس مصلحت کا اظہار مناسب ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا، لیکن وہ مصلحت بہرحال اس حکم پر مرتب ہوگی، خواہ بندوں کو اس کا علم ہو یا نہ ہو، اس لئے وہ خود کسی مصلحت کا اظہار فرمادیں تو ان کی غایت عنایت ہے، ورنہ

بندے کو یہ حق کب حاصل ہے؟ کہ وہ اس بات پر اصرار کرے کہ پہلے اس حکم کی مصلحت بتلایئے تب مانوں گا، (اور آپ جانتے ہیں کہ اگر کوئی مصلحت بتلانے کی ہو تب بھی اس ذہنیت کے شخص کو تو کبھی نہیں بتلائی جاسکتی)۔

بہرحال ہمیں یہ تحقیق کرنے کا حق ہے کہ شریعت نے ہلال کا مدار فلکیات پر رکھا ہے یا نہیں؟ اور اسے کسی درجے میں قابلِ اعتبار قرار دیا ہے یا بالکلیہ ناقابلِ اعتماد؟ لیکن یہ سوال ہم نہیں کرسکتے کہ شریعت نے ہلال کا مدار رُؤیت پر کیوں رکھا اور فلکیات وغیرہ پر کیوں نہیں رکھا؟ ہوسکتا ہے کہ اس میں شارع کے پیشِ نظر بندوں کی بہت سی مصلحتیں ہوں، اور وہ صرف رُؤیت پر مرتب ہوسکتی ہوں اور فلکیات پر نہیں۔ مثلاً: دُوسری قوموں کے ماہ و سال کا مدار تقویمی حسابوں پر تھا، شارع نے اس اُمت کی انفرادیت کو محفوظ رکھنے کے لئے جس طرح اور بہت سی چیزوں میں ان کی مشابہت سے اُمت کو بچانا چاہا، اسی طرح ان کی تقویمی مشابہت سے بھی اُمت کو محفوظ رکھنا چاہا، اس لئے ان کو ایک مستقل نظامِ تقویم دیا۔

علامہ اُبیّ رحمہ اللہ کی شرح مسلم میں ہے:

"سدا لباب الاعتداد بحساب المنجمين الذی تعتمده العجم فی صومها وفطرها وفصولها."

(اکمال اکمال المعلم شرح مسلم للأُبیّ ص:۲۲۷)

ترجمہ:...... "عجم کے لوگ اپنے روزہ اور اِفطار اور سالوں کی گنتی میں منجم لوگوں کے حساب پر جو اعتماد کرتے تھے اور عادت بنائے ہوئے تھے اس عادت کو ختم کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا۔"

یا ہوسکتا ہے، کہ چونکہ دُوسرے حسابی طریقوں سے ماہ وسال کی تعیین فطری اور تحقیقی نہیں تھی بلکہ اختراعی اور تقریبی تھی، چنانچہ انہیں اس کمی بیشی کو برابر کرنے کے لئے "لیپ" کی اصطلاح ایجاد کرنا پڑی، اس کے برعکس اسلام دینِ فطرت تھا، اس نے چاہا کہ اُمتِ اسلامیہ کے ماہ وسال کی تعیین کے لئے "رُؤیت" اور مشاہدہ کا فطری طریقہ مقرّر کیا

جائے، کیونکہ یہ اختراعی اور تقریبی طریقے اس کی فطرت سے میل نہیں کھاتے تھے۔ یا ممکن ہے کہ اس اَمر کی رعایت رکھی گئی ہو کہ چونکہ اسلام کے پورے نظام کی بنیاد تکلف اور تعمق پر نہیں بلکہ سادگی اور سہولت پر رکھی گئی ہے اس لئے ''اسلام کے نظامِ تقویم'' کو بھی مشاہدہ اور رُؤیت جیسے آسان اور سادہ اُصول پر مبنی کیا گیا تا کہ اس نظام کے ''جز وکل'' میں مناسبت رہے، اور اس باب میں اُمت تکلف اور مشقت میں مبتلا نہ ہوجائے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''أقول: لما كان أوقات الصوم مضبوطًا بالشهر القمري باعتبار رؤية الهلال وهو تارةً ثلاثون يومًا وتارةً تسعة وعشرون وجب في صورة الاشتباه أن يرجع الٰى هٰذا الأصل، وأيضًا مبنى الشرائع على الأمور الظاهرة، عند الأمّيين دون التعمق والحسابات النجومية بل الشريعة واردة باخمال ذكرها وهو قوله صلى الله عليه وسلم: انا أُمّة أُمّيّة لا نكتب ولا نحسب.'' (حجة الله البالغة للشيخ المحدث الدهلويؒ ج:۲ ص:۵۱)

ترجمہ:...... ''میں کہتا ہوں کہ: جب روزوں کے اوقات کا انضباط قمری مہینوں پر رُؤیتِ ہلال کے اعتبار سے ہے، اور یہ مہینہ کبھی تیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی اُنتیس دن کا، تو اشتباہ کی صورت میں اسی اُصول کی طرف لوٹنا واجب ہے، اور نیز اُمّیین کے نزدیک شریعت کی بنیاد اُمورِ ظاہرہ پر ہوتی ہے نہ کہ گہرائی اور علمِ نجوم کے حساب پر، بلکہ شریعت تو اس کے ذکر سے بھی اعراض کرنے کا حکم دیتی ہے، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ہم اُمی اُمت ہیں، ہم حساب و کتاب کو نہیں جانتے۔''

یا ممکن ہے کہ اس چیز کا لحاظ رکھا گیا، کہ نظامِ تقویم بہرحال اوقات کی تعیین کا ایک ذریعہ ہے اور جو قوم ذرائع میں منہمک ہوکر رہ جائے اکثر و بیشتر مقاصد اس کی نظر سے

او جھل ہوجاتے ہیں، اور فطری طور پر ان کی صلاحیتیں ذرائع ہی میں کھپ کر ضائع ہوجاتی ہیں، اس لئے چاہا گیا کہ اُمتِ مسلمہ کو نظامِ تقویم ایسا دیا جائے جس میں منہمک ہوکر مقصدی صلاحیتیں کھو بیٹھنے کا ذرا بھی اندیشہ نہ ہو، بس آنکھ کھولی، چاند دیکھ لیا، تقویم دُرست ہوگئی، اور سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے، نہ ضرب کی ضرورت، نہ تقسیم کی، نہ محکمۂ موسمیات قائم کرنے کی ضرورت، نہ اس پر ریسرچ کی۔

یا ممکن ہے یہ اَمر پیشِ نظر ہو کہ اس اُمت میں امیر بھی ہوں گے، غریب بھی، عالم بھی، جاہل بھی، مرد بھی اور عورتیں بھی، اور بیشتر عبادات و معاملات کا مدار نظامِ تقویم پر ہے، اس لئے چاہا گیا کہ جس طرح نظامِ تقویم سے متعلقہ اَحکام کے مکلّف اُمت کے سبھی طبقات ہیں، اسی طرح ان کو نظامِ تقویم ایسا دیا جائے جس پر ہر شخص اپنے مشاہدے کی روشنی میں پورے شرحِ صدر کے ساتھ یقین کرسکے۔

یا ممکن ہے کہ شارع کو جو یقین ہلال کے باب میں مطلوب ہے وہ رُؤیت اور مشاہدے پر ہی مرتب ہوسکتا ہو، اس کی نظر میں حسابی جنتری اس یقین کے پیدا کرنے میں ناکافی ہو۔ یا ہوسکتا ہے کہ شارع نے اس اَمر کو پسند نہ فرمایا ہو کہ روزہ و اِفطار تو سب کریں، مگر ان کے اوقات کی تعیین ایک خاص گروہ کے رحم و کرم پر ہو، اس لئے نظامِ تقویم ایسا مقرّر فرمایا کہ ایک عامی بھی اپنے وقت کی تعیین ٹھیک اسی طرح کرسکتا ہے جس طرح ایک ماہرِ فلکیات۔ اور ایک بدوی بھی اسی طرح اپنے اوقات کا حساب لگاسکتا ہے، جس طرح ایک شہری۔ بلکہ بعید نہیں کہ ماہرِ فلکیات یا عالم کی نظر کمزور ہو، اور ایک عامی بدوی کی نظر تیز، اس صورت میں خود ماہرِ فلکیات یا عالم کو مسکین اَن پڑھ کی طرف رُجوع کرنا پڑے۔

الغرض! شارع کے پیشِ نظر بیسیوں حکمتیں ہوسکتی ہیں، اس لئے ہمارا کام یہ نہیں کہ چوں و چرا کا سوال اُٹھائیں اور شارع سے بحث و تکرار میں مشغول ہوکر فرصت اور وقت کے ساتھ دین و ایمان بھی ضائع کریں، ہمارا کام تو یہ ہے کہ شارع کی حکمت و شفقت پر ایک دفعہ ایمان لے آئیں، پھر اس کی جانب سے جو حکم دیا جائے اسے اپنے حق میں سراسر خیر و برکت کا موجب اور عین حکمت و مصلحت کا مظہر سمجھ کر اس پر فوراً عمل پیرا ہوجائیں:

زباں تازہ کردن باقرارِ تو
نیگیختن علت از کارِ تو

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ راقم الحروف کا وہ تبصرہ جو موصوف جعفر شاہ پھلواری کی اس کتاب پر ''ماہنامہ'' بینات شعبان ۱۳۸۸ھ کے ''نقد و نظر'' میں شائع ہوا تھا درج کردیا جائے۔

''رُؤیتِ ہلال'':...... مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری ہمارے ملک کے مشہور صاحبِ قلم اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے رفیق ہیں، زیرِ نظر کتابچے میں انہوں نے ''رُؤیتِ ہلال اور فلکیات'' کے موضوع پر گفتگو کی ہے۔ کتابچے کے مندرجات پر نظر کرنے سے پہلے اس کی ''شانِ نزول'' کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ موصوف کا تعلق یہاں کے ''حشویہ فرقہ'' سے ہے، جس کا نعرہ موصوف کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''حضرات! ہمارے خیال میں ہم پاکستانیوں کی اس وقت کوئی معین شریعت نہیں ہے، پچھلے ادوار کی شریعتوں پر چل رہے ہیں ..... جب ہم ان ''خام مواد'' سے استفادہ کرتے ہوئے ایک بات متعین کرلیں گے اور حکومت اسے نافذ کردے گی تو ہمارے لئے وہی شریعت ہوگی اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے نہیں ہوگی، ضرورت کے وقت مجالسِ قانون ساز یا کوئی اور مقرّر کردہ کمیٹی اس میں بھی ترمیم کرسکتی ہے۔''(۱)

ان حضرات کے نزدیک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے اسلام میں ''دین'' اور ''شریعت'' دو الگ الگ چیزوں کے جدا جدا نام ہیں، چنانچہ:

> ''دین تو وہ رُوح اور اِسپرٹ ہے جو تبدیل نہیں ہوسکتی اور

(۱) مولانا جعفر شاہ کا مقالہ ''تعقل و تدبر کے لئے قرآنِ حکیم کی تاکید'' مشمولہ ماہنامہ ''فکر و نظر'' راولپنڈی (از ص:۸۳۲ تا ۸۴۰) ماہِ مئی ۱۹۶۸ء۔ یہ مقالہ راولپنڈی کی بین الاقوامی کانفرنس کے لئے لکھا گیا تھا مگر بروقت گم ہوجانے کی وجہ سے وہاں پڑھا نہیں گیا۔

شریعت اسی رُوح کی تشکیل کا نام ہے، مقصد اِسپرٹ کو باقی رکھنا ہے
اور شکل بدلنے سے اِسپرٹ نہیں بدل جاتی۔'' (حوالہ مذکورہ ص:۸۴۳)

قرآنِ کریم اور سنتِ نبویؐ نے عبادات و معاملات میں حلال و حرام، جائز و ناجائز، فرض و واجب، سنت و مستحب اور صحیح و فاسد کے جو اَحکام نافذ فرمائے ہیں، عام مسلمانوں کے نزدیک وہ واجب التسلیم ہیں، مگر ''حشویہ'' کا خیال ہے کہ یہ صرف اسی دور کی شریعت تھی جس میں دین کی رُوح اور اِسپرٹ کو اس دور کے تقاضوں کے مطابق ملحوظ رکھا گیا تھا، اور ہمیں اسی رُوح اور اِسپرٹ کو باقی رکھتے ہوئے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق اسے بدل کر اس کی جگہ ''نئی شریعت'' وضع کرنی ہے اور وقتی تقاضوں کے مطابق شریعتِ محمدیہؐ میں قطع و برید، کانٹ چھانٹ، ترمیم و تنسیخ اور ردّ و بدل کا نام ''اجتہاد'' ہے، موصوف کے لفظوں میں:

''ناقابلِ ترمیم صرف دین (بمعنی رُوح، اِسپرٹ) ہے، اور شریعت ہر دور میں ترمیم قبول کرسکتی ہے، اور یہیں ''اجتہاد'' کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترمیم کا یہ مطلب نہیں کہ شروع سے آخر تک سب کچھ بدل دیا جائے بلکہ (الف) ان شریعتوں میں جو چیز اپنے عصری تقاضوں کے مطابق ہوگی وہ باقی رکھی جائے گی۔ (ب) جس کی ضرورت نہیں اسے ترک کردیا جائے گا۔ (ج) جس جدید شے کی ضرورت ہوگی اس کا اضافہ کردیا جائے گا، اور اس وقت صرف عالمی مصالحِ اُمت کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔'' (حوالہ مذکورہ ص:۸۴۴)

مطلب یہ کہ شریعتِ خداوندی کے اَحکام ''پختہ عقل'' مسلمانوں کے لئے ''خام مواد'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (شریعت کے لئے ''خام مواد'' کی اصطلاح موصوف نے اس مقالے میں کئی جگہ استعمال کی ہے۔ ناقل) ان کا برتاؤ شریعت کے ساتھ بھی وہی ہوگا جو ایک اجنبی تہذیب کے رسوم و قانون کے ساتھ ہوتا ہے، وہ جتنی شریعت کو مفید مطلب پائیں گے باقی رکھیں گے، اور جتنی کو چاہیں ترک کردیں گے، اور جتنا چاہیں اس میں اضافہ کرلیں

گے، عبادات میں بھی اور معاملات میں بھی۔

اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ''عالمی مصالحِ اُمت'' کی تعیین کا حق کس کو حاصل ہے؟ اس کا جواب ''حشویہ'' کے پاس یہ ہے کہ دین میں اجتہاد پر کسی گروہ کی اجارہ داری نہیں بلکہ یہ پوری قوم کا حق ہے، جو وہ اپنے منتخب نمائندوں (مرکزی حکومت اور پارلیمنٹ کے ارکان) کو تفویض کرتی ہے، ان ہی کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق ''وقتی تقاضوں'' اور ''مصالحِ اُمت'' کی تشخیص کریں، اگر وہ بھولے سے دن کو ''شب است ایں'' کہہ بیٹھیں تو تمام قوم کا فرض ہے کہ وہ ''اینک ماہ و پروین'' کا اقرار کرے۔

اس تشریح سے معلوم ہوا ہوگا کہ مولانا جعفر شاہ صاحب جس ''اجتہادی حشویت'' یا نئی شریعت کے داعی ہیں، وہ مسٹر پرویز کے نظریۂ ''مرکزِ ملت'' اور مغربی نقالوں کے نظریۂ ''تعمیرِ اسلام'' کا معجونِ مرکب ہے، جس کا مقصدِ وحید پورے اسلام پر نظرِ ثانی کرنا ہے، مگر سرِدست جو شرعی مسائل اجتہادی ترمیم کے لئے زیرِ غور ہیں، ان کی مختصر فہرست موصوف نے یہ پیش کی ہے:

> ''مثلاً: انشورنس کا جوا، بینکوں کا سود، خاندانی منصوبہ بندی، انتقالِ خون کا مسئلہ، اعضائے انسانی کے دُوسرے جسم میں منتقل کرنے کا مسئلہ، ذرائعِ پیداوار کو قومیانے کا جواز، جنتری کے مطابق چاند کا اعلان، عورتوں کے پردے کی نئی حد بندی، تعدّدِ ازواج، شادی، طلاق، دعوت، ذبیحہ اور سفرِ حج جیسی ''جائز'' چیزوں پر پابندی کا جواز، جہیز کی اصلیت، حضانت کی مدّت، مفقود الخبر کی میعاد، یتیم پوتے کی وراثت، فوٹو، راگ گانے اور تصویر کشی کے جواز کا مسئلہ وغیرہ وغیرہ۔'' (حوالہ بالا ص:۸۴۶)

مولانا موصوف اپنے رفقاء سمیت اس خدمت پر مأمور ہیں کہ قومی راہ نماؤں کو شریعتِ محمدیہؐ کے جن اُصول و فروع کو منسوخ کرکے ان کی جگہ ''وقتی تقاضوں'' کے مطابق نئی شریعت وضع کرنے کا الہام ہوجائے اس کے لئے رائے عامہ کو ہموار کریں اور علمی سطح پر

لوگوں کو اس کا قائل کریں۔ اس سلسلے میں موصوف جن اجتہادی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں، جس قسم کے دلائل فراہم کرتے ہیں، اور جس تکنیک کو استعمال کرتے ہیں، زیرِ نظر کتابچہ اس کی اچھی مثال ہے۔

اسلامی اُصول یہ ہے کہ قمری ماہ و سال کا مدار رُؤیتِ ہلال پر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے اب تک اُمت اسی اُصول پر کاربند رہی ہے، اور روزہ، عید، اِعتکاف، زکوٰۃ، حج، قربانی، عدّت وغیرہ وغیرہ بہت سے اَحکام اسی اُصول سے طے کئے جاتے ہیں، اس کے برعکس مولانا موصوف کا موقف یہ ہے کہ ان چیزوں کے لئے چاند دیکھنے کے بکھیڑے اس ترقی یافتہ دور سے میل نہیں کھاتے۔ ''اس کے لئے نہ رُؤیتِ ہلال کی ضرورت، نہ علماء کمیٹی کی، نہ گواہیاں گزارنے کی، نہ ٹیلی فون پر تصدیق کرتے پھرنے کی۔'' (ص:۴۱) پس یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ جنتری دیکھ کر بہت پہلے ہی سے عید وغیرہ کا اعلان کردیا کرے اور ہم آنکھیں بند کرکے اس پر آمنا وصدقنا کہا کریں۔ موصوف کے خیال میں ''اس میں کسی قسم کا کوئی شرعی نقصان نہیں، بلکہ شرعی نقصان تو اختلاف کرنے میں ہے۔'' (ص:۴۸)

اب دیکھئے کہ اس شرعی اُصول میں ترمیم کے لئے جس سے بیسیوں اَحکامِ شرعیہ مسخ ہوجاتے ہیں، موصوف نے کیا اجتہادی اُصول وضع کئے ہیں:

''یہ واضح رہے کہ ہم کسی رائے کو، خواہ وہ اپنی ہو یا قدمائے اہلِ علم کی، حرفِ آخر نہیں سمجھتے۔'' (ص:۵)

اپنا ذکر تو موصوف نے بطور تبرک کیا ہے، کہنا یہ ہے کہ شریعت کا کوئی مسئلہ خواہ کتنا ہی صریح اور قطعی کیوں نہ ہو، اور تمام اہلِ علم اس پر متفق ہی کیوں نہ ہوں، اس میں بھی کوئی نہ کوئی نئی اُپج نکالی جاسکتی ہے، چنانچہ زیرِ نظر مسئلے میں علمائے اُمت متفق ہیں کہ رُؤیتِ ہلال کے معنی ہیں سر کی آنکھوں سے چاند دیکھنا، مگر مولانا موصوف کے اجتہاد میں:

''یہاں رُؤیت کے معنی وہ علم ہے جو تاریخی یا فنی شواہد سے حاصل ہوتا ہے یا خواب کی طرح قلب وخیال سے ..... پس رُؤیتِ ہلال کو صرف چشمِ سر کے ساتھ مخصوص کردینے کی کوئی معقول

وجہ نہیں معلوم ہوتی۔'' (ص:۱۰)

اسی طرح تمام علمائے قانون کے نزدیک شہادت کے معنی ہیں:

''کسی شخص کا حاضرِ عدالت ہوکر گواہی دینا۔''

لیکن مولانا موصوف کے نزدیک یہ صحیح نہیں، بلکہ وہ ''بصیرت بھی کافی ہے جو گمانِ غالب پیدا کردے۔'' (ص:۳۴)

اور مسلمانوں کی شریعت اس کا اعتبار کرے نہ کرے، اور اسے مانے یا نہ مانے، مگر موصوف کے خیال میں:

''محض گواہوں کی شرعی گواہی سے جو غلبۂ ظن پیدا ہوسکتا ہے اس سے کہیں زیادہ موجودہ دور کے فلکیاتی علم سے حاصل ہوجاتا ہے۔'' (ص:۳۴)

الغرض! جب یہ اُصول ایک دفعہ طے ہوجائے کہ: ''پہلوں نے قرآن وسنت اور دین وشریعت کا جو مفہوم سمجھا وہ یا تو سرے سے غلط ہے، یا ان کے دور کے لحاظ سے صحیح ہو تو ہو، کم از کم ہمارے لئے صحیح نہیں''، اس کے بعد شریعتِ الٰہیہ کے ردّ و بدل کے لئے اچھی خاصی گنجائش نکل آتی ہے، اور اس سے اسلامی قطعیات کو بڑی آسانی سے ''حشوی اجتہاد'' کی زد میں لایا جاسکتا ہے۔ دین کے کسی بھی مسئلے کو لے کر اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے: ''قدیم مسلمانوں کے دور میں یا ان کے خیال میں ایسا ہوگا، لیکن اب ایسا نہیں ہے۔'' موصوف نے فلکیات پر اعتماد کو اسی منطق سے ثابت کرنا چاہا ہے۔ (ص:۲۳)

۲:...... اس ''حشوی اجتہاد'' کا دُوسرا اُصول یہ ہے کہ اُمت کے کروڑوں علماء و فقہاء کے خلاف اگر کسی کا قول کہیں مل جائے، اس کی نقل خواہ کتنی ہی شاذ و مردُود، غلط اور ناقابلِ اعتبار ہو، لیکن اسے وحیٔ آسمانی کی طرح صحیح سمجھ کر اعلان کردو کہ یہ مسئلہ پہلے ہی سے مختلف فیہ چلا آیا ہے، اور ہم فلاں قول کو اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ زیرِ نظر مسئلے میں مولانا موصوف نے مطرف بن عبداللہ، علامہ سبکی، قاضی عبدالجبار، ابنِ مقاتل اور مصنف جمع العلوم کے نام دیئے ہیں، کہ وہ اس فن پر مکمل یا ''غیر مکمل'' اعتماد کرتے تھے (ص:۱۱ تا

۱۳)۔حالانکہ اوّل الذکر کی طرف اس کی نسبت غلط ہے (فتح الباری ج:۴ ص:۹۴)، علامہ سبکی کا قول مردُود ہے (شامی ج:۲ ص:۱۰۰)، اور باقی بزرگوں کے بارے میں اوّل تو موصوف کو یہی معلوم نہیں کہ وہ کون تھے؟ (حد یہ ہے کہ مصنف جمع العلوم کے نام تک کا اَتا پتا نہیں) علاوہ ازیں ان کا یہ قول بحوالہ شامی، زاہدی کی "قنیہ" سے نقل کیا گیا ہے، جس کے بارے میں خود علامہ شامیؒ کی تصریح یہ ہے کہ وہ ناقابلِ اعتبار ہے (شامی ج:۱ ص:۵۲)۔ لیجئے! چند مجاہیل کے غلط، مردُود، ناقابلِ اعتبار اور گرے پڑے اقوال "اجتہادی قلعہ" تعمیر ہوگیا، اور چودہ صدیوں کو غلط فہمی کا شکار کہنے کا جواز پیدا ہوگیا۔

۳:...... "حشویت" کا تیسرا اُصول یہ ہے کہ موقع پڑے تو جعل و تلبیس اور بعض دفعہ صریح غلط بیانی سے بھی گریز نہ کرو۔ چنانچہ سب کو معلوم ہے امام شافعیؒ اس مسئلے میں پوری اُمت کے ساتھ متفق ہیں، لیکن مولانا موصوف نے امام شافعیؒ سے بھی منوالیا کہ رُؤیتِ ہلال کے بجائے صرف جنتری دیکھ کر چاند کا پیشگی اعلان کیا جاسکتا ہے۔ (ص:۲۵)

اور موصوف کی اس تلبیس کا منشا یہ ہے کہ "یوم شک" میں روزہ رکھنا چاہئے یا نہیں؟ اس کے بارے میں امام شافعیؒ کے نہیں بلکہ بعد کے مشائخِ شافعیہ کے متعدّد اقوال ہیں جو امام نوویؒ کی "شرح مہذب" اور حافظ ابنِ حجرؒ کی "فتح الباری" میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان ہی میں ایک قول بعض محتاط شافعیہ کا یہ ہے کہ اگر حسابی تخمینہ اس کی تائید کرتا ہو تو جس شخص کو اس کی صحت پر اعتماد ہو اس کے لئے روزہ رکھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی کو موصوف نے، غلط فہمی یا جعل سازی کی وجہ سے، یوں مسخ کرلیا کہ امام شافعیؒ اور تمام شافعیہ فنِ فلکیات پر اعتماد کے قائل ہیں۔ (ص:۱۲)

۴:...... "حشویت" کا چوتھا اُصول یہ ہے کہ مختلف قسم کے مغالطوں اور خوش گپیوں کو "قیاس" کا نام دیا جائے، مولانا موصوف کو اس اُصول سے بھرپور استفادہ کی خاصی مشق ہے، مثلاً:

> ۱:...... "اگر ٹیلی فون کی اطلاع پر آج شام کی دعوت قبول کی جاسکتی ہے، تو رُؤیت کی شہادت کیوں قبول نہیں؟" (ص:۲۸)

۲:......’’اگر کرنسی نوٹ نقدی کے قائم مقام ہیں تو فلکیات کا فن، رُؤیت کے قائم مقام کیوں نہیں؟‘‘ (ص:۵)

۳:......’’اگر ٹینک چلانا شہسواری کی تعبیر ہے، تو رُؤیت کی تعبیر جنتری سے کیوں نہیں ہوسکتی؟‘‘ (ص:۵)

۴:......’’اگر میراث کی تقسیم میں حساب کتاب پر اعتماد کیا جاسکتا ہے تو چاند میں کیوں نہیں کیا جاسکتا؟‘‘

۵:......’’اگر مشکیزے کے بجائے پمپنگ سے وضو کے لئے پانی لیا جاسکتا ہے، تو ہوائی جہاز سے چاند کیوں نہیں دیکھا جاسکتا؟‘‘

۶:......’’اگر گوشت کے معاملے میں قصائی پر اعتماد کیا جاسکتا ہے تو چاند کے معاملے میں حکومت پر کیوں نہیں کیا جاتا؟‘‘ (ص:۴۲)

ان ژٹلیات کو نقل کرتے ہوئے بھی قلم کو گھن آتی ہے، مگر ان حضرات کا جگر گردہ ہے کہ وہ شرعی مسائل کو ان بچکانہ پہیلیوں سے حل کرنا چاہتے ہیں، جس کے لئے نہ علم کی ضرورت، نہ عقل کی، نہ فہم کی، نہ دانش کی۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے اسلامی موضوعات پر اسی ’’معیار‘‘ کی کتابیں نکلتی رہیں، تو یقین کرنا چاہئے کہ وہ اپنی نیک نامی میں ’’ادارۂ طلوعِ اسلام‘‘ اور ’’ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی‘‘ سے بھی آگے نکل جائے گا۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد وآلہ وأصحابہ أجمعین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

’’آپ کے مسائل اور ان کا حل‘‘

مقبولِ عام اور گراں قدر تصنیف

ہمارے دادا جان شہیدِ اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی نور اللہ مرقدہ کو اللہ رب العزت نے اپنے فضل و احسان سے خوب نوازا تھا، آپ نے اپنے اکابرین کے مسلک و مشرب پر سختی سے کاربند رہتے ہوئے دین متین کی اشاعت و ترویج، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تقاریر و تحریر، فقہی و اصلاحی خدمات، سلوک و احسان، ردِ فرق باطلہ، قادیانیت کا تعاقب، مدارس دینیہ کی سرپرستی، اندرون و بیرون ملک ختم نبوت کانفرنسوں میں شرکت، اصلاح معاشرہ ایسے میدانوں میں گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔

آپؒ کی شہرہ آفاق کتاب ’’آپ کے مسائل اور ان کا حل‘‘ بلاشبہ اردو ادب کا شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ علمی و صحافتی دنیا میں آپ کی تبحرِ علمی، قلم کی روانی و سلاست، تبلیغی و اصلاحی اندازِ تحریر جیسی خداداد صلاحیتوں اور محاسن و کمالات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

حضرت شہیدِ اسلام نور اللہ مرقدہ روزنامہ جنگ کراچی کے اسلامی صفحہ اقرأ میں ۲۲ سال تک دینی و فقہی مسائل پر مشتمل کالم ’’آپ کے مسائل اور ان کا حل‘‘ کے ذریعہ مسلمانوں کی رہنمائی فرماتے رہے۔ یہ سلسلہ آپؒ کی شہادت تک چلتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اخلاص و للّٰہیت کی برکت سے عوام الناس میں اس کالم کو بڑی مقبولیت عطا فرمائی۔ بلا مبالغہ لاکھوں مسلمان اس چشمہ فیض سے مستفید ہوئے۔ دس ہزار سے زائد سوالات و جوابات کو فقہی ترتیب کے مطابق چار ہزار صفحات پر مشتمل دس جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

عرصہ دراز سے ہمارے دوست و احباب، معزز قارئین اور ہمارے بعض کرم فرماؤں کا شدت سے تقاضا تھا کہ حضرت شہیدِ اسلامؒ کی تصانیف آن لائن پڑھنے

فہرست

اور استفادہ کے لئے دستیاب ہوں۔ چنانچہ اکابرین کی توجہات، دعاؤں اور مخلص ماہرین و معاونین کی مسلسل جدوجہد اور شبانہ روز تگ و دو کا ثمرہ ہے کہ ان کتب کو نہایت خوبصورت اور جدید انداز میں تیار کیا گیا ہے، چنانچہ آپ مطالعہ کے لئے فہرست سے ہی اپنے پسندیدہ اور مطلوبہ موضوع پر ''کلک'' کرنے سے اس تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

''شہیدِ اسلام ڈاٹ کام'' کے پلیٹ فارم سے حضرت شہیدِ اسلام نور اللہ مرقدہ کی تصانیف کو انٹرنیٹ کی دنیا میں متعارف کرانے کی سعادت حاصل کرنے پر ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی میں سربسجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے ہمارے اکابرین کے علوم و معارف کا فیض عام فرمائے۔

جن حضرات کی دعاؤں اور توجہات سے اس اہم کام کی تکمیل ہو پائی، میں ان کا بے حد مشکور ہوں خصوصاً میرے والد ماجد مولانا محمد سعید لدھیانوی دامت برکاتہم اور میرے چچا جان صاحبزادہ مولانا محمد طیب لدھیانوی مدظلہ (مدیر دار العلوم یوسفیة، گلزار ہجری کراچی) اور شیخ ڈاکٹر ولی خان المظفر حفظہ اللہ جن کی بھرپور سرپرستی حاصل رہی۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمر میں برکت عطا فرمائے اور صحت و عافیت کے ساتھ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اسی طرح حافظ محمد طلحہ طاہر، جناب امجد رحیم چوہدری، جناب عمیر ادریس، جناب نعمان احمد (ریسرچ اسکالر، جامعہ کراچی) جناب شہود احمد سمیت تمام معاونین کہ جن کا کسی بھی طرح تعاون حاصل رہا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا و رضوان سے نوازے۔ آمین۔

محمد الیاس لدھیانوی

بانی و منتظم ''شہیدِ اسلام'' ویب پورٹل

www.shaheedeislam.com

info@shaheedeislam.com

0321-9264592

قانونی مشیر اعزازی:۔۔۔ منظور احمد میو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

اشاعت:۔۔۔۔۔۔ نومبر ۱۹۹۹ء

قیمت:۔۔۔۔۔۔

ناشر:۔۔۔۔۔۔ مکتبہ لدھیانوی

18-سلام کتب مارکیٹ

بنوری ٹاؤن کراچی

برائے رابطہ: جامع مسجد باب رحمت

پرانی نمائش، ایم اے جناح روڈ، کراچی

فون: 021-32780337 - 021-32780340

www.shaheedeislam.com

نوٹ: Mobile اور IPad وغیرہ میں بہتر طور پر دیکھنے کے لیے

"Adobe Acrobat" کو "PDF Reader" کے طور پر استعمال کریں۔

آپ کے مسائل اور اُن کا حل ایک نظر میں
جلد اول
عقائد، اجتہاد
محاسن اسلام
غیر مسلم سے تعلقات
غلط اعتقاد رکھنے والے فرقے
جنت و دوزخ
توہم پرستی
جلد دوم
وضو کے مسائل
غسل و تیمم مسائل
پاکی سے متعلق عورتوں کے مسائل
نماز کے مسائل
سجدہ سہو
کے مسائل
جلد سوم
نماز تراویح نفل نمازیں
میت کے احکام
قبروں کی زیارت
ایصال ثواب
قرآن کریم روزے کے مسائل
زکوٰۃ کے مسائل
منت و صدقہ
جلد چہارم
حج و عمرہ کے مسائل
زیارت روضہ اطہر
مسجد نبوی مدینہ منورہ
قربانی حلال اور حرام جانور
قسم کھانے کے مسائل
جلد پنجم
شادی بیاہ کے مسائل
طلاق و خلع
عدت، نان و نفقہ
پرورش کا حق
عائلی قوانین وغیرہ
جلد ششم
تجارت یعنی خرید و فروخت
محنت و اجرت کے مسائل
قسطوں کا کاروبار
قرض کے مسائل
وراثت اور وصیت
جلد ہفتم
کھانے پینے کے شرعی احکام
والدین، اولاد اور پڑوسی
کے حقوق تبلیغ دین
کھیل کود، موسیقی، دوا
خاندانی منصوبہ بندی، تصوف
جلد ہشتم
پردہ، اخلاقیات
رسومات، معاملات
سیاست، تعلیم اور وظائف
جائز و ناجائز
جہاد اور شہید کے احکام
جلد نہم
ڈارون کا نظریہ اور اسلام
جلد دہم
معجزہ شق قمر، کچھ مفاہیم
کے بارے میں
مدارس و مساجد کی رجسٹریشن کا حکم
فلمی دنیا سے معاشرتی بگاڑ
مکتبہ لدھیانوی
18 سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی
دفتر ختم نبوت پرانی نمائش ایم اے جناح روڈ کراچی
Tel: 021-2780337
Cell:0321-2115502, 0321-2115595, 0321-2115311